

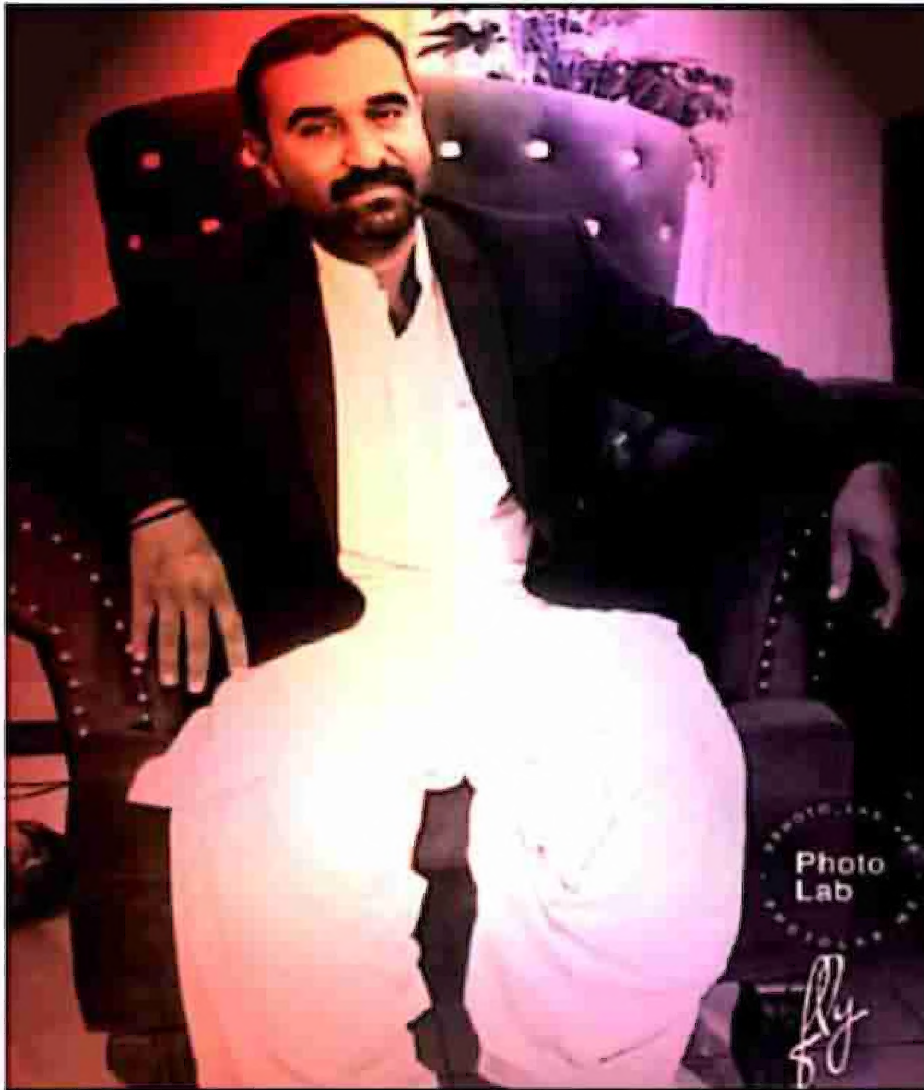
تذکرہ معاصرین

جلد: 01



مصنف : مالک رام

جمال پرنٹنگ پریس، دہلی



PDF By :
Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

Facebook Group Link :

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/>

تذکرہ معاصرین

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران میں وفات
پانے والے ادبا کے حالات اور کلام

از
مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ، بمبئی ۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

اپریل ۱۹۷۲ء

تعداد ۱۱۰۰

جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶

تعارف

بعض احباب کے تعاون سے ۱۹۶۶ء کے اواخر میں دہلی میں علمی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے اصلی مقصد یہ تھا کہ ہم لوگ کبھی کبھی مل بیٹھیں، جب کسی علمی یا تحقیقی موضوع پر تبادلہ خیالات کیا جاسکے۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ مجلس اپنا رسالہ بھی شائع کرے۔ چنانچہ اس فیصلے کے مطابق تمنا ہی دتھریا، ۱۹۶۷ء میں جاری کیا گیا؛ اس کی ترتیب میرے سپرد ہوئی۔ ابھی ایک ہی شمارہ شائع ہوا تھا کہ لکھنؤ میں میرزا جعفر علی خاں اثر کا انتقال ہو گیا۔ میر ان کے برسوں کے تعلقات تھے جب میں اُنی کہ ان کے مختصر حالات تحریر میں شائع کر دوں۔ ابھی ارادہ کر ہی رہا تھا کہ رفیق مارہروی کے بھی انتقال کی خبر موصول ہوئی؛ یہ بھی میرے ملنے والے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ اچھا، ان کے بھی سہی۔ بد قسمتی سے وہ تمنا ہی ختم ہوتے ہوئے چارپانچ صاحب داغ مفارقت دے گئے؛ اور میں نے ۱۹۶۷ء کی دوسری تمنا ہی کے شمارے میں ان سب کے مختصر حالات شائع کر دیے۔ یوں گویا تحریر میں دفیات کے مستقل باب کا اضافہ ہو گیا۔

یہ فیصلہ کسی بڑی سی بڑی گھڑی میں ہوا تھا۔ وہ دن، اور آج کا دن؛ اس کے بعد شاید ہی کوئی تمنا ہی اسی گزری ہو، جس میں کسی نہ کسی مرحوم کے حالات مجھے نہ لکھنا پڑے ہوں۔ جب خیال کرتا ہوں کہ ان پانچ برس میں ستر سے زیادہ اہل علم و قلم ہم سے جدا ہو گئے

ہیں، تو کلیجہ منہ کو آتا ہے جو جاتا ہو، اپنی جگہ کچھ اس طرح سے خالی کر جاتا ہے کہ پھر کوئی اسے کما حقہ پر نہیں کر سکتا۔ کہتے کہ تو غالبِ خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ موت ابنِ آدم کی میراث ہے؛ جو پیدا ہوا ہے، اسے ایک نہ ایک دن ضرور مرنا ہے۔ آج وہ، کل ہماری باری ہے۔ لیکن ہم میں سے کس کی خواہش نہیں ہوتی کہ کاش، غالب کوئی دن اور زندہ رہتے، تاکہ نہ صرف ہم خود ان سے مستفید ہو سکتے، بلکہ وہ اپنے علم و فضل، گفتار و کردار سے نئی نسل کو بھی روشنی دکھاتے، جس سے ہماری ذہنی اور اخلاقی اقدار اور زندگی کا تسلسل قائم رہتا۔ اس سے نہ صرف ان کی جدائی اور موت کے صدمے کی شدت کم ہو جاتی، بلکہ یہ اطمینان بھی رہتا کہ جس کام کے لیے وہ جیے، اور جو راہ انھوں نے دکھائی، اس کام کے کرنے والے اور اس راہ پر چلنے والے اب بھی موجود ہیں۔

میں نے حتی الوسع حالات کی صحت سے متعلق اطمینان کر لیا ہے۔ میری اپنی یادداشت تو ہے ہی کیونکہ خوش قسمتی سے اس دور کے بہت سے اصحاب سے میرے ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ کم و بیش یادداشتیں بھی لکھی رکھی ہیں۔ اس کے باوجود میں نے بالعموم مرحومین کے پس ماندگان اور دوست احباب سے بھی استمداد کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ بے عیب اور غلطی سے سب اذات تو صرف خدا کی ہے، اس لیے کاملاً صحت کا دعویٰ غلط ہو گا۔ لیکن اس طرح سے جتنا کچھ جمع کر سکا ہوں، مجھے یقین ہے کہ اس میں سقم کے راہ پا جا کا امکان بہت کم رہ گیا ہے۔

اردو میں تذکرہ نویسی کی روایت بہت پرانی ہے۔ شروع میں ان تذکروں کی حیثیت بیاض سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ تذکرہ نگار کی بیشتر توجہ اشعار کے جمع کرنے پر رہتی، بحالاتِ ضمناً، اور وہ بھی ایک آدھ سطر میں لکھ دیے جاتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، حالات مفصل تر ہوتے چلے گئے۔ لیکن قدیم تذکروں کی وہی مختصر یادداشتیں آج تاریخِ اردو

کا خام مواد ثابت ہو رہی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر کہیں قدمانے یہ تذکرے مرتب نہ کیے ہوتے، تو تاریخ ادب کی تکمیل کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔

ادھر بہت دن سے کوئی قابلِ قدر تذکرہ مرتب نہیں ہوا۔ معاصرین کے حالات سے خاص کر بے توجہی برتی جا رہی ہے۔ میرے علم میں ان کے مصدقہ حالات کہیں جمع نہیں ہو رہے ہیں۔ اس طرح جو خلا پیدا ہو رہا ہے، اس کے اثرات، آج تو نہیں، زمانہ گزرنے کے ساتھ محسوس ہونگے، جب مؤرخ ادب اس دور کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کریگا۔ اس وقت اسے ان اصحاب کے حالات جمع کرنے میں جو وقت پیش آئیگی، اس کا اندازہ اسی سے لگائیے کہ اساتذہ متقدمین و متوسطین سے متعلق کتنی معلومات اور تفصیلات ہیں، جن کی کھوج میں آج ہم سرگرداں ہیں۔ اگر حسن اتفاق سے کہیں سے کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی ہے، تو ہمیں کتنی مسرت ہوتی ہے؛ اور دریافت کرنے والے کو کتنا فخر۔ جو آسانیاں ہمیں میسر ہیں، وہ بعد کے مؤرخ کی دسترس سے باہر ہونگی۔ اس سے بھی ہماری ذمے داری بڑھ گئی ہے۔

اسی خیال سے میں نے مرحومین کے حالات، جہاں تک ہو سکا، پوری تفصیل سے قلمبند کر دیے ہیں۔ ممکن ہے، کسی صاحب کے نزدیک بعض تفصیلات غیر ضروری ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والا مؤرخ ان کی قدر کریگا اور اس سے اس کا کام بہت آسان ہو جائیگا۔ دنیا میں شائع شدہ حالات کے کتابی شکل میں منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا، تو میں نے ان پر نظر ثانی کی۔ جہاں کہیں کوئی کھانچا نظر آیا، اُسے پر کرنے کی کوشش کی۔ جن اصحاب کی نظر سے یہ مضمون 'تخریر' میں گزر چکے ہیں، وہ بھی مقابلہ کرنے پر بہت فرق پائینگے، انھیں کئی مقامات پر اضافہ ملیگا، اجمال کی جگہ تفصیل نظر آئیگی۔ دو ایک نام کا اضافہ بھی ہوا ہے جن کے حالات پہلے لکھنے سے رہ گئے تھے، نیز میں نے خیال کیا کہ ان میں جو شاعر حضرات تھے، اگر ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کر دیا جائے، تو اس سے

استفادے اور لچسپی کا دائرہ وسیع تر ہو جائیگا۔ یہ بجائے خود بہت محنت طلب کام تھا۔
بارے، یہ بھی ہو گیا۔ فالجھد۔

میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے مختلف شعرا کے حالات اور دواؤں میں جتیا
کرتے میں مدد فرمائی۔

مالک رام

نئی دہلی

۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء

فہرست

بترتیب حروف تہجی

۲۸۰	باسط اوجینی، نیاز محمد خان	۱۶۴	آربری، آر تھر جان
۳۱۰	بشیر احمد (میاں)	۲۷۱	آغا خلش، طفیل احمد
۱۳۲	بنجود، عباس علی خان	۴۸	آفتاب پانی پتی، انوپ چند
۲۵۱	بیدل بیکانیری، شیخ محمد عبداللہ	۲۸	اثر لکھنوی، جعفر علی خان
		۹۵	احمد شجاع، حکیم
۶۲	پر دیز شاہدی، محمد اکرام حسین	۳۲۳	اختر تلہری، اختر علی
		۲۰	خگر فیروز پوری، نند کشور
۱۹۲	تاج لاہوری، امتیاز علی	۲۶۳	سرار احمد آزاد
۳۳۷	تسکین قریشی، محمد حسین	۳۷۴	فقر موہانی وارثی، سید محمد حسین
		۱۶۴	لم منظر نگری، محمد اسحاق
۱۸۱	جامی حیدر آبادی، خورشید احمد	۸۰	مین حزیں، محمد سیح پال
		۱۵۸	تنظام اللہ شہابی، مفتی

۱۰۹	شاد، نریش کمار	۳۲۸	حبیب اشعروملوی، حبیب احمد
۲۸۳	شاغل جیپوری، احترام الدین	۲۳۶	حقی حزن میرٹھی، توفیق الحق
۳۳۸	شاغل قادری، محمد شاغل	۳۵۳	خیر بھوردی، ابوالخیر
۲۵	شاہد احمد دہلوی	۲۷۵	دیا بریلوی، نارائن داس ٹنڈن
۷۲	شفا گوایاری، محمد حسن		
۱۹۹	شکیل بدایونی، شکیل احمد		
۵۲	صہولت ٹونگی، محمود الحسن عرب	۹۷	ذاکر حسین، ڈاکٹر
۲۱۸	غیاث القادری، بدایونی، محمد یعقوب	۲۵۵	راز بلگرامی، سید شریف الحسن
۳۵۷	طالب کشمیری، نند لال کول	۱۵۲	راز چاند پوری، محمد صادق
۲۸۹	عابد لاہوری، عابد علی	۲۳	رفیق مارہروی، رفیق احمد
۳۶۲	عارف عباسی بلیاوی، محمد عثمان	۲۹۷	روش صدیقی، شاہد عزیز
۱۸۸	عبد الشکور	۱۷۰	رئیس احمد جعفری
۳۱۳	عبد القادر سروری	۳۷۰	سامی، مہادیو پرشاد
۳۰۵	عقیل جعفری، عقیل احمد	۴۲	سدرشن (مہاشہ)، بدری ناتھ
۳۹	علی بہادر خان (حافظ)	۴۴	سراج لکھنوی، سراج الحسن
۱۶۱	علی عباس حسینی	۲۳۸	سلیمان اریب، محمد
		۳۸۲	سید عبداللطیف
		۴۰۷	سیدین، خواجہ غلام السیدین

تذکرہ معاصرین

۸۹	محمد مقتدی خان شیردانی	۱۳۴	غذلیب شادانی، وجاہت حسین
۲۵۷	مصطفیٰ زیدی، مصطفیٰ حسین		
۳۶۷	منظر صدیقی، شمشاد حسین	۵۹	فرحت دلہوی، پریم شنکر
۲۰۸	منور لکھنوی، بشیر شاد	۷۰	فقیر سید وحید الدین
۳۹۸	مہر، غلام رسول	۱۷	فلک لاہوری، لال چند
۲۶۶	ناشاد کا پوری، ہری دھر پشادنگم	۳۱۹	قیس بنارسی، شیموورت لال
۱۱۷	ناطق گلادھوی، سید ابوالحسن		
۱۳۱	ناظر کاکوردی، شیر احمد علوی	۲۲۸	ناچس لکھنوی، میرزا محمد اقبال
۸۵	نجیب اشرف ندوی	۱۶۸	محمد اجل خان، پروفیسر
۲۵	نذر سجاد حیدر	۳۳۱	محمد حبیب، پروفیسر
		۵۱	محمد عبدالباقی
۱۷۵	واقف مراد آبادی، یعقوب الحسن	۱۴۷	محمد مخدوم محی الدین، البوسعید

دکیل اختر، دکیل احمد خان ۳۰۷

فہرست بترتیب تاریخ وفات

نام / تخلص	مقام وفات	تاریخ وفات	صفحہ
فلک، لالہ لال چند	دلی	۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء	۱۷
اخگر فیروز پوری، نند کشور	فیروز پور	۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء	۲۰
شاہد احمد دہلوی	کراچی	شب ۲۶/۲۷ مئی ۱۹۶۷ء	۲۵
اشرف لکھنوی، میرزا جعفر علی خان	لکھنؤ	۶ جون ۱۹۶۷ء	۲۸
نذر تجا وحید	بمبئی	۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء	۳۵
علی بہادر خان، حافظ	دلی	شب ۶/۵ نومبر ۱۹۶۷ء	۳۹
مہاشہ سرشن، بادی ناتھ	بمبئی	۱۴ دسمبر ۱۹۶۷ء	۴۲
سراج لکھنوی، سراج الحسن	لکھنؤ	۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء	۴۴
آفتاب پانی پتی، انوپ چند	پانی پت ۱۲	۹ فروری ۱۹۶۸ء	۴۸

تذکرہ معاصرین

۵۱	۶۱۹۶۸	۲۳ فروری	دلی	محمد عبدالباقی
۵۲	۶۱۹۶۸	۲۹ مارچ	ٹونک	صلوات ٹونکی، محمود الحسن عرب
۵۹	۶۱۹۶۸	۳۰ اپریل	میرٹھ	فرحت دہلوی، پریم شنکر
۶۲	۶۱۹۶۸	۵ مئی	کلکتہ	پرویز شاہدی، محمد اکرام حسین
۷۰	۶۱۹۶۸	۲۰ جولائی	کراچی	فقیر سید وحید الدین
۷۲	۶۱۹۶۸	۲۳ جولائی	بھوپال	شفا گو الیاری، سید محمد حسن
۸۰	۶۱۹۶۸	۱۳ اگست	سیالکوٹ	امین حنین، خواجہ محمد مسیح پال
۸۵	۶۱۹۶۸	۵ ستمبر	بمبئی	نجیب اشرف ندوی (سید)
۸۹	۱۹۶۸	۶ دسمبر	علی گڑھ	محمد مقدس خان شروانی

۹۵	۶۱۹۶۹	۴ جنوری	لاہور	حکیم احمد شجاع
۹۷	۶۱۹۶۹	۳ مئی	نئی دلی	ڈاکٹر ذاکر حسین
۱۰۹	۶۱۹۶۹	شب ۲۱/۲۰ مئی	نئی دلی	شاد نریش کمار
۱۱۷	۶۱۹۶۹	شب ۲۶/۲۵ مئی	ناگپور	ناطق گل اوٹھوی، سید ابوالحسن
۱۲۳	۶۱۹۶۹	۲۸ مئی	منظفرنگر	الم مظفرنگری، محمد اسحق
۱۳۱	۶۱۹۶۹	۱۷ جولائی	لکھنؤ	ناظر کاکوروی، بشیر احمد علوی
۱۳۳	۶۱۹۶۹	۲۹ جولائی	ڈھاکا	عندلیب شادانی، وجاہت حسین
۱۴۲	۶۱۹۶۹	۶ اگست	کلکتہ	بیخود، عباس علی خان
۱۴۷	۶۱۹۶۹	۲۵ اگست	دلی	ابوسعید محمد مخدوم محی الدین
۱۵۲	۶۱۹۶۹	۲۵ اگست	چاندپور	راز چاندپوری، محمد صادق
۱۵۸	۶۱۹۶۹	۸ ستمبر	کراچی	انتظام اللہ شہابی، مفتی

متذکرہ معاصرین

۱۶۱	۶۱۹۴۹	۲۷ ستمبر	لکھنؤ	علی عباس حسینی (سید)
۱۶۴	۶۱۹۴۹	۲ اکتوبر	آکسفورڈ	آربری، آرثر جان (پروفیسر)
۱۶۸	۶۱۹۴۹	۱۸ اکتوبر	نئی دہلی	محمد اجل خان، پروفیسر
۱۷۰	۶۱۹۴۹	۲۸ اکتوبر	لاہور	رئیس احمد جعفری
۱۷۵	۶۱۹۴۹	شب ۱۵/۱۶ دسمبر	دہلی	واقف مراد آبادی، سید یعقوب حسن

۱۸۱	۶۱۹۷۰	۸ مارچ	حیدرآباد	جامی حیدر آبادی، خورشید احمد
۱۸۸	۶۱۹۷۰	۱۸ مارچ	بریلی	عبدالشکور، پروفیسر
۱۹۲	۶۱۹۷۰	۱۹ اپریل	لاہور	تاج، سید امتیاز علی
۱۹۹	۶۱۹۷۰	۲۰ اپریل	بمبئی	شکیل بدایونی، شکیل احمد
۲۰۸	۶۱۹۷۰	۲۴ مئی	دہلی	منور لکھنوی، بشیشور پرشاد
۲۱۸	۶۱۹۷۰	۱۵ اگست	کراچی	ضیاء القادری بدایونی، محمد یعقوب
۲۲۸	۶۱۹۷۰	۲۶ اگست	لکھنؤ	ماجس لکھنوی، میرزا محمد اقبال
۲۳۸	۶۱۹۷۰	۷ ستمبر	حیدرآباد	سلیمان اریب حیدر آبادی
۲۴۶	۶۱۹۷۰	۳۰ ستمبر	میرٹھ	حقی حزمین میرٹھی، توفیق الحق
۲۵۱	۶۱۹۷۰	۴ اکتوبر	بیکانیر	بیدل بیکانیری، شیخ محمد عبداللہ
۲۵۷	۶۱۹۷۰	شب ۱۲/۱۳ اکتوبر	کراچی	مصطفیٰ زیدی، مصطفیٰ حسنین
۲۶۳	۶۱۹۷۰	۲۰ نومبر	ڈیرہ دون	اسرار احمد آزاد
۲۶۶	۶۱۹۷۰	۵ دسمبر	کانپور	ناشاد کانپوری، سری دھرم پرشاد نگم
۲۷۱	۶۱۹۷۰	۱۶ دسمبر	بمبئی	آغا خلیش کاشمیری، طفیل احمد
۲۷۵	۶۱۹۷۰	۱۶ دسمبر	بریلی	دیابریلوی، نارائن واسٹنٹن

باسط اوجینی، نیاز محمد خان | اوجین | ۱۷ دسمبر | ۱۹۷۰ء | ۲۸۰

۲۸۲	۱۸ جنوری	۱۹۷۱ء	جیلپور	شاغل جیلپوری، احترام الدین احمد عثمانی
۲۸۹	۲۰ جنوری	۱۹۷۱ء	لاہور	عابد لاہوری، سید عابد علی
۲۹۷	۲ جنوری	۱۹۷۱ء	شاہجہانپور	روش صدیقی، شاہد عزیز
۳۰۵	شب ۲۶/۲۷ جنوری	۱۹۷۱ء	کراچی	عقیل جعفری، سید عقیل احمد
۳۰۷	۹ فروری	۱۹۷۱ء	کلاکتہ	دکیل اختر، دکیل احمد اختر خان
۳۱۰	۳ مارچ	۱۹۷۱ء	لاہور	میان بشیر احمد
۳۱۲	۱۱ مارچ	۱۹۷۱ء	سرینگر	عبدالقادیر سروری، پروفیسر
۳۱۹	۲ اپریل	۱۹۷۱ء	بنارس	قیس نباسی، منشی شیو مورت لال
۳۲۳	۲۱ اپریل	۱۹۷۱ء	لکھنؤ	اختر تلہری، سید اختر علی
۳۲۸	۱۵ جون	۱۹۷۱ء	لاہور	حبیب اشعر دہلوی، حکیم حبیب احمد
۳۳۱	۲۲ جون	۱۹۷۱ء	علی گڑھ	محمد حبیب، پروفیسر
۳۳۷	۲۴ جون	۱۹۷۱ء	آگرہ	تسکین قریشی، محمد الین
۳۴۸	۱۶ جولائی	۱۹۷۱ء	پنجوارہ	شاغل قادری، سید محمد شاغل
۳۵۳	۱۷ جولائی	۱۹۷۱ء	بہورہ	خیر بھوروی، ابوالخیر
۳۵۵	۱۰ اگست	۱۹۷۱ء	بلگرام	راز بلگرامی، سید شریف الحسن
۳۵۷	۱۳ ستمبر	۱۹۷۱ء	سرینگر	طالب کشمیری، پنڈت نند لال کول
۳۶۲	۲۶ ستمبر	۱۹۷۱ء	میرٹھ	عارف عباسی، محمد عثمان بلیادی
۳۶۷	۲ اکتوبر	۱۹۷۱ء	کراچی	منظر صدیقی، شمشاد حسین
۳۷۰	۲ اکتوبر	۱۹۷۱ء	جیلپور	سامی، مہادیو پرشار

سند کرۃ معاصرین

۳۷۴	۶۱۹۷۱	۲ نومبر	لکھنؤ	افقر موہانی وارثی، سید محمد حسین
۳۸۲	۶۱۹۷۱	۴ نومبر	حیدرآباد	سید عبداللطیف، ڈاکٹر
۳۹۸	۶۱۹۷۱	۱۶ نومبر	لاہور	مہر، مولانا غلام رسول
۴۰۰	۶۱۹۷۱	۱۹ نومبر	نئی دہلی	سیدین، خواجہ غلام السیدین

فلک، لالہ لال چند

۱۳ جنوری ۱۸۸۷ء کو اپنے آبائی وطن یعنی ضلع گوجرانوالہ (پنجاب، پاکستان) کے مشہور قصبے حافظ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کی لاہور میں غلے اور اناج کی دکان تھی۔ چنانچہ ان کا بچپن اور تعلیمی زمانہ یہیں گزرا۔ ۱۹۰۴ء میں دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد کسب معاش کے لیے ملازمت اختیار کی اور چیف انجینئر کے دفتر میں جگہ مل گئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب انگریز افسرانے ویسی ماتحتوں سے بہت درشتی اور فرعونیت کا برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے آئے دن اس طرح کے ناخوشگوار حالات دیکھے، تو ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس پر وہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور پھر ساری عمر سرکاری نوکری کے نزدیک نہیں گئے۔

کانگریس کی سیاسی تحریک اب روز بروز تیز تر ہو رہی تھی۔ لال چند فلک بھی اس میں شامل ہو گئے۔ پُر جوش تقریریں اور نظمیں پڑھنے لگے۔ نوبت قید و بند تک پہنچی۔ جون ۱۹۱۷ء میں بجرم بغاوت ۲۰ سال کے لیے

کالے پانی (جزیرہ انڈیمان) کی سزا ہوئی جو بعد کو ۴۲ سال کی قید میں تبدیل کر دی گئی۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء میں دستوری اصلاحات کا نفاذ ہوا تو تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے، اسی میں انھیں بھی رہائی ملی۔ لیکن ان کا نشہ ایسا نہیں تھا کہ تعزیر و تعذیب کی ترشی اُسے اتار دیتی۔ ان کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔

شعر پر اصلاح منشی دوار کا پرشاد افق لکھنوی سے لی۔ اسی زمانے میں ان کی قومی نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے تھے: جامِ فلک، پیامِ فلک، کلامِ فلک۔ جہاں بھارت بھی بطرِ ناول نشر میں لکھی تھی۔ ان کا یہ مصرع ضرب المثل بن چکا ہے۔

تو بھی بدل، فلک! کہ زمانہ بدل گیا

اس بزرگ قوم پرست شاعر کا ۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء کو دلی میں انتقال ہوا۔ ۸۰ سال کی عمر پائی۔

افسوس، کوشش کے باوجود ان کے کلام کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہوا۔ مندرجہ ذیل چند شعر بڑی کوشش سے ہیا کر سکا ہوں۔ ان کا کلام آپ جتنی اور دلی جذبات کا آئینہ ہے۔

آگ میں پڑ کر بھی سونے کی دنگ جاتی نہیں

کاٹ دینے سے بھی ہیرے کی چمک جاتی نہیں

سِل پہ گھس دینے سے بھی جاتی نہیں چندن کی بو

پھول کی اسٹی میں مل کر بھی، جہک جاتی نہیں

رنج میں آتا نہیں نیکیوں کی پیشانی پہ بل

دھوپ کی تیزی میں سبزے کی لہک جاتی نہیں

جا نہیں سکتی کہڑوں میں بھی شیروں کی دھاڑ
 دستِ گلچیں میں بھی غنچوں کی چٹک جاتی نہیں
 صاحبِ بہمت نہیں دبتا مخالف سے بھی
 زور سے آندھی کے آتش کی بھڑک جاتی نہیں
 نعرہ زن رہتا ہے آفات و حوادث میں دلیر
 بادلوں میں گھر کے بجلی کی کڑک جاتی نہیں
 ملک کی الفت کا جذبہ دل سے مٹ سکتا نہیں
 قوم کی خدمت کی خواہش اے فلک جاتی نہیں
 دل سے نکلیگی نہ مر کر بھی وطن کی الفت میری مٹی سے بھی خوشبوئے دفا آئیگی
 میں اٹھا لوں گا بڑے شوق سے اس کو ہرگز خاک اڑانے کے لیے بادِ صبا آئیگی
 زندگی میں تو ملنے سے جھکتی ہے فلک!
 خلق کو یاد مری بعدِ فنا آئیگی
 وطن کی پھالیں جس دل میں گڑی ہو خوشی سے وہ اٹھاتا ہر کڑی ہے
 محن کا ابر ہے رحمت کا بادل گھٹا آفت کی، ساون کی جھڑی ہے

انگلہ فیروز پوری، تند کشور

۲۶ اگست ۱۹۰۱ء کو فیروز پور کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ جگن ناتھ کا شہر کے سبز آوردہ اصحاب میں شمار تھا۔ اکھی ۲۲ برس کے تھے کہ انگریزی حکومت نے انھیں آئری محسٹریٹ بنا دیا۔ وہ کوئی ۲۰ سال اس عہدے پر فائز رہے۔ لکھنے پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ ان کی تصنیف ”بھگوت گیتا کی شرح“ مطبوعہ موجود ہے۔

انگلہ صاحب نے بی اے اور ایل ایل بی کی اسناد پانے کے بعد فیروز پور میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔

والد لالہ جگن ناتھ کا ۱۹۳۱ء میں انتقال ہو گیا، اور گھر کی ذمہ داری انگلہ صاحب پر آ پڑی۔ ۱۹۳۸ء میں آپ بھی آئری محسٹریٹ بنے اور آزادی (۱۹۴۷ء) تک پوری دیانتداری اور تندہی سے اس کے فرائض سرانجام کرتے رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنی ذاتی وکالت بھی ترک کر دی تھی، تاکہ دونوں میں کسی جگہ ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ شہر کے رفاہ عامہ کے کاموں سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ انجمن امداد قیدیان کے اعزاز می سکتے تھے۔ نیز مقامی اسکول کی مجلس منظمہ کے نائب صدر تھے۔

آخری چند سال میں اپنا کاروبار کر لیا تھا۔ فیروز پور کا سینما ہال، شملہ ٹائمر نامی انھیں کی ملکیت تھا۔ ۲۰ اپریل، ۱۹۶۷ء کو فیروز پور ہی میں رحلت کی۔
طالب علمی کے زمانے ہی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جب بنجید کی سے شعر کہنے لگے، تو خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے اصلاح لینے لگے۔ اس طرح اگلے کا سلسلہ تلمذ خدائے سخن میر تقی میر پر منستہ ہوتا ہے۔

انھوں نے کسی زمانے میں گیتا کا منظوم ترجمہ شروع کیا تھا اور اس کا کچھ حصہ ”درس حیات“ کے عنوان سے چھپا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ آخری ایام میں انھوں نے اسے مکمل کر لیا تھا۔ معلوم نہیں اس کا مسودہ کہاں ہے یہ چھپ جانا چاہیے تاکہ محفوظ ہو جائے۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تمام عمر مرے دل کے زخم بھرنے سکے	مرے نصیب وہ بگڑے کہ پھر سنو نہ سکے
ترے بغیر سما یا نہ کوئی آنکھوں میں	ہزار نقش اتارے مگر اتر نہ سکے
تمھاری یاد میں کچھ بھی رہا نہ یاد ہمیں	کہاں کہاں تمھیں ٹھونڈا یہ یاد کرنے سکے
عبث ہیں روز کے نالے چین میں اے بلبل!	لگا وہ آگ کہ گلچیں بھی گل کتر نہ سکے
شرف ملا نہ جنھیں تیری باریابی کا	گزر کے بھی ترے کوچے سے وہ گزر نہ سکے
شبیبہ کھینچ تو دی ہے مصوروں نے مری	مگر وہ درد محبت کا رنگ بھرن نہ سکے

نہ بحرِ غم میں دل زار غرق ہوا، خگر!
یہ وہ سفینہ ہو جو ڈوب کر ابھرن نہ سکے

صد حیف اسے تو نے جد اچھوڑ دیا ہے	جس نے سبھی کچھ تیرے سوا چھوڑ دیا ہے
دیکر اسے محفل کو عنایت کی نظر بھی	تم نے تو فقط تیرا دا بھوڑ دیا ہے
اللہ کے ساتھی! وہ تیری شوخ نگاہی	واعظانے بھی مضمونِ خدا چھوڑ دیا ہے

اے تارکِ دنیا! تجھے جنت کی ہوس کیوں
چھوڑا نہ اسے تو نے تو کیا چھوڑ دیا ہے
اس ترکِ تمنا کی کوئی حد بھی ہے آخر!
کیوں حلقہٴ اربابِ وفا چھوڑ دیا ہے؟

رباعیات

منظوم ہیں ہر طرح خطا و اذ افسوس!
اب صاحبِ قدرت ہیں شتمگار افسوس!
منظور ہے ہر کسی کو طاعتِ زہر کی
منفلس کا نہیں کوئی بھی غنوار افسوس!

لڑتے ہیں بہم دگر برادر افسوس!
سران کا پھر گیا ہے سراسر افسوس!
خویشیوں کی نگاہ سے تلملاتے ہیں
غیر دل کی وہ کھار ہے ہیں ٹھوکر افسوس!

چھٹ گئی آہ! وطن پرستی افسوس!
ہو گئی آہ! ذلیل ہستی، افسوس!
ہر گھر میں بپا ہے ایک بزمِ ماتم
ویرانہ سی ہو گئی ہو بستی، افسوس!

رفیق مارہروی، رفیق احمد

آئن مارہروی مرحوم کے صاحبزادے، ۲۴ مئی ۱۹۶۷ء کو شام کے ساڑھے آٹھ بجے بدایوں اسپتال میں انتقال ہوا۔ ۴ اپریل ۱۹۱۶ء کو مارہرہ میں پیدا ہوئے تھے، گویا ۵۵ برس کی عمر پائی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رفیق ان کا تخلص تھا، حال آنکہ یہ صحیح نہیں ہے؛ وہ محض اپنا نام اس طرح لکھتے تھے، نہ یہ تخلص تھا نہ کبھی انھوں نے شعر کہا۔ نشر میں البتہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب "اسلام اور نظریہ شرافت" تھی۔ چونکہ ان کے والد احسن مرحوم داغ کے محبوب شاگردوں میں تھے، اس لیے ان کے خاندان میں داغ سے متعلق بہت مواد تھا۔ اسی کا ثمرہ رفیق مرحوم کی دو کتابیں زبان داغ اور زبرج داغ تھیں۔ وہ داغ کی سوا ذخیرہ کبھی مرتب کر رہے تھے؛ خدا معلوم، یہ کس مرحلے پر تھی۔ ان کی ایک کتاب "ہندوؤں میں اُدھ" اگرچہ اغلاط اور عدم توازن سے خالی نہیں، تاہم قابلِ قدر ہے۔ اپنے والد احسن مرحوم کے کلام کا انتخاب جلوہ احسن کے عنوان سے شائع کیا اور اس کے

شروع میں ان کی اچھی بسوٹ سوانح عمری شامل کر دی تھی۔ تعلیم دسویں درجے تک تھی۔ وہ ساری عمر معمولی ملازم رہے۔ کنبہ بھی بڑا تھا، اس لیے کبھی فرا کامنہ نہ دیکھا۔ یکم مئی کو پیٹے میں گرفتار ہو گئے۔ دو روز اسپتال میں رہ کر داتا گنج میں اپنے مسکن پر آئے۔ لیکن حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ بدایوں میں سول سرجن کا علاج ہو۔ اسی دوران میں ذیابیطس کے پرانے مرض نے غلبہ پالیا۔ جب کوئی افاقہ نہ ہوا تو ۲۴ مئی کو اسپتال میں داخل کیے گئے۔ اسی شام اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شاہد احمد دہلوی

مترجم قرآن شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی (ف ۱۹۱۲ء) کے پوتے اور واقعات دار الحکومت دہلی کے مؤلف مولوی بشیر الدین احمد (ف ۱۹۲۷ء) کے بیٹے شاہد احمد دہلوی کا ۲۷/۲ مئی ۱۹۶۷ء کی درمیانی شب میں پونے بارہ بجے بعارضہ قلب کراچی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو اپنے خاندانی مکان دہلی میں پیدا ہوئے تھے، گویا ۶۱ سال کی عمر پائی۔ خدا مشغرت کرے۔

ان کے والد مولوی بشیر الدین احمد ان کے بچپن کے زمانے میں ریاست حیدر آباد (دکن) میں ملازم تھے، اس لیے شاہد صاحب کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد ہی میں ہوئی۔ اس کے بعد پہلے علی گڑھ اور پھر دہلی آئے۔ دسویں درجے کی سند انھوں نے عربک اسکول سے لی تھی۔ اس کے بعد لاہور جا کر فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا، لیکن ایف ایس سی کرنے کے بعد جب یہ میڈیکل کالج میں پہنچے، تو یہاں مردہ لاشوں کی چیر بھڑ سے طبیعت اتنی متکد ہوئی کہ بھاگ نکلے۔ بالآخر سان سیفنس کالج دہلی سے انگریزی ادبیات میں

نبی اے آنرز کی سندلی، اور پھر یہیں دلی یونیورسٹی سے فارسی ادبیات میں ایم اے کیا۔ ادب کے علاوہ انھیں موسیقی سے بھی گہرا شغف تھا۔ انھوں نے سولہ برس کی عمر سے مختلف گھرانوں کے نمائندہ گائیکوں کی خدمت میں رہ کر کلاسیکی موسیقی میں کامل درجہ حاصل کیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی معلومات اتنی وسیع اور جزئیات تک پر دسترس اتنی ماہرانہ تھیں کہ وہ اس موضوع پر گھنٹوں صاحبِ فن اور بالغ نظر مبصر کی حیثیت سے گفتگو کر سکتے تھے۔

مولوی نذیر احمد حمید آباد میں صوبیدار رہے تھے اور مولوی بشیر الدین احمد تعلقدار اول۔ دونوں ججز رس اور دورانِ بندش بزرگ تھے۔ چنانچہ شاہد صاحب کے والد اچھا خاصا اثاثہ چھوڑ کرے تھے؛ تینوں بھائیوں کے لیے پچاس پچاس ہزار روپیہ نقد اور متعدد مکانات جن کے کرایے سے دودو سو کی ماہانہ آمدنی الگ تھی؛ ہندو شاہد صاحب کو بسمِ اوقات کے لیے کسی ملازمت کی ضرورت نہ تھی۔ خاندانی ماحول میں انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہو گیا تھا۔ تعلیم کنیکھل کے بعد انھوں نے اپنے ایک دور کے عزیز انصار ناصری کے مشورے سے ہوشوں سے ملاقات کی تقریب پیدا کرنے کے لیے جنوری ۱۹۳۰ء میں دلی سے ماہنامہ ساقی جاری کیا؛ اور اسی کے ساتھ ساقی بک ڈپو بھی قائم کر دیا۔ اس ادارے کی طرف سے تقریباً دو سو کتابیں شائع ہوئیں۔ ساقی اردو کا بہت کامیاب پرچہ ثابت ہوا۔ اس کے ذریعے سے انھوں نے اردو علم و ادب کی بڑی وسیع خدمات سرانجام دیں۔ وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور دامن، دامن، دامن دے کر کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان چلے گئے؛ دس مہینے لاہور میں قیام کرنے کے بعد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں انھوں نے اپنا ذاتی مکان خرید لیا اور

ساتی بھی دوبارہ جاری کر دیا۔ لیکن زمانہ بہت ناموافق رہا؛ اسے جاری رکھنے کے لیے انھیں کیا کیا جتن نہیں کرنا پڑے؛ ان حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ ہاری نہیں مانے۔ جس استقلال سے وہ آخری دم تک جُٹے رہے، یہ ان کا قابلِ تعریف و تقلید کا رنامہ ہے۔ یہاں انھوں نے آخرت پر مضمون لکھے، ریڈیو کی ملازمت کی، جہاں وہ ایس احمد کے نام سے موسیقی کے پروگرام کے نگران اور ہدایت کار تھے۔ اور اس طرح جو کچھ کمایا، اسے ساتی کے تنور میں جھونکے رہے۔ پاکستان میں ان کا بہت بڑا کارنامہ ”پاکستان رائٹرز گلڈ“ کی تاسیس تھی، جسے انھوں نے ۱۹۵۹ء کے اوائل میں سات اور ادیب دوستوں کے ساتھ مل کر قائم کیا۔ انھیں دلی کی ٹکسالی زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے کم و بیش پچاس کتابیں ترجمہ و تالیف کیں۔ ان میں دلی کی بیٹا، گنجینہ گوہر اور فاؤسٹ بہت مشہور ہیں۔

۱۹۶۶ء میں وہ بیمار ہو گئے؛ ان کی ٹانگ کا آپریشن ہوا، اور بالکل ٹھیک ہو گئے۔ اب وہ چلنے پھرنے لگے تھے، اور ان کی صحت بھی بتدریج عود کرنے لگی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلسل محنت اور سکر و بات کی یورش نے ان کی تندرستی کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ ۱۰ فروری ۱۹۶۷ء کو دل پر پہلا حملہ ہوا۔ پندرہ برس دن ہسپتال میں رہے اور بظاہر صحتیاب ہو کر گھر آ گئے۔ لیکن یہ سنبھالا ثابت ہوا۔ ۲۷ مئی کو وہ دن بھر چھ رہے۔ شب میں کچھ بیچینی کا اظہار کیا، نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔ یکا یک کھانسی کا دورہ پڑا۔ فوراً ڈاکٹر بلا یا گیا، لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے وہ جان بحق ہو چکے تھے۔ ان کی وفات سے ایک اردو کا شیدائی، دلی کی تہذیب اور وضع داری و شرافت کا نمونہ ہم سے جدا ہو گیا۔ حق مغفرت کرے۔

اثر لکھنوی، میرزا جعفر علی خان

حضرت اثر بہت دن سے بیمار چلے آتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، جس سے وہ زیادہ نقل و حرکت کے قابل نہیں رہے تھے۔ ادھر حافظہ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ نظر آ رہا تھا کہ اب وہ برسوں کے نہیں، ہفتوں اور دنوں کے مہمان ہیں۔ چنانچہ وقت موعود آن پہنچا، اور مشکل کے دن ۶ جون ۱۹۲۴ء صبح کو وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ

اثر صاحب کا خاندان ایرانی تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ میرزا محمد شفیع اصفہان سے آگرے آئے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ طبیب تھے۔ آگرے میں اُن کی جذاقت نے ایسی شہرت حاصل کی کہ نواب وزیر شجاع الدولہ نے انھیں فیض آباد طلب کر لیا؛ مناسب قدر و منزلت ہوئی اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ حکیم محمد شفیع کے صاحبزادے میرزا محمد سمیع ذرہ تخلص (ف ۱۳۱۷ھ) کو بلا چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ وہی حکیم محمد سمیع ذرہ ہیں، جن کی یہ رباعی بہت مشہور ہے:-

گرما بگداشت وایں دل زار ہماں سرما بگداشت وایں دل زار ہماں
القصہ ہزار گرم و سرد عالم برما بگداشت وایں دل زار ہماں
خان علامہ تفضل حسین خان (ف ۱۸۰۱ء) بھی اسی خاندان سے تھے۔
حکیم محمد سمیع ذرہ کے بیٹے حکیم میرزا علی خان جو والد ہی کے ساتھ کر بلا گئے تھے
ان کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے، یہاں انھیں شاہی میں حکیم الملک کا
خطاب ملا اور بڑا عروج پایا۔ انھیں کی اولاد میں اثر مرحوم کے والد بزرگوار
حکیم میرزا تفضل حسین خان تھے۔

اثر اپنے خاندانی مکان کٹرہ ابو تراب خاں (لکھنؤ) میں ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو
پیدا ہوئے، منہ میں روایتی چاندی کا چھپہ نہیں، سونے کا چھپہ لیے ہوئے بدے
ہوئے حالات کے اقتضا سے خاندان کی روایات کے برخلاف، ان کی تعلیم
مغربی طرز پر ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں بی اے کی سند لی، ۱۹۰۹ء میں ڈپٹی کلکٹر
بنا دیے گئے اور ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں
ڈپٹی کمشنر اور کمشنر اور دوسرے ممتاز عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۳۵ء میں
کلکٹری پر منتقل ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں نیشن کے بعد اولاً کشمیر میں وزیر مال اور
پھر وہیں چندے وزیر اعظم بھی رہے۔ خدمات جلیلیہ کے لیے حکومت کی
طرف سے ۱۹۳۶ء میں خطاب خان بہادر اور ۱۹۳۹ء میں ایم بی ای، ملا۔
۱۹۲۴ء میں زیارات مقامات مقدسہ کی غرض سے عراق کا سفر کیا۔

۶ جون ۱۹۶۷ء بوقت صبح رہ گراے عالم جاودانی ہوئے۔ اسی شام جنازہ
اٹھا اور کر بلاے خدائیش (مال کٹورہ) میں دفن ہوئے۔

شاعری کا شوق اوائل سے تھا اور اس میں میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی (ف ۱۹۳۵ء)
سے تلمذ رہا۔ عزیز کے بعض دوسرے شاگردوں کے افسوسناک رویے کے بعکس

اثر آخر تک استاد کے احسانات کے معترف رہے۔ کمرۃ البوتاب کی سکونت سے ان کا خاندان اپنی زبان دانی کے باعث "ثقافت کٹرہ" کے عرف سے مشہور تھا۔ اثر کو بھی زبان و بیان اور فن شعر میں غیر معمولی بہارت اور قدرت حاصل تھی، جس کی شہادت ان کی تالیف "فرنگ اثر" سے بھی ملتی ہے۔ اس میں انھوں نے نور اللغات کی تعمیری تنقید اور اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کتاب پر انھیں یوپی حکومت کی طرف سے انعام بھی ملا تھا۔ حکومت ہند نے انھیں خطاب ایدم شری اسے نوازا تھا۔

ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے "چھان بین" اور "اثر کے تنقیدی مضامین" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ غالب کے کچھ اشعار کے مطالب "مطالو غائب" کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ انیس سے متعلق بھی ایک مجموعہ مضامین انیس کی مرثیہ نگاری کے نام سے ہو۔ ان کی غزلیات کے چار مجموعے شائع ہوئے: اثرستان، بہارستان، بہاراں، نو بہاراں، ایک جلد (عروسِ فطرت) میں نظمیں ہیں۔ ایک اور مجموعہ "لالہ دگل" کے نام سے بھی چھپ چکا ہے۔ لکھنوی ہوتے ہوئے بھی وہ میر کے عاشق تھے، انھوں نے اس کے کلیات کا ایک نمایندہ انتخاب بھی مزامیر کے نام سے کیا، جو دو حصوں میں چھپ چکا ہے۔ دوسری زبانوں کے نظموں کے تراجم اور مختارات کا ایک مجموعہ (رنگ بست) بھی ان سے یادگار ہے بھگوت گیتا کا ترجمہ، نعمۃ خداوندی کے نام سے کیا تھا۔ دو درامے۔ زنگاری بیگم (منظوم) اور ہلاک فریب۔ بھی چھپ چکے ہیں۔ پہلا فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہے، دوسرا پولستانی مصنف سکند کرانسکی کے ڈرامے کا آزاد ترجمہ

غرض شعر و ادب اور علم و فن میں ان کی تحریریں وسیع اور پائیدار حیثیت

کی مالک اور ہماری ادبی تاریخ کا قابلِ قدر حصہ ہیں۔

کلام کا مختصر انتخاب ملاحظہ ہو

کتے ہی شکوے زباں پر آئے، آکر رہ گئے

کچھ نہ کہتے بن پڑا، اگر دن جھکا کر رہ گئے

کیسی تسکین، بیقراری میں اضافہ ہو گیا

ہاتھ وہ نزدیک دل کے لائے، لا کر رہ گئے

اور جو کچھ ہو، یہ اندھیر نہ ہونے پائے

یاس امید کا بیڑا نہ ڈوبنے پائے

تسلی کی یہ باتیں ہیں کہ تڑپانے کی باتیں ہیں

نخوشی، پھر تبسم، پھر خطاب آہستہ آہستہ

محبت، راہ کرتی ہے یوہنی محبوب کے دل

کہ جیسے نشہ کرتی ہو شراب آہستہ آہستہ

بالوں نے اثر کے پھر ہنگامہ کیا برپا

منہ پھیر کے پھر کہ دو دیوانے کو کیا کہیے

تری گفتگو جو سن لے، تو ہو موج موج رقصاں

وہ ہے کیف خامشی میں کہ ہو غرقِ مے ترم

کیا چاہیے، کس نے اسے یہ بات سکھا دی

جب تم کو پکارا ہے، مرے دل نے صدا دی

محبت اور اظہارِ محبت یہی تو بات ہے دیوانے پن میں

دل کا ہے رونا، ٹھیل نہیں ہو، منہ کو کلیجا آنے دو

تھمتے ہی تھمتے، اشک تھینکے، ناصح کو سمجھانے دو

کہتے ہی کہتے حال کہہینگے ایسی نہیں جلدی کیا ہے؟
 دل تو ٹھکانے ہونے دو، اور آپ میں ہم کو آنے دو
 شکوہ کیا از راہ الفت، طنز سمجھ کر روٹھے ہو
 ہم بھی ہیں نادم اپنی خطا پر، آؤ تم بھی جانے دو
 صورتِ منزل کیا نظر آئے، ثرت ہیں دل پر نقشِ خودی
 عقل ہے دشمن، نفس ہے رہزن، ٹھوکریں کچھن کھانے دو
 دل کو اثر کے لوٹ لیا ہے، شوبخ نگہ اک کافر نے
 کوئی نہ اس کو رو دے سے روکو، آگ لگی ہو بجھانے دو
 ظہورِ عشق حقیقت طراز تھی ورنہ یہ دلکشی کہیں دار و رسن میں آئی ہو
 کھوٹے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھرنا راتوں کو
 جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں، عشق و جنوں کی باتوں کو
 بات یہ اور ہے شوق کے ہاتھوں خونِ دل عاشق ہو جا
 کام نہیں کچھ خونریزی سے، تیرے خالی ہاتھوں کو
 کیا کیا ہم پر لطف و کرم ہے، کیسی کیسی ہر دوفا
 تلخ اگر سن سکتے نہیں، تو کیوں چھیڑوان باتوں کو
 ہونہ ہو، سب اپنی بہتی، لاکھ کروانکارا اثر!
 نیند آنکھوں کی اڑاتے ہو، کہہ کہہ کے فسانہ راتوں کو
 دل کہ ہلاک شوق تھا، اب ہے حسن کی دنیا، کیا کہنا!
 جو شربِ طرب ہو، ترکِ طلب میں، ترکِ طلب کا کیا کہنا
 آئینہ دارِ عشرتِ دریا، قطرہ بھی مثلِ دریا ہے
 کیسی جدائی، وصل کہاں کا، ایک ہے نقشا، کیا کہنا

حیف اثر کا کھویا سا رہنا، اور کبھی جو بات بھی کی
طنز سے تیرا سنہن کر کہنا: "آپ کی سننا، کیا کہنا!"

آغازِ محبت کی لذت، انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو موسے رستے تھے، اب ہاتھ لگانا مشکل ہے
ہم نے رورو کے رات کاٹی ہے آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

حیف تمہیں فرصت ہی نہیں ہو، ورنہ کیا کیا حسرت کھتی
حال ہمارا سن لیتے، اور اپنا حال سناتے تم
جان کو روگ ہیں دنیا بھر کے ہم تو پھپھٹائے محبت کر کے

سوئے مستقبل رواں ہو شہپروں پر حال کے
بھول جا ماضی کو، لاش کہنے اک مدفن میں ہے
زمین، بامِ کامیابی کا، ہیں یہ ناکامیاں

سعی سے باز آنے ہرگز جان جب تک تن میں ہے
اپنی ہستی محو کر دے گشتِ زارِ جہد میں
بارِ زور ہوتا نہیں وہ دانہ، جو خرمن میں ہے

دل میں ہمت ہو اگر، اور استوار ی عزم میں
موم سے بھی پھر اثر! بڑھ کر گداز آہن میں ہے
کسی کا ہاے، یہ کہنا اثر سے وقتِ وداع

جو ہو سکے، تو ہمیں دل سے تم بھلا دینا
حال بھی اپنا سناؤ نگاتھیں اک دورِ اول تو ٹھہر جانے دو
دیکھو نہ آنکھ پھر کے کسی کی طرف بھی

تم کو خبر نہیں، جو تمہاری نظریں ہے

نہیں شرط ابتدا کی، نہیں قید انتہا کی
 ہے لطیف قصہ غم، اسے پھیڑ دو جہاں سے
 برق شرمندہ ادھر، میں ہوں پشیمان ادھر
 چار تنکوں کے سوا، خاک نشین میں نہیں
 ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں
 در نہ آلودہ جبین بندگی ہو جائیگی
 جوش رہتا ہے بس اتنا دم تحریک جنوں
 جیسے چھینے لیے جاتا ہے گریباں کوئی
 اس قدر بے اعتباری پر ہے اتنا اعتبار
 بیوفا! یہ تیرے وعدے میں عجب تاثیر ہے
 اک بات بھلا پوچھیں، کس طرح مناؤ گے؟
 جیسے کوئی روٹھا ہے، اور تم کو منانا ہے
 دیکھنا ظرف کہ باد صفت ہزاراں مستی
 راز میخانے کا محفوظ ہے میخانے میں
 آکے زرا میری قسم آزما تجھ سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہو
 ہنگامہ ہستی کی بس اتنی حقیقت ہے
 اک موج نکلے جو اٹھ کر پھر مل گئی دریا میں

نذر سجاد حیدر

نذر سجاد حیدر جنہیں کسی نے اردو کی جین آسٹن کہا ہے، اتر پردیش کے ایک قدیم زمیندار گھرانے کی نام لیوا تھیں۔ ان کے پردادا میر معصوم علی (مصنف انشائے معصوم) سلطنت اودھ میں ناظم اور چکھہ دار تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے پنجاب کا نظم و نسق چلانے کے لیے جن اصحاب کا یوپی سے انتخاب کیا تھا، ان میں میر معصوم علی کے صاحبزادے خان بہادر میر قائم علی بھی تھے۔ انھوں نے پنجاب کے قانون اور ارضی کی تشکیل اور تنظیم میں نمایاں حصہ لیا۔ میر قائم علی کے پوتے اور میر منظر علی کے بیٹے خان بہادر میر نذر الباقر تین فوج کے رسد (سیلائی) کے محکمے میں ایجنٹ کی حیثیت سے صوبہ سرحد میں تعینات رہے۔ یہیں ان کے ہاں ۱۸۹۴ء میں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے نذر سجاد حیدر رکھا۔ یہ لڑکی اپنے خاندانی ماحول کے اثرات کے تحت بہت جلد لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گئی، اور اس کے مضمون بنت نذر الباقر کے قلمی نام سے

سید ممتاز علی مرحوم کے ماہانہ رسالے تہذیب نسواں میں چھپنے لگے۔ ۱۹۰۸ء میں جب اس کی عمر مشکل سے ۴۴ سال کی ہو گئی، اس کا پہلا ناول "اختر النایم" داد الاشاعت، لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

تہذیب نسواں کے علاوہ ان کے مضمون بچوں کے ہفتہ وار پھول اور دوسرے رسائل میں بھی شائع ہو رہے تھے۔ ان کا معیار اتنا بلند تھا کہ مصنف کی دھوم مچ گئی۔ شدہ شدہ اس کی اطلاع نواب بیگم بھوپال تک پہنچی، اور انھوں نے انھیں اپنا سکریٹری مقرر کرنے کی دعوت دی؛ لیکن میر نذر الباقی نے اپنی ساری روشن خیالی کے باوجود بیٹی کو یہ ملازمت قبول کرنے کی اجازت نہ دی۔ میر نذر الباقی رتوں کے روایتی پردے کے قائل نہیں تھے؛ لہذا ان کے گھر میں بھی اس کا رواج نہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی بچیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیا، وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ لڑکیاں شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر جہاں چاہیں اکیلی پھرتی رہیں۔

۱۹۱۲ء میں نذر الباقی کی شادی سید سجاد حیدر یلدرم سے ہو گئی، جو اردو ادب میں رومانی افسانے اور مضمون نگاری کے بانیوں میں سے ہیں۔ یلدرم انگریزی ملازمت کے سلسلے میں بہت دن تک قسطنطنیہ اور بغداد میں مقیم رہے تھے اور وہاں سے واپسی پر امیر کابل کے نائب پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہو کر مسوری میں رہنے لگے تھے۔ جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی تو وہ ۱۹۲۰ء میں اس کے پیریٹریڈ (مجل) مقرر ہوئے۔ شادی کے بعد نذر الباقی بیگم نے اپنا قلمی نام نذر الباقی بدل کر نذر سجاد حیدر رکھ لیا۔ انھوں نے ہر طرح یلدرم کا ہاتھ بٹایا۔ یونیورسٹی فنڈ میں چندہ جمع کرنے کی تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، بلکہ وہ اس کی یو۔ پی کی صوبائی شاخ کی سکریٹری بھی

رہیں۔ پھر کھدر پر چارہ میں پوری گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اسلامی ملکوں کی حیات بھی کی تھی۔ اس کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ انھوں نے "اخر النساء بکیم" کے علاوہ اور بھی متعدد ناول لکھے، جن میں سے حرماں نصیب آہِ مظلوماں، انجہ، جانباز، ثریا، مذہب اور عشق وغیرہ نے خاصی شہرت حاصل کی۔

انھیں ۲۰-۲۵ برس سے فشارِ دم (ہائی بلڈ پریشر) کا عارضہ تھا؛ ۱۹۶۱ء میں علاج کے لیے لندن بھی گئی تھیں۔ عمر کے ساتھ کچھ اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ آخر ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو سمیٹی میں انتقال ہو گیا۔ اشنا عشقِ آرام گاہ، رحمت آباد (سمیٹی) میں دفن ہوئیں۔

اس سلسلے میں دو ایک اور باتوں کا ذکر دل چسپی کا باعث ہو گا:-
مذہر سجاد حیدر کے دادا میر مظہر علی سیالکوٹ میں تحصیلدار تھے۔ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد (عرف میاں نتھو) ان کے گھر پر بیٹھ کر کپڑے سینے اور رفو کا کام کیا کرتے تھے۔ اقبال اپنی طالب علمی کے زمانے میں میر مظہر علی کے تینوں بیٹوں کے ساتھ اسکول جایا کرتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ اقبال نے اپنے خطوں میں مذہر سجاد حیدر کو "آقا زادی" کے لقب سے خطاب کیا ہے۔

اردو کے ایک مصنف میر افضل علی ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب "تجلیات" آج سے ۵۰-۵۵ برس پہلے اچھی خاصی مشہور رہی ہے۔ وہ کسی زمانے میں پنجاب میں انکم ٹکس کے محکمے میں ملازم تھے۔ اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ نسبتاً جوان عمری میں ان کا ۱۹۳۷ء میں انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت وہ غالباً لاہور میں اڈیشنل انکم ٹکس کمشنر تھے۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے

احمدی تھے۔ توخیر، میر فضل علی، مرحومہ نذر سجاد حیدر کے ماموں زاد دادا
 چھوٹے زاد (بھائی) تھے؛ اُن کی والدہ اکبری بیگم ان کی چھوٹھی تھیں میر فضل علی
 کی شادی ثروت آرا بیگم یعنی نذر سجاد حیدر کی چھوٹی بہن سے ہوئی تھی۔
 خود اکبری بیگم کا مشہور ناول "گودڑ کا لال" غالباً ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا
 تھا۔

قرۃ العین حیدر جنھیں ۱۹۶۷ء (۱۹۶۷ء) افسانوں کے مجموعے 'پت بھر کی آواز' پر
 سہتیہ اکادمی کا انعام ملا ہے، نذر سجاد حیدر کی صاحبزادی ہیں۔

علی بہادر خان، حافظ

ان کا خاندان مراد آباد کا رہنے والا تھا۔ علی بہادر خان ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا ان کی بہت کم عمری میں انتقال ہو گیا، جب کہ ہنوز ان کی تعلیم شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے ان کی تربیت کا بار بڑی مردانگی سے اٹھایا اور انھیں اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ان کا تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ دسویں درجے میں صوبے بھر کے اولین دس طلبہ میں تھے؛ وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ پہنچے؛ ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ان کے معاصر تھے۔ یہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی ایس سی کی امتیازی سند لی۔ ایم ایس سی میں تعلیم پڑھے تھے کہ ملک میں قومی تحریک اور عدم تعاون کے ہنگامے میں کانج کو خیر باد کہہ دیا، اور کانگریس اور خلافت کے سرگرم رکن بن گئے۔

اب انھوں نے صحافت کی طرف رخ کیا۔ "پانچ" جلیپور اور "مدینہ" بجنور اور "نصرت" بمبئی کی ادارت سے وابستہ رہے، اور اس میں اتنی کامیابی حاصل

کی کہ مرکزی جمعیت خلافت کے اخبار خلافت بھٹی کی ادارت ان کے سپرد کر دی گئی۔ اس عہدے پر چار برس تک کام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا مفتے دار "اتحاد" اور حواشیں کے لیے "معین نسواں" جاری کیے۔ اسی کے ساتھ روزنامہ "ہلال" جاری کیا، جو آج تک زندہ ہے۔ اسی دوران میں قید و بند کے ابتلا سے بھی دو چار ہونا پڑا۔

وسیع معلومات کے مالک تھے اور متعدد زبانیں جانتے تھے۔ قلم میں زور رکھا اس لیے ان کی تحریر سے وثوق اور وقار کا اظہار ہوتا تھا۔ صحافتی سرگرمیوں کے علاوہ بعض کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔ مثلاً محمود غزنوی، حکومت الہیہ، پردہ اور اسلام، ترکی زبان وغیرہ۔ بعض انگریزی کتابیں اور مختصر رسالے بھی شائع ہوئے، انگریزی میں بعض پرچے بھی چھاپے۔ وفات سے پہلے اردو مفتے دار "دور جدید" کے ایڈیٹر تھے۔

حرکت قلب کے بند ہو جانے سے ۶/۵ نومبر ۱۹۶۷ء کی درمیانی شب دلی میں انتقال کیا۔ اگلے دن جنازہ اٹھا اور جسدِ خاکی فیروز شاہ کوٹلہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ تخلص ہلال تھا۔ ایک غزل کے چند شعر دیکھیے:

ستم سے کھیلنے والے، جفا سے کھیلنے والے

جفا تو کیا، مسلمان ہیں قضا سے کھیلنے والے

مسلمان خاک و خوں میں جان پر کھیلے ہیں نیاس

خبر بھی ہو تجھے، رقص و غنا سے کھیلنے والے!

جہادِ زندگی ہے کس قدر مجموعہء اضمحلال

بقا کا لطف، پاتے ہیں، فنا سے کھیلنے والے

تعجب کیا، بنائیں جیلوں میں آشیاں اپنا
 چمن میں جلوہ برق و قنا سے کھیلنے والے
 کبھی تو خاک و خوں میں جان پر کھیلے، تو ہم جاہل
 خدا کے نام پر، کبر و ریا سے کھیلنے والے!
 وہی منزل پہ بڑھتے ہیں، وہی ساحل کو پاتے ہیں
 سفینے جو ہیں گمراہ اب بلا سے کھیلنے والے
 شکستہ ہو رہا ہے زندگی، ٹوٹی ہوئی مضراب گ
 تو میں کیا، ہم ہیں ساز بے نوا سے کھیلنے والے
 ہلاک! ان کو ملے گا لطف جینے اور مرنے کا
 جہاد حق میں جو ہوں گے قصا سے کھیلنے والے

ہماشہ سدرشن، بدری ناتھ

منشی پریم چند کی افسانہ نگاری نے بہت لوگوں کو متاثر کیا، لیکن غالباً ہماشہ سدرشن اور اعظم کرپوری کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ اعظم کرپوری کو ہم سے جدا ہوئے بہت دن ہوئے۔ ہماشہ سدرشن کا بھی ۱۶ دسمبر، ۱۹۶۷ کو ہری کوشن اس ہسپتال بمبئی میں انتقال ہو گیا۔

ہماشہ سدرشن کا اصلی نام بدری ناتھ تھا۔ وہ ۱۸۹۶ء میں ضلع سیال کوٹ کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ شروع سے طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل تھی۔ کہتے ہیں کہ جب ان کا پہلا افسانہ چھپا ہے، وہ ہنوز آٹھویں درجے کے طالب علم تھے۔ بی اے تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد انھوں نے دو چیزوں کو اپنا اوڑھنا بچھوڑنا بنا لیا۔ آریہ سماج تحریک اور افسانہ نویسی؛ اور بعد کو یہ شوق محض افسانہ نویسی تک محدود ہو گیا۔ اس کی تکمیل اور تسکین کے لیے انھوں نے ماہنامہ چندن جاری کیا تھا، جس میں صرف افسانے چھپتے تھے۔ ان کی شہرت میں اب روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ فلیکس کیپنی والوں نے

پبلسٹی کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لیں، یہاں وہ چار سو مشاہیرہ پاتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے فلم کے لیے کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ کی۔ اس سلسلے میں وہ چند بھارتی لکھنوی (کلکتہ) اور نیو تھیٹر (کلکتہ) سے وابستہ رہے۔ آخر الذکر کی فلم دھوپ چھاؤں کی کہانی کے علاوہ گانے بھی انھیں نے لکھے تھے۔ اس کے گیت: دنیا رنگ رنگیلی بابا، اور تیری گٹھری میں لاگا چور، بہت مقبول ہوئے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی بھی انھیں اپنی مجلسوں میں شاکر کرتے تھے۔ ہر دلعزیز گلوکار سہگل کا ایک گیت: "اب میں کیا کروں، رکت جاؤں بہت مشہور ہے؛ یہ بھی سدرشن نے لکھا تھا۔ انھوں نے تقریباً ۵۴ فلموں کی کہانیاں، گیت اور مکالمے لکھے۔ ان میں دھوپ چھاؤں، پتھروں کا سوداگر، دشمن، گراموفون سنگر، پردیسی، سکندر، پڑوسی، چندر لیکھا وغیرہ بہت کامیاب رہیں۔

ہما شہ سدرشن نے اپنی تصنیفی زندگی اردو سے شروع کی تھی، لیکن بعد کو وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے تھے؛ اور رفتہ رفتہ صرف ہندی کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن اردو افسانے کے ارتقا میں ان کا حصہ فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو میں ان کے کہانیوں کے چار مجموعے شائع ہوئے: سدا بہار پھول، چندن، بہارستان اور سولہ سنگھار۔ اس کے علاوہ انھوں نے مشہور ہنگالی ناول نو بیس بنکم چندر چٹرجی کے دو ناول 'سمازیانے' اور 'زہریلا آب حیات' کے نام سے اردو زبان میں منتقل کیے تھے۔ ایک اور ناول 'عورت کی محبت' بھی ہنگالی سے ترجمہ کیا تھا۔ بے گناہ مجرم، بعض ہنگالی اور فرانسیسی ناولوں پر مبنی تھا۔ ہندی میں ان کی تقریباً بیس کتابیں ہیں۔

سراج لکھنوی، سراج الحسن

سراج الحسن سراج کہنے کو تو لکھنوی شاعر تھے۔ لیکن ہے یہ کہ ان کے ہاں لکھنؤ کی فارجیت سے زیادہ دلی کی داخلیت ملتی ہے۔ انھوں نے پیارے صابا رشید اور ان کے بھائی باقر رضا حمید۔ دونوں سے اصلاح لی اور خود استاد کا درجہ حاصل کیا۔ لکھنؤ میں ان کے بہت شاگرد ہیں۔

سراج کا خاندان قدیمی کٹرہ بانپکپور کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے والد شیخ نور الحسن نقل مکان کر کے لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ یہیں ۱۸۹۲ء میں سراج پیدا ہوئے۔ انگریزی میں دسویں درجے تک تعلیم چرچ مشن ہائی اسکول لکھنؤ میں پائی۔ اور اس کے بعد محکمہ امداد و باہمی (کوآپریٹو سوسائٹی) میں ملازم ہو گئے۔ ساری عمر اسی محکمے میں گزری اور یہیں سے ۱۹۲۶ء میں ریٹائرمنٹ پائی۔ کنبہ خاصا بڑا تھا۔ تنخواہ بھی قلیل رہی، اور ریٹائرمنٹ تو ظاہر ہے کہ قلیل تر ہونا ہی چاہیے تھی۔ اس لیے عسیر الحالی میں بسر ہوتی، کبھی خوش حالی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

انہوں نے ۱۹۰۸ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ اردو کا یہ مشہور شعرا نہیں کا ۱۵۰

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک زرا آپ کو رحمت ہوگی

کلام میں غزلیات کا انتخاب ”شعلہ آواز“ کے عنوان سے ۱۹۶۰ء کے قریب شائع ہوا تھا۔ بہت سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ کسی زمانے میں وہ لکھنؤ کی ادبی انجمن معراج الادب سے وابستہ رہے؛ بلکہ اس کے ایک سکریٹری تھے؛ صدر حکیم آشفتم تھے۔ لیکن بعد کو جب اس کے اراکین میں باہم شدید اختلافات پیدا ہوئے، تو سراج اس سے الگ ہو گئے اور بہار لکھنؤ کی قائم کردہ انجمن بہار ادب میں شامل ہو گئے۔ وہ مدتوں اس کے بھی سرگرم رکن رہے بہت خاموش اور مرخاں مریخ طبیعت پائی تھی؛ جذبات کی رد میں نہیں بہ جاتے تھے جس زمانے میں پورا لکھنؤ یاس بیکانہ کے خلاف تھا اور کسی کی جرأت نہیں تھی کہ عز اور ان کے دوستوں کو ناراض کر کے بیکانہ کے حق میں کلمہ خیر کہے، سراج نے بیکانہ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

تندرستی کبھی تسلی بخش نہیں رہی، فشار دم کے دائمی مریض تھے۔ بالآخر اسی سے ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء صبح ساڑھے آٹھ بجے جان بحق ہوئے۔ عیشیاب کے قبرستان میں آخری آرام گاہ بنی۔

اب کچھ شعر دیکھیے، جو ان کے مجموعہ کلام شعلہ آواز سے ماخوذ ہیں:

مری فنا بھی ہو تکمیلِ آرزو سے حیات کہ خاک تو ہوں، مگر خاک کو سے یار ہوں
ہو خوابِ عدم زلفِ سیاہ فام نہیں ہو اس شام کے بعد اور کوئی شام نہیں ہو
روشنی کرتا ہوں کم، شمع جلاتا ہوں کبھی چاہتا ہوں کہ سرِ شام سحر ہو جائے
نصیحتیں ہی ناصح! مے سر آنکھوں پر جو خود کسی کو ضرورت ہو دل لگانے کی

جفا بھی کہتے ہیں احسان بھی جتاتے ہیں کہ جیسے ہم کو غرض ہو ستم اٹھانے کی
وہ سنگ راہ سہی، سنگ تار نہ سہی صلاحیت بھی تو ہو، قسمت آزمانے کی
کیا کہوں، حضرت ناصح! ہمیں حاضر ہے دماغ

پھر کسی دن نہ چلے آئیے، سمجھانے کو یا
اب آگے دیکھیے تقدیر کیا دکھاتی ہے

قفس تک آ کے تو پہنچا گئی بہار مجھے
پردوں سے منہ کو چھپائے قفس میں بیٹھا ہوں

یہ شرم ہے کہ نہ پہچان لے بہار مجھے
لشیں منتشر، ستیا دشمن، پھول بیگانے

قفس کے رہنے والو! آج ہی کل میں کھلی آتا ہوں
چہرہ اداس، آنکھوں میں آنسو، لبوں پہ آہ

سب رنگ پھیکے پڑ گئے، دل ٹوٹنے کے بعد
اب مجھے نامرادِ زلیست کہہ کے پکارتے ہیں لوگ

سب نے سمجھ لیا ہے یہ جیسے مرا خدا نہیں
تجھ سے بہت ملا مجھے، تو نے بہت دیا مجھے

اب تجھے مانگتا ہوں میں، اب کوئی حوصلہ نہیں
باتیں بھی بیوفا کی بہت دل فریب ہیں

کچھ رنگ بھی بھرا ہے مرے اعتبار نے
ہر چکھڑی پہ کھینچ دیا جیسے تری شبیہ

کتنا حسین فریب دیا ہے بہار نے

یہ مقام عشق ہے کونسا، یہ ہیں کیسی صبر کی منزلیں
 نہ تڑپ ہو دل میں، نہ درد ہے، نہ سکون ہو نہ قرار ہو
 یہ صدا تو ہے وہی دُکھ بھری، مرے کان جس سے یہی شننا
 ذرا چپ رہو، مجھے سننے دو؛ یہ تو میرے دل کی پکار ہو
 حقیقت میں بندہ بھی بننا نہ آیا سمجھتے تھے دل میں، خدا ہو گئے ہم
 قیامت تھا تجھ سے نگاہوں کا ملنا زمانے سے نا آشنا ہو گئے ہم
 خوشا وہ دور کہ جب مرکز نگاہ تھے ہم
 پڑا جو وقت، تو اب کوئی رُشنا س نہیں
 ہوا ہے رفتہ رفتہ یوں کسی کا سنگِ دراپنا
 بچائے کتنی دہلیزوں سے بکرا یا ہو سراپنا
 بوں پہ خشکی، نظر میں حسرت، جو بات تھی تر جانِ دل تھی
 اسی کلف میں رہ گئے ہم، وہ حال پوچھیں تو ہم بتائیں
 غم کا خوگر ہو کہ یہ چیز ہے رہنے والی دل کو ماؤس نہ کر عیش کے سامانوں سے

آفتاب پانی پتی، الوپ چند

۱۱۳ اپریل ۱۸۹۶ء کو بیاکھی کے موسمی تیوہار کے دن پانی پت کے ایک کھاتے پیتے حسین خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کی تو یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں چکبست اور سرور کی قومی شاعری کا غلغلہ ہر طرف بلند ہو رہا تھا۔ اس سے انھیں بھی شعر گوئی کی طرف توجہ ہوئی۔ اتفاق سے انھیں ایام میں مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی روزنامہ زمیندار (لاہور) کی ملازمت ترک کر کے اپنے وطن واپس آ گئے۔ آفتاب نے ان سے اصلاح کی درخواست کی، جو قبول ہوئی۔ یہ سلسلہ سلیم کی وفات (۱۹۲۷ء) تک جاری رہا۔

آفتاب کو غزل سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی، انھوں نے زیادہ تر نظمیں کہی ہیں، اور وہ بھی بیشتر قومی اور سیاسی۔ ان کے منظومات کے چھ مجموعے چھپ چکے ہیں: جلوۂ آفتاب، آفتاب وطن، جذبات وطن، جذبات کی دنیا، حب وطن۔ شمشیر وطن۔ زبان سلیس اور بیان جذبات سے مملو ہے منظومات کے علاوہ انھوں نے بعض ڈرامے بھی تصنیف کیے تھے۔ ان میں سے من مریخی،

شریستی ابنخادایوی، ہندوستانی سورا، ویرچھتری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی قومی وادبی خدمات کے پیش نظر حکومت ہریانہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۶۷ء کو انہیں راج کوی کا اعزاز عطا کیا تھا۔

۹ فروری ۱۹۶۸ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے پانی پت ہی میں انتقال ہو گیا۔ یہاں چند شعرا ان کے مجموعے "جذبات کی دنیا" (دلی ۱۹۵۹ء) سے انتخاب کر کے پیش کیے جا رہے ہیں:-

کٹنے کو کٹ گئے ہیں ایام زندگی کے ناقابلِ بیاں ہیں، آلام زندگی کے
رود کے شب گزاری دن بھر ہے پریشاں یہ غمزدوں نے دیکھے آرام زندگی کے
اے ہنشین! مجھ سے کیا حال پوچھتا ہو پرورد میں فسانے، ناکام زندگی کے
سمجھا تھا باغِ عالم کو راحتوں کی جا ہو جب تک نظر نہ آئے تھے، اوم زندگی کے
امید تھی کہ جن سے آرام ہوگا حاصل کچھ بھی نہ کام آئے، وہ کام زندگی کے
اشکوں سے اور آہوں سے تازہ کر رہا ہوں کچھ واقعات پر غم ناکام زندگی کے
ہوش و حواس جب سے کھوئے ہیں بے غم پیغام موت کے ہیں، پیغام زندگی کے
کس کو ہوئی سیسیر، اے آفتابِ راحت

پربادۂ الم سے ہیں جامِ زندگی کے

کبھی روتا ہے پہروں، اور کبھی فریاد کرتا ہے

حقیقت میں یہ اک تصویرِ غم، یوں بھی ہو، اور یوں بھی

نگاہِ مہر ڈالیں، یا چلائیں ظلم کے خنجر

دلِ مظلوم پر ان کا کرم، یوں بھی ہو، اور یوں بھی

گروں فریاد اگر ہو حکم، ورنہ گھٹ کے مرجاؤں

محبت میں سر تسلیم خم، یوں بھی ہو، اور یوں بھی

نفس میں بند کر دے، یا مجھے آزاد رہنے دے
 مری تقدیر میں سوزِ المایوں بھی ہے اور یوں بھی
 رہوں خاموش، تو مشکل؛ کروں فریاد، تو مشکل
 مرے نازوں پلے دل پر ستم یوں بھی ہو اور یوں بھی
 مزاجب ہو کہ قصہ میرا تو خود پاک کر ڈالے
 مجھے مرنا، ترے سر کی قسم یوں بھی ہو اور یوں بھی
 کبھی فرقت کا کھٹکا ہے، کبھی غیروں کی الفت کا
 مریضِ عشق کا آنکھوں میں دم یوں بھی ہو اور یوں بھی
 نہ راحتِ مفلسی میں ہے، نہ دولت میں خوشی بھی
 سروں پر فکر کی تیغِ دودم یوں بھی ہو اور یوں بھی
 کبھی یہ نظم لکھتا ہے، کبھی یہ نثر لکھتا ہے
 روال اے آفتاب! اپنا قلم یوں بھی ہو اور یوں بھی
 اپنی حالت کے بدلنے کا ہے گرم کو یقیں
 گردشِ دہرے تیار بدلنے کے لیے
 چاہتا ہوں کہ کہوں حالِ محبت ان سے
 دل یہ کہتا ہے کہ افسانہ غم یاد نہیں
 آدمی کے لیے اچھا نہیں غافل ہونا
 وہ بھی کیا ہے جسے مرنے کی گھڑی یاد نہیں

محمد عبدالباقی

اردو کے ممتاز صحافی مولانا محمد عبدالباقی کا بروز جمعہ ۲۳ فروری ۱۹۶۸ء سارے
پانچ بجے شام دہلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ایک زمانے سے اختلاجِ قلب کے
مریض تھے۔ ۲۱ فروری کو مرض کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر انھیں سہروردہ ہسپتال
(دہلی) میں داخل کیا گیا، جہاں دو دن بعد حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رہ کر
عالم جاودانی ہوئے۔ اگلے دن ۲۲ فروری کو جنازہ اٹھا۔ نمازِ جنازہ قاضی
زین العابدین سجاد استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پڑھائی اور انھیں جامعہ نگر
کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا محمد عبدالباقی کو اتھ، ضلع شاہ آباد (بہار) کے ایک ٹپھان خاندان میں
۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ یہ جگہ شیر شاہ سوری کی جگہ ولادت سہرام سے کوئی دس
بارہ میل دور پٹھانوں کی مشہور بستی ہے۔ ان کے والد عبدالسلام صاحب فوج
میں ڈاکٹر تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور پہنچے اور
مولانا ظفر علی خاں کے روزنامہ زمیندار کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ یہاں

الگ ہوئے، تو صدیق حبیب اور محفوظ الحق (جامعی) کے تعاون سے روزنامہ "آزاد" نکالا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو میں اس شان اور اہتمام سے کوئی روزنامہ آج تک نہیں چھپا۔ افسوس کہ یہ چشم حوادث کا شکار ہو گیا! اس معیار کے احباب کے اخراجات کے لیے جس قارون کے خزانے کی ضرورت تھی، وہ باقی صاحب اور ان کے دوستوں کے پاس تھا نہیں؛ چنانچہ چند ماہ بعد پرچہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بہار چلے گئے اور پٹنہ سے "استقلال" جاری کیا، جو مفتے میں دوبار چھپتا تھا۔ جب ۱۹۳۶ء میں کانگریس نے سری کرشن سنہا کی قیادت میں بہار میں پہلی وزارت بنائی، تو باقی صاحب اس میں مفصلات کے لیے پہلی افسر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں جمیل مظہری اور رام دھاری سنگھ دیگر بھی اسی محکمے میں ملازم تھے۔ جب سری کرشن سنہا کی وزارت مستعفی ہوئی، تو یہ لاہور پہنچے۔ اتحاد پارٹی کے اکابر سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ خضر جیات خان ٹوانہ نے انھیں اپنے پلیٹی ڈپارٹمنٹ کا ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر کر دیا (ٹوٹر کٹر نو احمد صاحب تھے)۔

آزادی اور تقسیم ملک کے بعد وہ دلی آئے اور "پیام وطن" کے نام سے اپنا روزنامہ شائع کرنے لگے۔ یہ پرچہ کوئی تین چار برس جاری رہا۔ اس کے بند ہو جانے پر وہ ریاست کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن یہاں کی فہسا اس نہ آئی، اور انھیں دلی واپس آنا پڑا۔ یہاں مختلف رسائل و جرائد میں مضمون لکھ کر بسر اوقات کے لیے کچھ پیدا کر لیتے تھے۔ آخری ایام میں اپنا ایک ہفت روزہ "کاروان سہد" شائع کرتے تھے، اور اس کے علاوہ متعدد دوسرے پرچوں میں بھی اجرت پر مضمون لکھتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بلند پایہ صحافی تھے۔ وسیع معلومات، زور قلم،

مذکورہ معاصرین

قوتِ استدلال، ان کی تحریر کا طرہ امتیاز تھے۔ لیکن افسوس کہ عدم استقلال
اور مزاج کے لالچابی پن نے کہیں جم کر کام نہ کرنے دیا؛ اسی لیے بیشتر زمانہ
افلاس اور تکلیف میں بسر ہوا۔

صولت ٹونکی، محمود الحسن عرب

محمود الحسن نام تھا، لیکن چوں کہ قوم کے عرب تھے، اس لیے عام طور پر محمود الحسن عرب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ان کے والد سید حامد عرب، نواب ابراہیم علی خان بہادر کے غہد میں ٹونک وارد ہوئے۔ یہاں ان کی مناسبت آؤ بھگت ہوئی۔ نواب صاحب نے دو گاؤں "جایدا اہل عرب" کے نام سے وقف کر رکھے تھے، ان سے عرب مہانوں کو تحفے تحائف اور نذرانے دیے جاتے تھے۔ انھوں نے سید حامد کو 'معرف عرب' نامزد کر کے اس جایدا اہل عرب کا منصرم بنا دیا۔

یہیں ٹونک میں ۱۳۱۳ھ میں سید حامد کے ہاں محمود الحسن پیدا ہوئے، تو نواب وزیر الدولہ مرحوم کی صاحب دل اور پختہ بہور صاحبزادہ عبداللہ خان کی بیوی، رقیہ بیگم نے نو مولود کو اپنا مستثنیٰ بنا لیا۔ چنانچہ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی اور وہ شاہی خاندان کے صاحبزادگان کے ساتھ پروان چڑھے۔ تعلیم کا معیار بھی بلند رہا، مختلف اساتذہ سے جملہ درسیات

پر عبور اور ان میں پوری مہارت حاصل کی۔

نواب ابراہیم علی خان شاعر تھے، خلیل تخلص تھا۔ بعض اساتذہ عہد ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ سلیمان خان اسد لکھنوی، احمد حسین بسمل خیر آبادی، افتخار حسین مضطر خیر آبادی، ظہیر دہلوی ان میں خاص طور پر مشہور ہیں۔ نواب صاحب کے اس ذوق کے باعث پوری فضا پر شعر و نغمہ چھائے ہوئے تھے۔ داغ کے مشہور تلامذہ صاحبزادہ احمد سعید خان عاشق اور کیف کی پرورش اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ صولت نے ہوش سنبھالا، تو وہ کبھی اسی کیف و رنگ کی دنیا میں کھو گئے، اور شعر کہنے لگے، اس میں مشورہ عاشق اور کیف سے رہا۔ دونوں استاد ماہر فن اور قادر الکلام سخنور تھے۔ بہت جلد صولت بھی اس میدان کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو گئے۔ رہی سہی کسر مشق نے پوری کر دی، اور ان کا شمار اپنے زمانے کے صف اول کے شاعروں میں ہونے لگا۔

بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ درباری تعلق کے باعث ان کے کلام میں قصائد اور مدحیہ قطعات وغیرہ کا بھی وافر حصہ ہو۔ ان کی عشق رسو میں ڈوبی ہوئی نعتیں مولود کی محفلوں میں بڑی مقبول ہیں۔ ٹونک کی ایک خاص صنف سخن چار بیتی ہے۔

صولت نے اس میں بھی طبع بدلت پسند کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ کچھ مزاحیہ کلام بھی ہے، لیکن افسوس کہ مزاح کی وارفتگی اور لا ابالی پن نے عمر بھر کلام کی تدوین سے بے نیاز رکھا، آج تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ غیر مرتب کلام ان کے ورثہ کے پاس موجود ہے۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ محنت کر کے اس کا ایک نمایندہ انتخاب شائع کر دے! اس طرح یہ صنائع

ہونے سے بچ جائیگا اور ان کی یادگار بھی قائم رہیگی۔
انہوں نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ صاحبزادہ افتخار علی خان ان کے شاگرد
تھے، دوسروں پر مہینہ اندر انہیں پیش کرتے تھے۔ نواب اسماعیل علی خان نے
بھی سو روپے مہینہ اپنے جیب خاص سے ان کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ جاوید
ابن عرب، ادرقیہ بیگم کے تزکے سے بھی کچھ ملتا تھا۔ لیکن چوں کہ ذمے داریاں
بہت تھیں، اس پر گرانی کا یہ عالم کہ اس نے بڑے بڑوں کا مطلقہ بند کر
رکھا ہے۔ تنگی ترشی سے بسر اوقات ہوتی تھی۔

۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء کی صبح گلے کے کینسر کے عارضے سے انتقال ہوا۔ خیر
تو ایک بہانہ ہو گیا، ورنہ ہے یہ کہ جب ۱۹۶۷ء میں ان کا بڑا بیٹا پیارے میا
اللہ کو پیارا ہوا تو اسی دن سے وہ گھلنے لگے تھے۔ یہی غم جان لیوا ثابت
ہوا۔ ٹونک کے مشہور شاہی قبرستان موتی باغ کے قطعہ خاص میں دفن
ہوئے۔ ہجری سال وفات (۱۳۸۷) ان کے نام مولانا محمود الحسن صولت
ٹونکی سے برآمد ہوتا ہے۔ اولاد میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑی۔
انتخاب کلام درج ذیل ہے۔

حدو کی پاسداری کا تودل سے شک نکل جاتا
کسی صورت سے لے لیتا ہمارا امتحاں قاتل
ہر اک اس کی ادا پر خود ہی اپنی جان دی ہم نے
حقیقت میں ہمیں قاتل ہیں اپنے وہ کہاں قاتل
ہمیں پھر شک رہیگا عمر بھر، اپنی محبت میں
خدا کے واسطے، لے لے ہمارا امتحاں قاتل
ہو اکیوں کہ نہ تیرا خاتمہ بالجبر اے صولت!
جو اک اللہ ادم آخر بھی تھا ورنہ بال قاتل

نتیجہ کیا، اگر انسان جیسی شکل پائی ہے
وہ ہوا انسان، جو انسان کے کام آئے شکل میں
وہ کھلا دل سے ارماں جو نہ تھا دل سے نکلنے کا
جسے دل سے کالاستھا، وہ ارماں وہ گیارہ دل میں
چلو یہ عمر فانی کے ہاتھوں ہاتھ لے آئیں

حیاتِ جاودانی لٹ رہی ہو کوئے قاتل میں
سب کچھ وہی کام آیا قسمت میں جو بکھا تھا مجھ کو تو کسی سے بھی شکوہ نہ کلا کوئی
یہ تم نے مسکرائے، حجابِ بہار میں سب گل کھلائے ہیں چمنِ روزگار میں
ہوتا نہیں ہو صدق سے انسان منفصل صولتِ اہیں جو کہنا ہو کہ دیں ہزار میں
کہاں کا ناخدا، کیا سفینہ، موجِ دریا کیا خدا پر رکھ نظر اے سوئے ساحل دیکھنے والے
یامِ دور مطلعِ انوار نظر آتے ہیں اُن کے آنے کے سے آئندہ نظر آتے ہیں
حسبِ نحو اہ نظارہ نہیں ہونے پاتا یوں نظر آنے کو سو بار نظر آتے ہیں
اب بھی میں ان کو نہ پہچانوں تو میرا قصور

دارِ نہ وہ تو ہر طرف ہیں جلوہ گر میرے لیے
زلفِ درخ اُن کے سلامت کیا غمِ شام و سحر
شام اک میرے لیے ہو، اک سحر میرے لیے
نا تو انی سے مری یہ بار اٹھ سکتا نہیں
کوہِ بے صولت، غمِ مرگ جگر میرے لیے
رہتے ہیں آسمان و زمیں اس کی تاک میں
کیا کیا مصیبتیں ہیں غریب اک بشر کے ساتھ
اے خضر! عشق کر کے گزار دو تو بات ہے
طو لانی حیات، غمِ مختصر کے ساتھ

میں کب غم تہائی سے مضطر نہ ہوا تھا
کس دن ترا چاہت، بت کا فرانہ ہوا تھا؟
کیوں تم نے اٹھائی ہے قیامت میں قیامت
شکوہ تو تمہارا سحرِ محشر نہ ہوا تھا
اس درد میں یہ کیسی مصیبت ہے، الہی!
اس طرح تو جینا کبھی دُوبھر نہ ہوا تھا
یہ سچ نہیں کہ مزا الفتِ بتاں میں نہیں
سکتا ہی اتنی مگر قلبِ ناتواں میں نہیں
عجب یہ الفتِ اولاد کا کہ شمع ہے
جو دل کو چین، قفس میں ہو آشاں میں نہیں
وہ فرق تا بہ قدم سب ترے محاسن ہیں
کچھ اور ذکر کہیں میری داستاں میں نہیں
وہ تیرا در ہے کہ سر جس پہ خود بخود جھک جائے
کہیں یہ جذبِ کشش اور آستاں میں نہیں

پریم شکر فرحت دہلوی

پریم نے دہلی وال تھے۔ یہیں ۲۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو ایک متمول تجارتی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لالہ موہن لال گوئلہ کا (جو حیات میں) گھڑیوں کا کاروبار ہے۔ شاید اس خیال سے کہ بالآخر انھیں تجارت ہی کرنا ہے، تعلیم صرف انٹر تک پائی؛ لیکن اس کے باوجود انگریزی بہت اچھی جانتے تھے، جیسا کہ ان کے ٹیگور کی متعدد نظمیں کے تراجم سے ظاہر ہے۔ فارسی سے بھی اچھی مرادلت تھی۔ اردو کے علاوہ سندھی سے بھی شغف تھا؛ ہری ونش بچپن ان کے محبوب شاعر تھے۔ اردو میں انیس و دہرے کے مراٹھی اور اقبال کے کلام کے شیدائی تھے۔

اردو کا شوق بہت ابتدائے میں پیدا ہوا۔ چندے لالہ دھرم پال گیتا وفا سے مشورہ رہا؛ اب بہت دن سے لبیشور پرشا و منور لکھنوی اور کاکل نظا می دہلوی (تلمیذ سائل دہلوی مرحوم) سے اصلاح لیتے تھے۔ مجموعہ کلام ساز حیات کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔

آخری ایام میں ایک مثنوی (ساقی نامہ) لکھ رہے تھے، جو نامکمل رہ گئی۔
ان کے جسم میں موٹاپے کے اثرات تھے، جس سے قلب کا فعل کمزور ہونے لگا
تھا۔ ۱۳۰ اپریل ۱۹۶۸ء کو اچانک اپنے دوسرے سکونتی مکان میرٹھ میں حرکت
بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ کائناتی نظامی کے قطعہ تاریخ کا آخری شعر ہے:

از سر آہے ملی تاریخ یہ
"فرط غم سے سب ہیں دو پارہ جگر"

(۱۹۶۸ = ۱۹۶۷ + ۱)

اب چند شعر دیکھیے:-

نصیب غنیمتِ آدم کو لا مکاں بھی نہیں

اور آج اس سے پستی جہاں بھی نہیں

مزاجِ عشق کو مرغوب امتحاں بھی نہیں

مگر یہ بات محبت پہ کچھ گراں بھی نہیں

و نورِ شوق میں تعمیرِ خود کیا جس کو

سر نیاز کی قیمت وہ آستان بھی نہیں

وہ صحن و روش، یہ شمس و قمر، یہ دشتِ بیاباں کچھ بھی نہیں

جز اپنی حد پر وادِ نظر، اسے دیدہ حیراں! کچھ بھی نہیں

لطف اندوزِ نوائے سازِ عشرت ہو چکا محو، اب ہوتا ہوں، کیفِ نعمتِ رویش میں

ناداں سمجھ کے، مجھ پہ زمانہ ہو خندہ زن یہ مل رہا ہے میری وفا کا صلا مجھے

حجابِ گل میں پنہاں کون ہے، جان چمن ایسا

یہ کس کا ذکر کرتی ہے ہر اک پتی زباں ہو کر

”تذکرہ معاصرین“

رہ و فائیں ہر گام اک صعوبت ہے
کبھی کبھی تو یقیں پر بھی سوگماں گزرتے
ہر اک گماں نے جلایا مگر چراغ یقیں
یہ حادثات مرے درک پر گراں گزرتے

پرویز شاہدی، سید محمد اکرام حسین

ان کا اصلی نام سید محمد اکرام حسین تھا۔ ۱۹۱۰ء میں پٹنہ (لودھی کٹرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید احمد حسین (ف ۱۹۵۳ء) خاصے کھانے پیتے زمیندار تھے۔ اس لیے انھوں نے بیٹے کو ایک زمانے تک مدرسے نہیں بھیجا، تمام تعلیم بخ کے طور پر خاص اساتذہ کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے درس نظامیہ کا عربی اور فارسی کا بشیر نصاب پڑھا، جو بعد کو بہت کام آیا۔ اس کے بعد لامحالہ انگریزی کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۲۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے دسویں درجے کی سند لی۔ پھر پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، اور یہاں سے یکے بعد دیگرے بی اے اور ایم اے (اردو اور فارسی) اور قانون (ایل ایل بی) کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کی۔

شروع میں خیال تھا کہ وکالت کرینگے لیکن اسی زمانے میں ایک ناخوشگوار حادثہ پیش آیا جسے خود انھوں نے "جذباتی صدمہ" سے تعبیر کیا ہے۔ واقعہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ایک خاتون سے محبت ہو گئی اور وہ اس سے شادی

کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے لڑکی کے والدین اس عقد کے خلاف تھے؛ ہمارے ہاں والدین بچوں کے جذبات اور خواہشات کا کم ہی خیال کرتے ہیں۔ قصہ کوتاہ، ماں باپ نے لڑکی دوسری جگہ بیاہ دی۔ عنفوانِ شباب اور ایسا حادثہ، غریب کوٹنے کے دردِ یوار سے وحشت ہونے لگی؛ انھوں نے ترکِ وطن کی ٹھانی اور کلکتے کی راہ لی۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

کلکتے میں انھوں نے بسرِ اوقات کے لیے وکالت کی جگہ درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ شروع میں بہت دن تک مختلف اسکولوں میں معمولی جگہ اور قلیل مشاہرے پر کام کرنا پڑا۔ لیکن آدمی تھے مستقل مزاج اور دھن کے چکے، ہمت نہیں ہارے اور ڈٹے رہے۔ اسی دوران میں (۱۹۳۸ء) بی ٹی کی سند بھی لے لی، جس سے تعلیمی محکمے میں ترقی کا راستہ کھل گیا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک مدنا پور کالج میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں سرنیدرنا تھ کالج، کلکتہ میں اردو فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے؛ لیکن جلد ہی یہاں کی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۴۹ء میں وہ کیونسٹ تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی پاداش میں قید و بند تک نو بہت پہنچی۔ ڈیڑھ سال کی نظر بندی کے بعد ۱۹۵۱ء میں رہا ہوئے؛ تو معلوم ہوا کہ اب وہ کالج کی ملازمت نہیں مل سکتی۔ مجبوراً ایک معمولی اور مفلسی کے شکار اسکول میں ہیڈ ماسٹری قبول کر لی۔ یہاں تنخواہ اتنی بھی نہیں تھی کہ اس سے روزمرہ کے معمولی اخراجات ہی چل سکتے؛ لیکن مرنے کی تڑپ نہ تھا۔ حسبِ توقع، دو برس بعد اسکول نے دم توڑ دیا اور ان کی نوکری کے ماتھے بھی گئی۔ بارے، جلد بعد ہی اسی ایم او ہائی اسکول، کلکتہ میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اور اب گویا اطمینان کی سانس لینا نصیب ہوئی؛ یہاں وہ ۱۹۵۷ء

تک رہے۔

۱۹۵۸ء کے آغاز میں کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ کھلا، تو لکچرر کی جگہ پر ان کا تقرر ہو گیا؛ اپنی وفات تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔

مروبر ایام سے وہ ناکام محبت کا زخم مندرل ہو گیا تھا۔ اب کچھ ماویٰ آسائش بھی میسر تھی، اس لیے انھوں نے نومبر ۱۹۵۸ء میں ایک بنگالی خاتون (فضیلت بیگم) سے شادی کر لی۔ دونوں ہم مذاق تھے؛ وہ بھی ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ جہانی یادگار ایک نثر و سال لڑکی چھوڑی۔

انھیں ایک زمانے سے دے کا تکلیف دہ عارضہ لاحق تھا۔ آخری ایام میں بعض اور عوارض نے بھی آگھیرا تھا؛ بالخصوص کم خوابی اور بے چینی کی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ علاج ہو رہا تھا کہ ہر مئی مہینے کے دن طبیعت یکا یک زیادہ خراب ہو گئی؛ گیارہ بجے رات غشی کا دورہ پڑا۔ اس کے بعد وہ پھر ہوش میں نہیں آئے اور اسی حالت میں اگلے دن اتوار ۵ مئی ۱۹۶۸ء کو سات بجے شام جان بحق ہو گئے۔ پیر کی صبح کو جنازہ اٹھا اور گوبرا قبرستان (۱) میں سپرد خاک ہوئے۔

پرویز کے والد سید احمد حسین شعر کہتے تھے؛ احمد اور ضو تخلص تھا۔ پرویز نے جب ہوش سنبھالا، تو اپنے ارد گرد شعر و ادب کی باتیں ہی سنیں۔ چنانچہ یہ بھی بہت کم عمری میں شعر سے دلچسپی لینے لگے۔ جب سن تیز کو پہنچے، تو مولانا عین الہدیٰ ثمر (تلمیذ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی) سے مشورہ کرنے لگے۔ شاہدی کا جرم واپس دانا سید شاہد حسین کے نام کی مناسبت سے اضافہ کر لیا تھا۔ اگرچہ ان کی تعلیم و تربیت غزل کے دور اور ماحول میں ہوئی تھی، لیکن اپنے سیاسی رجحانات کے باعث انھوں نے غزل کے علاوہ نظم پر بھی

توجہ کی، اور اس میں اپنا منفرد مقام بنا لیا۔ وہ کل مند انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ "قص حیات" چھپ چکا ہے (مکتبہ شاہراہ ولی، ۱۹۷۵ء) دوسرا "تثلیث حیات" (الہ آباد میں زیر طبع ہو رہا) افسوس کہ یہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے شروع میں انھوں نے جو پیش لفظ لکھا تھا، اس میں مختصراً اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اور اپنے نظریۂ شعری پر بھی نظر ڈالی ہے۔

وہ کیونست خیال کے آدمی تھے، لیکن نہ ان کے خیالات میں جارحانہ شدت تھی، نہ ان کی وجہ سے ان کے کسی دوست کو کبھی کسی قسم کی شکایت پیدا ہوئی۔ ان کے تمام ملنے والے ان کی انسان دوستی اور وسیع قلبی، خلوص اور حسن نیت کے قائل تھے، ان کا کلام بھی اس کا شاہد ہے!

خدا بخشے، بہت سی خوبیاں انھیں مرنے والے میں

اب چند شعر دیکھیے، جو ان کے دوسرے مجموعے "تثلیث حیات" سے ماخوذ ہیں:

جب تک شریکِ حال کسی کی نظر نہ تھی تھی زندگی حسین، مگر اس قدر نہ تھی
وہ چشمِ شرمیلیں، جو بظاہر ادھر نہ تھی دل ہی سے ہم کلام تھی، اس کی خبر نہ تھی
کوئی دیر و حرم کو جا کے میخانے میں ڈال آئے

نہ حالِ شیخ اچھا ہے، نہ حالِ برہمن اچھا

زمانہ سازی اہل ہوس کی عمر دراز کہ آپ مجھ و وفا ہی کے امتحاں میں رہے
اذنِ شرکت ہی نہیں احساسِ یکجائی کو آج

مغفلیں تو منتشر کتنی دلِ تہتا میں ہیں

تذکرہ معاصرین

دل والوں کی خاموشی ہی، بادِ سماعت ہوتی ہے
بے آوازی کربِ فضا ہے، تم بھی چپ ہو، ہم بھی چپ
بھیس بدلتی آوازیں ہیں، شام و سحر کہلاتی ہیں
وقت کا دم کیا ٹوٹ گیا ہے، تم بھی چپ ہو، ہم بھی چپ
سکتے تھک اب آپہنچا ہو، بڑھتے بڑھتے کربِ سہاگ
ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہو، تم بھی چپ ہو، ہم بھی چپ
شاید نگاہ پہنچے اب وسعتِ زمیں تک پلٹا تو ہے تصور تنگ آ کے آسمان سے
سب کے سب واعظ بنے ہیں، بادہ کش کوئی نہیں

میکدے میں اب وہ قدرِ لغزش پیہم کہاں
آنسوؤں میں خرق ہو جاتا ہو دل کا اضطراب
غم پرستوں کے مقدر میں شعورِ غم کہاں
دیرانیوں نے بڑھ کے لہالی ہیں بستیوں
ہے زندگی تعاونِ عقل و جنوں کا نام دل سے سلوکِ ذہنِ رقیبانہ کیوں ہے
ہر دایت نے کیے تیرے ہی بت کو سجد ہر بغاوت مجھے تیری ہی پرستار ملی
منزل بھی ملیگی رستے میں، تم راہِ زندگی بات کرو

آغازِ سفر سے پہلے، کیوں انجامِ سفر کی بات کرو
ظالم نے لیا ہے شرما کر پھر گوشہِ دامالِ چٹکی میں
ہے وقت کہ تم بیباکی سے اب دیدہ تر کی بات کرو
آیا ہے چمن میں موسمِ گل، آئی ہیں ہوائیں زنداں تک
دیوار کی باتیں ہو لہنگی، اس وقت تو در کی بات کرو
ہے تیز ہوا، ہلتا ہے قفس، خطرے میں پڑی ہو ہر تلی
فریادِ اسیری بند کرو، اب جنبشِ پر کی بات کرو

کیوں دار و رسن کے سائے میں، منصور کی باتیں کرتے ہو؟
 رکھنا ہے جو اپنا سرا و نچا، تو اپنے ہی سر کی بات کرو
 کیوں اہل جنوں اربابِ خرد کی محفل میں خاموش رہیں
 وہ اپنے ہنر کی بات کریں، تم اپنے ہنر کی بات کرو
 کیا ربط و دف و دم توڑ چکے، موت آگئی کیا ہر نغمے کو!
 تم مطربِ جام و مینا ہو، کیوں تیغ و سپر کی بات کرو

بے چہرگی

ہزار چہرہ آدمی	ہزار پوست استخوان!
معاشیاتِ حرص کا ابتدا خلفشار ہو	ہزار لبِ فسدگی،
بحکم انتشار ہے	ہزار پردہ تشنگی،
نظامِ بے ہمار کا عظیم شامکار ہے	ہزار حیلہ بے دلی،
ہزار چہرہ آدمی	ہزار عشوہ خود سری،
خود اپنا چہرہ ڈھونڈتا	ہزار غمزہ عاجزی،
رواں رواں	ہزار پیچ آگہی،
ابھی یہاں،	ہزار عقدہ ابلی،
ابھی وہاں،	ہزار لہجہ خامشی،
نہ کوئی سمتِ ذہن میں،	ہزار مرگِ زندگی،
نہ کوئی راہِ سامنے!	غرورِ برتری کے ساتھ اختلاجِ کمتری!
فقط فریبِ کاریِ انا کی گرداؤں ڈھک	یہ پارہ پارہ آدمی،
کبھی ہو دوڑتا ادھر،	یہ ریزہ ریزہ آدمی،

کبھی ہے بھاگتا ادھر! ہزار چہرہ آدمی
 ہو کون اس کا ہمسفر؟ ہزار چہرگی لیے
 خود اس کے چہروں کے ہجوم میں جو چہرہ بھٹک رہا ہو بے ارادہ صرف اسی تلاش
 کھو گیا، دوبارہ وہ ملے گا کیا؟ کہ اس کو۔۔۔۔۔
 تعاون آئینے کا بھی فریب ہی فریب! چہرہ چاہیے۔
 نظر لگائے غوطہ کیا کہ آئینہ اتھاہ ہو خود اپنا چہرہ چاہیے۔
 خود اپنے چہروں کا ہجوم درطہ نگاہ ہو! وہ اصلی چہرہ چاہیے
 نہ کوئی نقش منفرد! بچھڑکے جو سسک رہا ہے
 نہ کوئی عکس معتبر چہروں ہی کی بھڑ میں

بنیک

یہ کنشت و کلیسا، یہ دیک و حرم
 سب کے سب بنیک ہیں، کفر و دیں کی قسم
 حصہ داری سیاست کی ہے خم بہ خم
 چمک کی صورت یہاں روز بگھٹتے ہیں ہم
 روز بگھٹتے ہو تم

کتے افسانے بنا کر رکھ لیے تھے شوق نے یوں نقاب الہی حقیقت نے کہ حیراں کر دیا
 کس قدر مضبوط نکلے تیرے دیوانے کے ہاتھ شام غم کو جب پھوٹا، صبح تاباں کر دیا
 ہے حیات اک شورش منزل آفرینی کی آتی جاتی سالنوں کو زندگی نہیں کہتے
 وقت گزرا جو بے خیالی میں وہ تڑپے ہی خیال میں گزرا

مرنے کے لیے نچنگی شوق کی ہے شرط جینے کے لیے تو ہوسِ خام بہت ہے
وعدہ نہیں ہے کوئی اگر ان کا انتظار پرویزا صبح و شام کیے جا رہا ہوں میں
شکایت کر رہے ہیں اب اسجدہ ہاے رایگاں مجھ سے
نہ دیکھا جائیگا اب سوے اُستال مجھ سے

فقیر سید وحید الدین

جن اصحاب کو ہمارا اجارہ بحیثیت نگہ (۱۷۹۲-۱۸۳۹ء) کے حالات کے مطالعے کا اتفاق ہوا ہے، انہیں یاد ہوگا کہ ان کے دربار کی ایک نمایاں شخصیت فقیر سید عزیز الدین کی بھی تھی۔ وہ کچھ مدت ہمارا اجارے کے وزیر بھی رہے۔ سکھ دورِ سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی ان کے خاندان کی علم و ادب سے دلچسپی اور وضع داری قائم رہی۔ فقیر سید وحید الدین اسی نامور خاندان کے حشتم و چراغ تھے۔

فقیر سید وحید الدین کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں اپنے کئی دوستوں کی طرح انھوں نے بھی فوجی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اس میں کرنل کے عہدے تک ترقی کی۔

انھیں اقبال سے عشق تھا، ان سے ذاتی تعلقات بھی ایک زمانے تک رہے چنانچہ انھوں نے اقبال کی زندگی سے متعلق تصاویر کا ایک مجموعہ (الہم) اقبال ان پکچر کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد روزگار فقیر (دوحصے) کے نام سے ایک کتاب شائع کی، جو طباعت و کتابت کے پہلو سے بھی اردو کی چند بہترین

کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اس کا عنوان اقبال کی مشہور رباعی سے لیا گیا۔

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید لینی از حجاز آید کہ ناید

سر آمدِ رودگارِ ایں فقیرے وگر دانائے را از آید کہ ناید

اس کتاب میں انھوں نے اقبال کے حالات لکھے ہیں، جو خود ان کے علم میں تھے، ان کے عزیز دوستوں کے۔ اگرچہ یہ کتاب کوئی مسلسل سوانح عمری نہیں ہے، لیکن اس میں بعض بے حد قیمتی معلومات فراہم ہو گئی ہیں۔ کسی زمانے میں اقبال سے متعلق انھوں نے فیض کے تعاون سے ایک رنگین فلم بھی تیار کی تھی۔

فقیر سید وحید الدین نے حضرت رسول اسلام صلعم کی سوانح عمری (محسنِ اعظم) بھی لکھی تھی۔ یہ ان کی بہت مقبول کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اپنے ہمعصرین سے متعلق تاثرات اور یادداشتوں پر مشتمل ایک مجموعہ 'انجمن' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اور کبھی کبھی چھوٹی بڑی تحریریں ان سے یادگار ہیں۔

افسوس، ان کا بروز مہفہ ۲۰ جولائی ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ ان کی شرافت اور وضع داری اور علم و ادب کی سرپرستی ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات یاد آگئی: ایک شخص تھا امین چند، سیلانی قسم کے انسان تھا۔ ۱۸۵۱-۱۸۵۲ء میں اس نے ملک کے بعض حصوں کی سیاحت کی اور بعد کو اس کے کوائف کتابی شکل میں سفرنامہ منشی امین چند کے عنوان سے ۱۸۵۹ء میں شائع کر دیے (مطبع کوہ نور لاہور) اس میں وہ لکھتا ہے (ص ۴۳) کہ فقیر نور الدین اور فقیر عزیز الدین، دراصل قوم کے حجام تھے۔ بظاہر یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے۔ خدا معلوم، اس کا ذریعہ معلومات کیا تھا۔

شفاء گوالیاری سید محمد حسن

ان کے والد سید عوض علی طبابت کا پیشہ کرتے تھے۔ یہ خاندان دراصل قائم گنج (ضلع فرخ آباد - یوپی) کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جد امجد نقل مکان کر کے گوالیار میں جا بسے تھے۔ سید محمد حسن یہیں گوالیار میں دوشنبہ ۱۲ رمضان ۱۳۳۰ھ (۲۶ اگست ۱۹۱۲ء) کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام منظر علی تھا، جس سے ۱۳۳۰ء برآمد ہوتے ہیں۔

سید عوض علی اچھے طبیب تھے، لیکن اس سے بھی زیادہ کٹر مسلمان تھے۔ وہ بیٹے کو عالم دین اور فقیہ شہر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ چار برس ہی کی عمر میں یہ ایک مولوی کے سپرد کر دیے گئے اور قرآن سے تعلیم کا آغاز ہوا، اس کے بعد فارسی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اگر ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) میں ان کے والد کا (بصرہ ۵۰ سال) انتقال نہیں ہو گیا ہوتا، تو یقین ہے کہ یہ عربی فارسی کی تکمیل کے بعد کسی دینی درس گاہ میں مدرس بن جاتے یا پھر کسی مسجد کے پیش امام۔ لیکن جب اس کم عمری میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، تو ان کے بہنوئی مولوی احمد زمان

نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم زیادہ باقاعدگی سے ہونے لگی۔ عربی ختم ہو گئی، اور یہ اردو فارسی کے ساتھ انگریزی اور مراٹھی بھی پڑھنے لگے۔ اب انھوں نے میونسپل اسکول، لشکر گوالیار میں داخلہ لے لیا، حتیٰ کہ یہاں سے دسویں درجے کی سند حاصل کر لی۔ چونکہ نجی حالات آگے تعلیم جاری رکھنے میں مانع تھے، اس لیے انھوں نے طبی سند (H.A) حاصل کر لی۔ اور ریاست گوالیار کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ تقسیم ملک تک وہ گوالیار ہی میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب یہاں کی فضا مکدر ہو گئی، تو ہجرت کر کے بھوپال چلے گئے۔ یہاں "شفا ٹیکل ہال" کے نام سے اپنا مختصر ذاتی مطب اور دو خانہ کھول لیا اور یوں عزت و آبرو سے بسر کرنے لگے۔

انھیں تفکرات دنیا اور خاصے بڑے کنبے کی پرورش کے بارے پریشان حال رکھا۔ جسم بھی مٹنی اور اکھرا تھا، اس پر تنفس اور سعال کے پرانے مریض تھے۔ آنٹوں کی بیماری بھی لاحق تھی، اور اسی کے علاج کے لیے بھوپال کے ٹی بی ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ شنبہ ۲۳ جولائی ۱۹۶۸ء سات بجے شام اسی ہسپتال میں انتقال ہوا۔ جنازہ اگلے دن صبح اٹھا اور دوپہر کے قریب قبرستان کے باغ میں سپرد خاک ہوئے۔ بسمل رتلا می نے قطعہ تاریخ وفات کہا:

شستہ گو، پختہ گو، امیر سخن بزم سیما بکا مہ طلعت
وقت آنا تھا یہ بھی اے بسمل! "دردِ دل دے کے ہو شفا رخصت"

مرحوم نے شاعری ۱۹۲۴ء میں شروع کی۔ ہونہار بروا کے چکے چکنے پات بہت بلدان کا کلام پسند کیا جانے لگا، جس سے انھیں ۱۹۳۵ء میں ایک مختصر مجموعہ "گلدستہ شفا" کے نام سے شائع کرنے کی جرأت ہوئی (شمسی پریس، گوالیار)۔

اس میں صرف ۳۲ غزلیں اور ۳۲ ہی صفحات ہیں۔ ابھی تک انھوں نے کسی استاد

سے مشورہ سخن نہیں کیا تھا گو مشق سخن جاری تھی۔ بالآخر کئی دروازوں پر دستک دینے کے بعد ۱۹۴۰ء میں سیلاب اکبر آبادی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ پانچ سال بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں استاد نے نہ صرف فارغ الاصلاح قرار دے دیا، بلکہ دوسروں کے کلام پر اصلاح دینے کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ گوالیار کا ماحول جو کچھ تھا (اور اب بھی ہے) اس میں کسی علمی و ادبی یا شاعرانہ صلاحیتوں کے نمایاں ہونے اور ترقی کرنے کا موقع معدوم تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۷ء میں وہ بھوپال منتقل ہو گئے، تو یہاں کا گرد و پیش سراسر ان کے سازگار ثابت ہوا۔ شہر میں اچھے ادیبوں اور شاعروں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ذکی وارثی (ف ۱۹۵۰ء) اور محمد یوسف قیصر بھوپالی (ف ۱۹۶۸ء) جیسے اساتذہ یہاں موجود تھے۔ شفا بھی ان حضرات کے یہاں آنے جانے لگے؛ اور انھیں خود اعتراف تھا کہ میں نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔

یہیں بھوپال میں انھوں نے اپنے متعدد مجموعے مرتب کر کے شائع کیے: آیاتِ شفا (غزلیات؛ ۱۹۵۱ء)، نبضِ حیات (غزلیات؛ ۱۹۵۵ء)، شاخِ زمیون (رباعیات اور نظمیں)؛ رگِ حیات (نظمیں)؛ زخمِ گل (غزلیات؛ ۱۹۶۳ء) اب بحیثیت شاعر انھیں مسئلہ مقام حاصل تھا۔ ان کی فنی معلومات بھی بہت وسیع تھیں، خاص طور پر عروض کی واقفیت بہت اچھی تھی۔ ان کا حلقہ تلمذ کوئی ۴۰۰ شاگردوں پر مشتمل ہو گا۔

اتنی معنوی اولاد کے ساتھ مرحوم دنیوی لحاظ سے بھی خوش قسمت تھے؛ دو بیٹوں سے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

اب کچھ کلام ملاحظہ کیجیے، جو ان کے مجموعے "نبضِ حیات" سے ماخوذ ہے:-

بھروسا مشعلوں پر تاکجا، لے کارواں والو!
خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانو مقام اپنا

جہاں سے تو ذرا پہچان لے، اپنی حقیقت کو

وہیں سے فرض ہو جاتا ہے تجھ پر، احترام اپنا

کیا ہوئی تیری نگاہ ہر سزا؟ کیوں افق سے مانگتا ہے تو، سحر؟

عزمِ دل کی تو بڑھائے تو کوئی رہ گزر خود، ہے چہرا بخ رہ گزر

نگاہِ ودل کے پر تو سے کریں شام و سحر روشن

مہ و خورشید کی تابندگی تک بات کیوں پہنچے!

محبت کی کہانی ہو کہ نفرت کی حکایت ہو

کسی کی بھی سہی، لیکن کسی تک بات کیوں پہنچے

مجبور پہ مایوس پہ، یہ جو رہِ مسلسل مجبور کے مایوس کے، کیا دل نہیں ہوتا؟

اب اور کون سے گل رہ گئے ہیں کھلنے کو ابھی! خیر ہو، کیوں مسکرائے دیوانے

زمین سے گزرے ہیں، یا آسمان سے گزرے ہیں

جہاں کو ساتھ لیا ہے، جہاں سے گزرے ہیں

نہ پوچھیے، کششِ منزلِ غمِ حبا ناں

یہیں کے ہو گئے، جو بھی یہاں سے گزرے ہیں

وہ جب دیکھتے ہیں کبھی میری جانب

تو میں جانبِ آسمان دیکھتا ہوں

کہاں کی یاد، کس کا ذکر، اس کی بزمِ رنگیں میں

ہمارا نام بھی اب تو براے نام آتا ہے

خدا شاہد کہ دل سے تو خدا کا نام لیتا ہوں

مگر لب پر جب آتا ہے، اٹھارہ نام آتا ہو

زندگی ہے اک مسلسل سونہ، پیہم اضطراب
سعی حاصل سے قریب اور سعی لاحاصل سے دور

دل میں ہے عزم مسلسل، عزم میں پیہم تڑپ
ہیں وہی کچھ پاس منزل کے، جو ہیں منزل سے دور

حدِ عنوان سے آگے، آخر افسانے کہاں جلتے؟
تیری محفل سے بڑھ کر، تیرے دیوانے کہاں جاتے

غمِ دوراں نے بڑھ کر، نو بڑھادی شمعِ ہستی کی
غمِ جاناں کے یہ کھٹکے ہوئے، جانے کہاں جاتے

یہ رندوں کی ہو شانِ بے نیازی ساقیہ بورنہ
نہ جانے تم کہاں ہوتے، یہ منجانیے کہاں جاتے

بھٹکتے پھر رہے ہیں مرنے والے جو پے منزل
یقین کی راہ پر آجائیں، لے کر وہ گماں اپنا

ہر اک شکوہ بجا، لیکن ذرا اتنا تو سمجھا دو
نظر سے غیر کی کیوں دیکھتے ہو گلستاں اپنا

سہارا بنجو دی کا کیا، جنوں کا آسرا لیتا
ردا ہی کب ہے دخل یا سوا اصلِ محبت میں

میری ہی عمدہ آنکھیں، مجھ کو کرتیں مطمئن
ان کے لب پر میرے اشکوں کا جواب آیا تو کیا؟

داغِ ناکامی تو اب بھی ہے جبین سے منقل
لاکھ ان کے آستان سے کامیاب آیا تو کیا!

اد توجہ کرنے والے! شکم پہ جب مرثیہ چکا
اب لچیاں پر پیش خانہ خراب آیا تو کیا!

مذکورہ معاصرین

گلشن بدوش نظریں، لب پر حسیں ترانہ
ہر اک ادا ہے ان کی، الفت کا اک فسانہ
اب تک نگاہ میں ہو، پہلی نگاہ ان کی
منہستی رہی محبت، لٹکا رہا نہ مانہ
کیا ہونیاں کسی سے تفسیر حسن و الفت
شعلوں کی اک کہانی، شبنم کا اک فسانہ
عجب ہو فطرت انسانیت کہ انساں کو
یقین کی حد میں بھی لاکھوں گماں گزرتے ہیں
وفا کی راہ میں ایسی بھی ایک منزل ہے
جہاں سے رک کے ذرا دو جہاں گزرتے ہیں
جوان کی یاد سے خالی ہوں ان کے ذمے دہ
حیات پر وہی لمحے گراں گزرتے ہیں
دعا میں ستم دشمنوں کو دیتا ہوں
نظر سے جب کرم دوستاں گزرتے ہیں
خوش بیاں تلخی گفتار تک آ پہنچے ہیں
سینہ گل سے لب خاد تک آ پہنچے ہیں
کس لیے دانستہ ہم کھائیں فریب حسن و عشق!
کیوں غلط تائید رہے بطر شعلہ و شبنم کریں!
ظلمتیں گھٹنے کا آخر، اور کب تک انتظار
لاؤ، باقی رات کو بڑھ کر سحر میں ضم کریں
جو برا کہتے ہیں عالم کو، انھیں یہ چاہیے
پہلے اپنے آپ کو شائستہ عالم کریں

ڈرے ڈرے کا شعور و ذہن کو عرفان تھا
 بے خبر تھے خود، جو ہم کو بے خبر سمجھا کیے
 آج تک ہم نے فردغِ دل پہ نظریں نہ کیں
 ہر دم پہ منحصر اپنی سحر سمجھا کیے
 ہے اسی کا نام، دل کا سوز، معراجِ حیات
 آدمی کو جب خوشی میں غم نظر آنے لگے
 آزاد ہی بہا رتو اس وقت حبا نے
 صحنِ چمن میں خار بھی جب مسکرا سکے
 اس ہی کو مسکرانے کا حق ہے حقیقتاً
 آنکھوں میں جس کی اشک ہوں اور مسکرا سکے
 ہیں وجہِ انفعال، خود اپنی سیاہیاں
 یوں ورنہ شامِ غم پہ سحر مسکرا سکے!
 اگر غم کی ہوئی یوں کا روزِ مانی، تو کیا ہوگا؟
 رہی ہوتے ہوئے بھی ان کے تنہائی، تو کیا ہوگا؟
 جن سے گم ہو جائیں راہی، کچھ نشان ایسے بھی ہیں
 زندگی کے راستے میں، امتحاں ایسے بھی ہیں
 ظلم میں جن کے کرم ہے، لطف میں جن کے ستم
 مہرباں ایسے بھی ہیں، نامہرباں ایسے بھی ہیں
 تو نے حالات کو مجبور کیا ہو خود ہی کون کہتا ہو کہ مجبور تو حالات سے ہو!
 کچھ خودی سے اور نہ مطلب بخود ہی ہے براہِ راست نسبتِ زندگی سے
 ادھر تارے، ادھر کلیاں، ہیں مصروفِ گراں خوابی
 اگر ایسے میں پیغامِ سحر آیا، تو کیا ہوگا!

چلے تو ہیں تلاشِ آساں میں، اے شفا! ہم بھی
 مگر اپنا ہی پہلے سنگِ در آیا، تو کیا ہو گا !
 جب اٹھی ہے چمک کوئی دل میں دور تک روشنی ہو گئی ہے
 اے غمِ معتبر! ترے دم سے زندگی کام کی ہو گئی ہے
 عالمِ رنج و حراماں نہ پوچھو ہر خوشی خواب سی ہو گئی ہے
 لبوں پہ ان کے حیاتِ آفریں سہنی نہ رہی
 گلوں میں روح، ستاروں میں روشنی نہ رہی
 خدا شناسوں کی پہچان ہی کوئی نہ رہی
 کہ سرکشی بھی باندازِ سرکشی نہ رہی
 شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گزرے
 چراغِ جلتے رہے، اور روشنی نہ رہی
 بنائے ہم نے، شفا! دوستی کے وہ ڈھانچے
 کہ دشمنوں کو تمناے دشمنی نہ رہی

امین حزمین، خواجہ محمد مسیح پال

خواجہ محمد مسیح پال ۱۸۸۴ء میں سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ مشہور شاعر عبدالمسیح پال اثر صہبائی (ف ۱۹۶۳ء) ان کے برادرِ خرد تھے۔ ان کے والد خواجہ احمد دین پال عالمِ دینیات اور بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی تعلیم بھی عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ امین حزمین کو یہ فخر حاصل تھا کہ اقبال کی طرح انھوں نے بھی شمس العلماء سید میر حسن (ف ۱۹۲۹ء) سے عربی اور فارسی تعلیم پائی۔ اس کے بعد انگریزی کی طرف توجہ کی اور بالآخر بی اے کی سند مشن کالج سیالکوٹ سے حاصل کی۔ ملازمت کا بیشتر زمانہ گلگت کی پولیٹیکل ایجنسی میں گزرا اور یہیں سے نیشن پائی۔ ان کی خدمات کا اعتراف انگریزی حکومت نے خطابِ خان بہادر سے کیا۔ اگرچہ شعر و سخن کی طرف میلان سید میر حسن کے تلمذ کے زمانے ہی میں پیدا ہو گیا تھا، لیکن اس کا آغاز ۱۹۰۲ء میں ہوا جب ان کی پہلی غزل لکھنؤ کے مشہور گلدستے 'پیامِ یار' میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اگرچہ انھوں نے تمام

اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، لیکن زیادہ تر غزل اور نظم سے مزاولت رہی۔ ہماری کچھلی دوسلیں اقبال سے متاثر ہوئی ہیں، اور ان میں سے بیشتر لوگوں نے ان کے تتبع کی کوشش کی، لیکن کامیابی الا ماشاء اللہ معدودے چند کو نصیب ہوئی۔ ان چند خوش نصیبوں میں امین حویس، کا نام سرفہرست ہو، جیسا کہ ان کے مجموعہ کلام، گلبنگ حیات کے ہر صفحے سے عیاں ہے۔ اسرار حیات کی تفسیر بغیر اخلاقیات اور الہیات سے شغف، عظمتِ آدم اور عمل کی برتری ان کے بھی دل پسند موضوعِ سخن ہیں۔ ان کا ۱۲ اگست ۱۹۶۸ء کو سیال کوٹ میں انتقال ہوا اور وہیں مشہور قبرستان "امام صاحب" میں سپرد خاک ہوئے۔ اسی قبرستان میں علامہ اقبال مرحوم کے والد بزرگوار شیخ نور محمد اور برادر اکبر شیخ عطا محمد بھی آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

دردِ دل اصل میں تھا ولولہٗ جوشِ نمونہ جس سے یہ دائۂ ناچیز شجر ہو کے رہا
عشق میں جوشِ عبودیتِ دلِ دب نہ سکا کہیں آنسو، کہیں نالہ، کہیں پرہو کے رہا
میں نہ کہتا تھا کہ لے دیدہ تر، ضبط سے کام خونِ دل ہو کے رہا، خونِ جگر ہو کے با
لائے پڑے ہیں جان کے، جینے کا اہتمام کر

جن میں ہو کیفِ زندگی، بہرِ خدا وہ کام کر
مجھ کو تڑپی ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہو کائنات

بات یہ راز کی نہیں، اپنا خود احترام کر
پھونک دے نغمہٗ جالِ سوز سے سامانِ نفس

بلبلِ تفتہ جگر! شکوہٗ صیاد نہ کر
لطفِ جینے کا ہو جب ہی کہ دلِ مستِ خودی

آسمانِ تک سے یہ کہہ دے، مری امداد نہ کر

یاس میں پھوڑ کے سرمے ہیں کم طرف، این!

طرف عالی ہے ترا، بیعت فرما دے کر
تفکرات کی دنیا میں جستجوئے سکوں
علاج جس کا نہیں کوئی، ہی ہی وہ جنوں
اسی کے خون سے رنگیں ہو داستانِ حیات
محال ہو کہ جیوں اور بیقرار نہ ہوں
افسانہ حیات کو دہرا رہا ہوں میں
رستے کے اونچ نیچ سے واقف تو ہوں میں
یوں اپنی عمر رفتہ کو لوٹا رہا ہوں میں
ٹھوکر قدم قدم پہ مگر کھار رہا ہوں میں
نہ دے اس آگ کو نارِ خلیل سے نسبت

کہ جس کے سوز میں گلزارِ جادو اے نہیں
شکستِ محبتِ عالی ہو، بیخودی کی تلاش

کہ کارخانہ ہے دنیا، شرابِ خانہ نہیں
بلبلِ سوختہ سماں سے سنا ہو میں نے

عشق اک آتشِ بے شعلہ ہے، گلزارِ حسن
صاف آتا ہے نظر، دیدہ بنیا کو یہی

عشقِ اقرارِ حقیقت ہے، اور اظہارِ حسن
عشقِ بچا رہا ہی آگاہ نہیں ہے، در نہ

روزِ میثاق سے خود اس کا طلبگار ہو حسن
اس حقیقت کو خدا را نظر انداز نہ کر
اگر شمعِ حقیقت کی ضیا باری نہیں ہر سو
مرد ہو جاتا ہو وہ شعلہ، جو بیباک نہ ہو

تخیل کو کہاں سے آگئے آدابِ پروانہ؟
وہ اس بزمِ ہستی سے سرور اندوز ہوتے ہیں
نگاہیں جن کی ہوں بیباک اور اطوارِ مردانہ

اک برق ہی ہجوم تقاضا لیے ہوئے جانے، میں آگیا ہوں یہاں، کیا یہ ہوئے
 اک تو کہ بے حجاب نہ ہونا تری ادا اک میں کہ شوق دید کی دنیا لیے ہوئے
 اک تو کہ اپنے حسن کی ہو آپ ہی دلیل اک میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لیے ہوئے
 یہ نہ ہوتا تو مر گئے ہوتے اس دل بڑ دبار کے صدقے
 وہ کریں مجھ سے احتساب وفا ایسے روز شمار کے صدقے
 غرق حیرت ہو چشمِ بختِ سحر آنکھ کی اشک باریاں تو بہا
 خاک سے رنگ کو کا یہ طوفان وقت کی دسکھ باریاں تو بہا

دریا کے موج میں دریا کی خودی پنہاں
 گوہر کے تجمل میں قطرے کی خودی پنہاں
 ہر چند خودی سے ہو، ارضی کہ سماوی ہو

مہر دمہ و انجم میں ان کی ہے خودی پنہاں
 نگاہِ شوق کے اعجاز کا نہ ہو منکر خیمِ شعور کا جامِ جہاں نما ہے یہی
 تڑپ سے اس کی نہ ہو بیقرار اے نادا جہاں میں شور ہو جس کا وہ ارتقا ہے یہی
 خیالِ محض کجا، اور کجا عملِ نادر! سراب ہو نہیں سکتا، علاجِ تشنہ بسی
 وہ ایک صیدِ زبوں ہو فلک کی نظر میں عزیز جس کو نہیں، شیوہ جفا طلبی
 ہر کام کو احساس سے نسبت ہے اضافی

اور شدتِ احساس ہی کا نام ہے مشکل
 جس شخص کا احساس نہیں عزم کے بس میں

ناکس ہے وہ، اُس کے لیے ہر کام ہے مشکل
 پر تو ہر لا مکاں ہے حسن ایک تنویرِ جاوداں ہو حسن
 ہستی کا ثنات ہو اس سے رونقِ بزمِ انس و جاں ہو حسن

ہو اگر جستجو، تو عام ہے حسن سائے دل کے صبح و شام ہو حسن
 بوالہوس کی، ایسے! بلا جانے اک حقیقت ہے جس کا نام ہو حسن

لا الہ الا اللہ

حرم نازِ خداوندِ ناز کی سو گند نگاہِ پاکِ دلِ پاکِ باز کی سو گند
 قسم ہے حسن کے اندازِ بے نیازی کی جبینِ عشقِ سراپا نیاز کی سو گند
 قسم ہے غر، نوی بت شکن کے بازو کی کعبہ زلفِ ورازا نیاز کی سو گند
 قسم ہے ہر دمہ و انجم درخشاں کی کرشمہ فلکِ شیشہ باز کی سو گند
 قسم ہے عکسِ رُخِ مہر و ماہِ طلعت کی کمالِ صنعتِ آئینہ ساز کی سو گند
 قسم ہو مطربِ ہستی کے ذوقِ نغمہ کی اور اس کے در و بھرے تارِ سا کی سو گند

ملی ہو جس کو مے لا الہ الا اللہ
 وہ رنبدِ میکدہ مفضوب ہو نہیں سکتا

نجیب اشرف ندوی (سید)

ان کا وطن دیسہ تھا، جو بہار شریف (بہار) سے سات میل مشرق کی طرف ایک بستی ہے۔ سید نجیب اشرف اور سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) یکجہری تھے۔ دونوں کے پردادا میر غطمت علی تھے۔ میر غطمت علی نے اپنی زندگی میں دو کاج کیے۔ بڑی ہجرت سے حکیم میر محمدی ہوئے؛ اور چھوٹی سے ہاشم شیر حکیم محمدی کے بیٹے حکیم ابوالحسن تھے، جو والد تھے سید سلیمان ندوی مرحوم کے؛ اور ہاشم شیر کے بیٹے ڈاکٹر محمد مبین تھے۔ یہی نجیب اشرف ندوی کے والد مرحوم تھے۔

ڈاکٹر محمد مبین سرکاری ملازمت میں تھے اور اسی سلسلے میں ان کا بیشتر زمانہ سی پی (مدھیہ پردیش) میں گزرا۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر پنشن پائی اور اس کے بعد ۱۹ پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ان کا ۲۸ جولائی ۱۹۳۲ء کو انتقال ہوا۔

سید نجیب اشرف ۶ جون ۱۹۰۱ء کو آموری (ضلع چاندہ۔ مدھیہ پردیش)

میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر والد سے پائی۔ اس کے بعد سرکاری اسکول میں بھیجے گئے۔ ایک تقریب میں شمولیت کے لیے ڈاکٹر محمد مبین خاندان سمیت اپنے والدین گئے تھے کہ وہاں سید سلیمان ندوی سے ملاقات ہوئی، جو اس زمانے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے کہا کہ آپ نجیب اشرف کو تعلیم کے لیے دارالعلوم بھیج دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ قبول کر لیا۔ چنانچہ نجیب اشرف ۱۱۰۶ء میں جب کہ ان کی عمر بمثل آٹھ برس کی تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دارالعلوم ندوۃ انتشار کا شکار ہو رہا تھا، جس کے نتیجے میں بالآخر مولانا شبلی ۱۹۱۳ء میں یہاں کی سکٹری سے دستبردار ہوئے تھے۔ سید سلیمان بھی اس سے قبل ہی مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورہ مفتہ دار اخبار اہلال کے ادارہ تحریر میں شمولیت کی غرض سے کلکتے جا چکے تھے۔ ایسے میں نجیب اشرف بھی ندوہ چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہیں پٹنہ میں انھوں نے دسویں درجے اور انٹر امتحان پاس کیے (۱۹۱۹ء) وہ بی اے کے درجوں میں زیر تعلیم تھے، جب ملک میں ترک موالات کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہ بھی کالج چھوڑ، قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس میں انھیں متعدد سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نے رحلت کی۔ اس کے بعد سید سلیمان ندوی مرحوم نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے سید نجیب اشرف کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ یہاں رہنے سے انھیں تصنیف و تالیف سے رغبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسی زمانے میں انھوں نے ہاتما گاندھی کی بعض انگریزی

کتابوں کا ترجمہ کیا (سوراج اور رہنمائے صحت) اور ترک موالات دوسرے ممالک میں، جب سیاسی تحریک میں تعطل پیدا ہو گیا، تو انھوں نے دوبارہ اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ ان کے چھوٹے بھائی سید علی اشرف اس زمانے میں کلکتہ میں تھے۔ ان کی تحریک پر یہ وہاں چلے گئے۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۲ء میں بی اے کی اور ۱۹۲۶ء میں ایم اے کی سند حاصل کی؛ دونوں امتحانوں میں درجہ اول پایا۔

تعلیم ختم کر لینے کے بعد وہ مستقلاً دارالمصنفین کے رفیق بن گئے؛ یہاں انھیں سو روپے ماہانہ کی قلیل رقم بطور وظیفہ ملتی تھی۔ اسی زمانے میں دارالمصنفین نے رقعات عالمگیر کی ترتیب و تدوین ان کے سپرد کی تھی۔ یہ کام انھوں نے مؤرخ شہیر سرحد و ناتھ سرکار کی نگرانی اور رہنمائی میں کیا تھا۔ اس سلسلے میں مقدمہ رقعات عالمگیر اور رقعات عالمگیر (جلد اول) شائع ہوئی تھی۔ افسوس کہ یہ مفید کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچا۔ میں نے دوسری جلد کے مسودات مرحوم کے پاس دیکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں جوں کا توں شائع کر دینا چاہیے، ورنہ یہ بھی ضائع ہو جائیگی۔ زمانہ قیامِ عظیم ٹھہر میں وہ معارف کی ترتیب میں بھی سید سلیمان مرحوم کا ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔

۱۹۳۰ء میں وہ گجرات کالج، احمد آباد میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ اگلے ہی برس ۱۹۳۱ء میں حکومتِ بمبئی نے اسماعیل یوسف کالج قائم کیا۔ اس پر سید نجیب الرحمن گجرات کالج کی ملازمت ترک کر کے بمبئی آ گئے اور اس نئے کالج میں اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اسی ادارے میں رہے اور یہیں سے ۱۹۵۵ء میں پنشن پر سکد و شس ہوئے۔

انھوں نے بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ مضافات کے علاقہ اندھیر

میں اپنا مکان تعمیر کر لیا تھا۔ وہ بکٹی کی تعلیمی، ثقافتی، سماجی زندگی کا جزو لاینفک تھے اور سب حلقوں میں اندوی صاحب کے علم سے معروف تھے۔ جب وہ ۱۹۵۵ء میں سرکاری ملازمت سے الگ ہوئے تو انجمن اسلام نے انہیں اپنے نئے ادارے اور دیرسیرچ انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا۔ یہاں وہ اپنی وفات تک رہے۔ ادارے کا تمام ہی رسالہ نواسے اب بھی انہیں کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔

ان کی آخری شائع شدہ کتاب لغات گجری، بھٹی، انہوں نے تصنیفی کام زیادہ نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ بھٹی۔ وہ حکومت کی اور مختلف تعلیمی اداروں کی اتنی کمیٹیوں اور بورڈوں کے رکن اور مشیر تھے کہ لکھنے پڑھنے کے لیے ان کے پاس کوئی وقت بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح ان کی علمی صلاحیتیں گویا پوری طرح بروئے کار نہ آ سکیں۔ اس سے ہمارے بعض دوسرے اہل علم کو سبق لینا چاہیے، جو اپنا وقت غیر علمی کاموں میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔

جمعرات ۵ ستمبر ۱۹۶۶ء کو دہرے کے وقت سبھی اسپتال میں حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن شب میں تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور ارا لا قبرستان میں اپنی مرحومہ بیگم کے برابر دفن کیے گئے۔

میرے ان سے بیس برس کے تعلقات تھے۔ ان کے سے بلند اخلاق، وضعدار، بامروت، سیرچشم دوست اب کہاں ملیں گے! اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ

محمد مقتدی خان شروانی

پڑھے لکھے حضرات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کی اردو مطبوعات پر ایک زمانے سے یہ چھپا ہوا پڑھتے آئے ہوئے : بابہ تمام محمد مقتدی خان شروانی - افسوس ان مولوی حاجی محمد مقتدی خان شروانی کا ۶ دسمبر ۱۹۶۷ء کو علی گڑھ میں انتقال ہو گیا انھوں نے اس مطبع کے اور بعد کو اپنے ذاتی مطبع شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ کے ذریعے سے اردو کی طویل خدمت کی۔ وہ خود بھی مصنف اور مؤلف تھے۔ اگرچہ انھیں اس سے کوئی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ ہم ان کے حالات قلمبند کر کے جہاں ایک طرف ان کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں، وہیں

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

کے مصداق سمجھتے ہیں کہ ان کی خوبیاں اس قابل ہیں کہ ہمارے نوجوان ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

سندھان کے مشہور شروانی ٹیھان خاندان کی ایک شاخ بلوچ (ضلع علی گڑھ) میں مقیم ہے۔ ان کے مودث علی یوسف خان ساکن راجموتھے۔ اس خاندان کے اکثر

افراد بلو نہ سے نقل مکان کر کے دوسری جگہوں میں جا کر بس گئے۔ یوسف خان کی ساتویں پشت میں رشید خان (بن دلیل خان) تھے، یہ بلو نہ ہی میں رہے۔ خدانے ان کی اولاد میں بہت برکت دی۔ درحقیقت آج بلو نہ کا خاندان شروانی انھیں کے اخلاف پر مشتمل ہے۔

انھیں رشید خان کی چوتھی پشت میں محمد مستجاب اللہ خان تھے۔ انھیں باپے جو کچھ ترکے میں ملا، انھوں نے اس پر اپنی سلیقہ مندی سے اضافہ کیا، اور نیل سازی کی کوٹھی بھی قائم کی۔ ان نواح میں ان کے معاملات دو دوست کی شہرت تھی۔ اردو میں شعر بھی کہتے اور اپنے نام کی مناسبت سے مقبول تخلص کرتے تھے۔ داغ سے اصلاح لیتے تھے۔ پیام پار کی پرانی جلدوں میں ان کا کلام ملتا ہے۔ کچھ نثری مضمون بھی ریاض الاخبار میں شائع ہوئے تھے۔ ملکی سیا سے بھی دلچسپی تھی، کانگریس کے رکن تھے۔ ان کی دو بیٹی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آج سے ستر برس پہلے ۱۸۹۵ء میں انھوں نے ایک ہندو پنڈت کو ملازم رکھ کر اپنی چھوٹی بیٹی (امتہ العنی) کو ہندی پڑھائی۔ ۱۹۱۷ء میں رحلت کی۔

انھیں محمد مستجاب اللہ خان کے اکلوتے بیٹے محمد مقتدی خان شروانی مرحوم تھے۔
محمد مقتدی خان شروانی ربیع الاول ۱۲۹۷ھ (فروری/مارچ ۱۸۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔
محمد مقتدی خان ان کا تاریخی نام ہے جس سے (۱۲۹۷) برآمد ہوتے ہیں، فارسی عربی کی تعلیم نجی طور پر ہوئی۔ باقاعدہ انگریزی تعلیم ڈھولہ (ضلع علی گڑھ) کے اسکول سے شروع ہو کر ۱۸۹۹ء میں ایم اے اور اسکول، علی گڑھ تک پائی یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ پنڈت اندر من مراد آبادی علی گڑھ اسکول میں ان کے ہم جماعت تھے۔ وہ ان سے عربی اور اردو میں سنسکرت پڑھتے تھے۔ میرے خیال میں نہ انھیں عربی آئی، نہ انھیں سنسکرت۔
شروانی صاحب کو نہ خاندانی جادو کی دیکھ بھال سے کوئی دلچسپی تھی، نہ زمینداری اور کاشتکاری سے، بڑے شروع سے اخبار بینی کے رسیا تھے، اسی سے مضمون نویسی کا چمکا پڑا۔ یہی شوق انھیں لاہور لے گیا اور وہ ۱۹۰۲ء میں جب ان کی عمر بمشکل ۲۲-۲۳ برس کی تھی، منشی محبوب عالم کے

روزانہ پیسہ اخبار کے ادارہ تحریر سے منسلک ہو گئے۔ اس اخبار کے علاوہ لاہور کے کئی دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی ان کے مضمون چھپتے رہے۔ اس سے نہ صرف لکھنے کی مشق حاصل ہوئی، بلکہ انھیں اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوا، اور بہت جلد ان کی صلاحیتوں کا رجحان اور مستقبل کا پروگرام بھی طے ہو گیا۔

۱۹۰۹ء کے آخری مہینوں میں وہ لاہور سے علی گڑھ واپس آ گئے۔ یہ دتار الملک (ف جنوری ۱۹۱۰ء) کی سکریٹری کا زمانہ تھا۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی (ف جولائی ۱۹۱۲ء) نے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ سے چھٹی لے لی تھی۔ اس پر محمد مقتدی خان قائم مقام ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۱۱ء میں وہ مشہور خبر رساں انجینی ایسوسی ایٹڈ پریس کی ملازمت اختیار کر کے اس کے مقامی نامہ نگار بن گئے۔ اس عہدے پر وہ چودہ برس کی طویل مدت (یعنی ۱۹۲۵ء تک) رہے۔

۱۹۳۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اب اس کا پریس (جہاں گزٹ چھپتا تھا) مسلم یونیورسٹی پریس کہلایا محمد مقتدی خان شروانی اس کے ہتم مقرر ہوئے۔ اب تک اس میں صرف نوے کے چھاپے کا انتظام تھا؛ شروانی صاحب نے اس میں تچھر کے چھاپے کا اضافہ کیا۔

۱۹۱۴ء میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (ف جون ۱۹۲۶ء) نے کلیات امیر خسرو کی ترتیب تدوین اور اشاعت کی داغ بیل ڈالی تھی؛ اس سلسلے کی سرپرستی حضور نظام دکن میر عثمان علی خاں (ف فروری ۱۹۲۷ء) نے قبول فرمائی تھی۔ اس مجموعے کی مختلف کتابیں ترتیب تدوین کے لیے متعدد اصحابِ علم میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ خمسہ خسرو کی پہلی مشنری مطبعہ الانڈیا کی تصحیح محمد مقتدی خان شروانی ہی نے کی تھی۔ افسوس کہ یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچا اور صرف آٹھ جلدیں چھپ سکیں۔ اگر یہ منصوبہ پورا ہو جاتا، تو علم و ادب کی بہترین خدمت ہوتی و ما تو فیقنا انا بالمدد العظیم

یہاں غالباً ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔
یہ کتابیں بہت اہتمام سے شائع ہوئی تھیں۔ بہترین کتابت، اچلنا قیمتی کاغذ اور چھپائی
مسلم یونیورسٹی پریس کی جس کے کرتا دھرتا شروانی صاحب خود تھے۔ سارا کام خود ان کی
نگہ رانی میں ہوا تھا۔ اور نتیجہ اتنا شاندار ہوا کہ جس نے بھی یہ مجموعہ دیکھا، آتش آتش کر
اٹھا۔ نواب عماد الملک مرحوم قدردانِ علم و فن تھے۔ یہ منصوبہ بنا ہی ان کی تجویز پر تھا
اور انہی کی سفارش پر نظام دکن نے اس کی سرپرستی منظور فرمائی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں کتابیں
چھپ کر آئیں تو انہوں نے حضور نظام کی طرف سے شروانی صاحب کو نظام، عماد و خسر
تمغہ دلایا۔

طاعت میں ہمارے کے باعث انہیں تین اور تمغے بھی ملے تھے: اول: سلیمان اشرف،
المبین تمغہ (۱۹۲۹ء) پر دنیس مولانا سلیمان اشرف نے اپنی کتاب المبین کی بحسن و خوبی طباعت
پہم دیا۔ دوم: سردار جنگ کا نامہ تمغہ (۱۹۳۳ء)، نواب سردار الملک بہادر استاد نواب
محبوب علی خان نظام دکن نے اپنی سوانح عمری کا نامہ سرداری لکھی تھی۔ یہ کتاب شروانی
صاحب کی نگہ رانی میں بڑی آب و تاب سے چھپی۔ اس پر مصنف کے صاحبزادے نواب
ذوالقدر جنگ نے یہ تمغہ دیا۔ سوم: مرزا، سلیمان، بشری تمغہ (۱۹۳۸ء) مولانا غلام
چریاکوٹی (ف جنوری ۱۹۰۳ء) اپنے عہد کے یگانہ عالم تھے۔ سر سید بھی ان سے گہرے تعلقات
تھے۔ انہوں نے ۴۰ سال کی تحقیق اور تجسس کے بعد ایک کتاب بشری تصنیف کی جس میں
تورات اور عہد نامہ قدیم سے صداقت رسول صلعم و اسلام ثابت کی گئی تھی۔ سر شاہ
محمد سلیمان کی جوان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ دلی خواہش تھی
کہ کتاب چھپ جائے۔ چونکہ اس میں عبرانی کے بہت سے اقتباسات تھے، اس لیے کتاب کا
سندستان میں چھپنا بہت دشوار تھا، لیکن شروانی صاحب نے یہ ہم سر کر لی اور کتاب طبع
کر دی۔ اسی پر نواب مرزا اللہ خان نے یہ تمغہ دیا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ ایم اے او کالج کی پچاس سالہ جولبی ہوئی۔ اس موقع پر اردو کانفرنس اور مسلم پرسنل لاء کمیشن بھی منعقد کی گئی تھیں۔ اپنی کے صدر نواب صدیق یار جنگ۔ مرحوم (۱۹ اگست ۱۹۵۰) مولوی بشیر الدین مدیر البشیر آبادہ (۲۱ جون ۱۹۵۶ء) ان دونوں کانفرنسوں کی استقبالیہ مجلسوں کے صدر محمد مقتدر خان شروانی تھے۔

۱۹۳۶ء میں کسی وجہ سے یونیورسٹی نے اپنا پرسنل فروخت کر دیا۔ شروانی صاحب کو اس کام کا جو تجربہ تھا اب اس سے مستفید ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ کوئی اور مطبع قائم کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے شروانی پرنٹنگ پرس کے نام سے اپنا ذاتی مطبع جاری کر دیا جو بدستوران کی نگرانی میں اعلیٰ معیار کی کتابیں چھاپتا رہا۔

مرحوم کو اردو مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کا ہوا تھا۔ سچیدرود نویس تھے اور نظم و نثر دونوں پر یکساں قادر تھے شعر بھی کہتے اور اپنے نام (مقتدر) کی رعایت سے کبھی بجا اور سہرا تخلص کرتے تھے۔ مزاج کے تلون کے باعث کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کب مدح سے قدر پر اتار آئیں۔ اس لیے یہ واقع ہے کہ سب ان سے خائف رہتے تھے۔

میری ان سے ملاقات نواب صدیق یار جنگ مرحوم کی وساطت سے ہوئی۔ وہ مجھ سے بہت لطف سے پیش آتے تھے۔ علی گڑھ جانا ہوتا تو حتی الامکان سلام کو ضرور حاضر ہوتا ایک دن باتوں باتوں میں نہ معلوم کیسے مشہور صوفی شاعر صاحب لمعات و عشاق نامہ حضرت مخدوم الدین عراقی سہرانی (د ۱۴۸۹ء) کا ذکر چل پڑا۔ ان کی ایک غزل بہت مشہور ہے جس کا مطلع ہے:

نخستین بادہ کا ندر حبا م کردند
در حشیم مست ساقی دام کردند

میں نے کسی مناسبت سے یہ شعر پڑھا تو غالباً قافیے کی وجہ سے ان کا ذہن میرے نام کی طرف منتقل ہو گیا، اس پر فوراً شعر کہا:

ہے وحدت کہ اندر حجام کمر دند
ز مالک رام، گویم، دام کمر دند

چھوٹی موٹی کوئی درجن بھر کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ مضامین کی کھلی خاصی تعداد مختلف رسالوں میں نشر پڑی ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی کی قرنگ آصفیہ کے دوسرے ایڈیشن کی ترتیب و تدوین میں بھی وہ مصنف کے دستِ راست تھے جس کا اعتراف مولوی سید احمد نے کیا ہے۔

شب جمعہ ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو بعمر ۸۸ سال (قمری ۱۰۱ سال) علی گڑھ میں انتقال کیا، اور وہیں قبرستانِ شاہ جمال میں سپرد خاک ہوئے۔

حکیم احمد شجاع

لاہور کے مشہور حکیموں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ لاہور کا بازار حکیموں
 اسی خاندان سے منسوب ہے۔ احمد شجاع ۱۸۹۸ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔
 یہیں تعلیم پائی اور پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اپنی ملازمت کے
 بیشتر زمانے میں پنجاب قانون ساد اسمبلی کے سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ نظم
 و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ لاہور کے ماہانہ رسالے "ہزار داستان"
 کے ایڈیٹر رہے، افسانے لکھے، فلم تک سے تعلق رہا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ سادہ
 تخلص تھا۔

کسی زمانے میں قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ خدا معلوم، یہ مکمل ہوئی یا نہیں!
 اس سے متعلق ایک لطیفہ ہے!

کسی نے علامہ اقبال مرحوم کو بتایا کہ حکیم احمد شجاع تفسیر قرآن لکھ رہے ہیں، تو فرمایا کہ
 ہم آج تک حضرت حسین کو سب سے بڑا مظلوم مانتے آئے ہیں، لیکن اب یہ راس
 تبدیل کرنا پڑے گی، آج قرآن سب سے زیادہ مظلوم ہو کہ ہر کہ وہ اس کی تفسیر لکھنے

تذکرہ معاصرین

لگا ہے ۔

۴ جنوری ۱۹۶۹ء کو اپنے ذاتی مکان (فیروز پور روڈ، لاہور) میں انتقال
کیا، اور وہیں پُجڑ جی کے قریب اپنی خاندانی ہڑواڑ میں دفن ہوئے ۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

یوپی کے ضلع فرخ آباد میں پٹھانوں کی ایک بستی قائم کج ہے، اور اس کے مضافات میں ایک مختصر گاؤں پتورہ نام کا ہے۔ اب تو ان لوگوں میں ماشاء اللہ کبھی کبھار کوئی پڑھا لکھا آدمی نظر آ جاتا ہے، لیکن یہ ذکر پچھلی صدی کے آخری رُبع کا ہے۔ اس زمانے میں یہاں کے باشندوں کا دل پسند مشغلہ باہمی مار پیٹا اور مقدمہ بازی تھا۔ یہاں کا ہر ایک سپوت دعویٰ دار تھا کہ،
سولپست سے ہے پیشہ آبا پہ گری

اس لیے پڑھنا لکھنا ان حضرات کے نزدیک کوئی ذریعہ عزت نہیں تھا جس کے لیے جان جو کھم میں ڈالی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہاں کے ایک نوجوان فدائ حسین خان صاحب نے نیزے کی جگہ قلم ہاتھ میں لیا اور مقامی انجیلو ورنیکلر ہڈال سکول میں داخلہ لے کر اردو فارسی پڑھنے لگے، تو ان کے ہم وطنوں نے انھیں بدعتی اور آبائی روایات سے باغی قرار دیا۔

فدائ حسین خان صاحب حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں تجارت

کرینگے، لیکن حیدرآباد پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا، اور اس کی جگہ وکالت کی تعلیم حاصل کرنے لگے، اور پھر اسے بطور پیشہ اختیار کر لیا لیکن اس سے بھی بڑا اور اہمتر کام حیدرآباد لارپورٹر

Hyderabad

Law Reporter کی تدوین و ترتیب اور اشاعت کا تھا۔ اس کی مانگ موجود تھی، چنانچہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس میں انھیں بہت کامیابی ہوئی۔ فروری ۱۸۹۶ء میں خدا نے فداحسین خان صاحب کو تسیر اٹیا دیا، تو انھوں نے اس کا ذکر حسین خاں نام رکھا۔ یہی ہمارے ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں، جنھیں ان کے بے تکلف دوست اور چاہنے والے محبت سے "ذاکر صاحب" کہتے تھے۔ ذاکر صاحب کا بچپن حیدرآباد میں گزرا، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابھی کم عمری کا زمانہ تھا کہ حضرت پیر حسن شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان پر صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ چونکہ اس کا بالواسطہ طور پر ذکر صاحب کی تعلیم و تربیت اور عام زندگی پر بھی اثر پڑا، اس لیے اس کا بیان سودمند ہو گا۔

پیر حسن شاہ صاحب کے مرشد، حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادی تھے۔ پیر حسن شاہ کو اوائل عمر میں مندوؤں سے سخت کد تھی۔ یہی نہیں کہ وہ انھیں اچھا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کے برخلاف بر ملا برا بھلا تک سب کچھ کہہ جانے میں بھی انھیں دریغ نہیں تھا۔ حضرت شاہ طالب حسین کو بھی اس کا علم ہوا۔ چونکہ ان کا یہ رویہ تصوف کی صلح کلی اور رواداری کی تعلیم کے خلاف تھا، انھوں نے مرید کی اصلاح

۷۰ ایک مرتبہ میں نے مرحوم سے دریافت کیا کہ صحیح تاریخ ولادت کیا ہو، تو فرمایا کہ سال یقیناً ۱۸۹۶ء ہے، مینا غالباً فروری کا ہی تاریخ اور دن کا تعین اب ممکن نہیں، کیوں کہ سب خاندانی کاغذات اور یادداشتیں ضائع ہو گئیں۔

کا ایک انوکھا علاج تجویز کیا۔ فرمایا کہ سر پر ہندوؤں کی سی چوٹی رکھو اور پیشانی پر نقشہ لگاؤ اور اسی سج دھج سے پاسبانہ پشاد تک جاؤ۔ دوران سفر میں اگر کوئی ہندوؤں کا تیرتھ استھان آئے تو اس کی بھی زیارت کر لو۔ جاؤ اور پھر اسی طرح سے واپس آؤ۔ اس سے مقصود یہ تعلیم دینا تھی کہ کسی نے چوٹی رکھ لی، تو کیا! اور کسی نے ڈاڑھی بڑھائی، تو کیا! ان ظواہر سے کسی کے ایمان اور اخلاق اور ارتقاء سے متعلق حکم نہیں لگایا جاسکتا؛ اصلی چیز باطن کی صفائی اور پاکیزگی ہے۔

حکیم مطلق نے جو بیحد و نیالادض کا حکم دیا ہے، اس سے دوسرے فوائد کے علاوہ یہ تعلیم بھی منظور تھی کہ اس طرح انسان کو زندگی کا بے تجربے حاصل ہونگے اور اس کا دل اور نظر وسیع ہو جائینگے۔ ہمارے حکیم شاعر نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

حد سے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو

کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظار سے دہو

بارے اس سفر کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور جناب حسن شاہ قبلہ نے باقی عمر انسان دوستی اور محبت کی تعلیم عام کرنے میں بسر کر دی، جو ہر مذہب اور ضابطہ اخلاق کی علت غائی ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اگر صاحب کے دادا غلام حسین خان صاحب عرف جھمن خان مرحوم سے متعلق بھی بیان ہوا ہے۔ انھیں فقراء اور اہل اللہ سے بہت عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنے رہنے کے لیے پختہ حویلی تعمیر کرنا شروع کی۔ ایک دن نہیں معلوم، کس بات پر، وہ کام کرنے والے مزدوروں سے بہت سختی سے پیش آئے اور انھیں گالیاں دیں جب ان کے مرشد تک یہ بات پہنچی، تو انھوں نے فرمایا

جہن خان! اگر تم چاہتے ہو کہ مہاری اولاد اس حویلی میں خیر و عافیت سے بسر کرے اور پھلے پھولے، تو اس بد زبانی کا کفارہ ادا کرو، اور وہ اس طرح سے کہ متھرا جا کر وہاں چندے فلاں منہ و سادھو کی صحبت میں رہو اور ان سے پریم کرنے اور کرو دھ پر قابو پانے کا گیان حاصل کرو۔ جب یہ سیکھ جاؤ، تو واپس آکر باقی عمارت مکمل کر لینا۔ ارادتمند جہن خان نے تعمیل ارشاد میں متھرا کی راہ لی اور کچھ مدت اس پریم نگری میں اس سادھو کی خدمت میں رہے اور پھر واپس آکر ادھورا مکان پورا کیا۔

یہی رواداری کی تعلیم نوجوان ذاکر حسین خان کے درشے اور حصے میں آئی۔ پیر شاہ صاحب کو کتابیں جمع کرنے اور مطالعے کا بھی بہت شوق تھا، وہ جہانیاں جہاں گرو تو تھے ہی، جہاں جاتے، وہاں سے کتابیں بٹور بٹور کر ساتھ لاتے۔ ان میں سے لامحالہ بعض انھیں مستعار لینا پڑتیں، جو وہ اس وعدے پر لاتے کہ انھیں لواپس کر دینگے۔ چنانچہ جب وہ لدے پھندے حیدر آباد پہنچتے، تو ذاکر صاحب کو حکم ہوتا کہ ان کو نقل کر لو۔ یہ سلسلہ ان کے حیدر آباد کے قیام اور پھر اٹا وہ اسکول تک جاری رہا۔ ذاکر صاحب بہت خوشخط تھے۔ یہ اسی ابتدائی زمانے میں ان کتابوں کے نقل کرنے کی مشق کا نتیجہ تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۰۷ء میں اٹا وہ کے اسلامیہ ہائی اسکول بھیج دیے گئے یہاں انھوں نے دسویں درجے تک پڑھا، اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ ایف ایس سی کا امتحان انھوں نے یہیں ایم اے او کالج سے دیا۔ وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اسے بطور پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اب بی ایس، سی کے لیے انھوں نے کر سچین کالج، لکھنؤ کا انتخاب کیا۔ لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ یہاں وہ سخت بیمار پڑ گئے اور انھیں

کالج چھوڑنا پڑا۔ تندرستی بحال ہو جانے پر دوبارہ علی گڑھ کالج میں آ گئے، جہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی اے کی سند لی۔ ۱۹۲۰ء میں ایم اے کے آخری سال میں تھے، جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی۔ ہمارے صفِ اول کے سیاسی رہنماؤں (مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ) نے علی گڑھ کا رخ کیا اور طلبہ کو ترغیب دی کہ وہ کالج سے ترک موالات کریں۔ بڑی رد و کد کے بعد طلبہ کی ایک معقول تعداد نے ان اکابر کے حکم پر لبیک کہی اور کالج سے نکل آئے۔

ان فوجوانوں کے سرخیل ڈاکٹر صاحب تھے۔ علی گڑھ کالج کے کرتادھرتا اس زمانے میں ڈاکٹر (سر) ضیاء الدین مرحوم تھے، جن سے بڑا انگریزوں کا اور انگریزیت کا مذاح اس انجوبہ زارِ منہستان میں کبھی شاید ہی کوئی اور ہوا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی انہی صفاتِ عالیہ کے باعث ان کے سفر کی مخالف سمت کو اپنی منزل مقصود قرار دے لیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب یہ اکابر قوم علی گڑھ میں جمع ہوئے اور انھوں نے ہم سے کالج چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا تو میں عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسی حیرت میں تھا کہ ایک دن ڈاکٹر صاحب موصوفی بلا بھیجا۔ حاضر ہوا۔ بہت محبت سے پیش آئے۔ ارشاد فرمایا: دیکھو، نا تجربہ کاری میں کوئی غلط اقدام نہ کر بیٹھنا۔ یہاں کالج میں رہو گے، تو خدا چاہے، سال بھر کے اندر ہی ڈپٹی کلکٹری مل جائیگی۔ اس کے بعد زندگی بھر مزے اڑاؤ گے۔

فرمایا: ڈاکٹر صاحب کی اس بزرگوار نصیحت نے مجھے اتنے دن کی الجھن سے نجات دلا دی۔ میں جو فیصلہ کرنے میں اتنی دشواری محسوس کر رہا تھا، وہ اب خود بخود رفع ہو گئی۔ ان کے وہاں سے واپس آکر میں نے کالج چھوڑ دیا۔

یہ تھی بنیاد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء جمعہ کا دن ہمارے ملک کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس دن علی گڑھ کے چند نوجوان طالب علموں نے یہ فیصلہ کیا کہ آج سے ہم حکومت کے دست نگر نہیں ہونگے، آج سے ذریعہ تعلیم کوئی بدسی زبان نہیں، بلکہ ہماری مادری زبان ہوگی؛ آج سے تعلیم کا مقصد میکالے کے الفاظ میں حکومت کے کارندے نہیں، بلکہ، ملک و ملت کے مخلص خادم، پیدا کرنا ہوگا۔

ذاکر صاحب دو برس تک جامعہ ملیہ میں معاشیات پڑھاتے رہے، لیکن علی گڑھ چھوڑنے سے ان کی اپنی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ اس کی تکمیل کے لیے وہ بالآخر ۱۹۲۲ء میں جرمنی چلے گئے جہاں سے تین برس بعد ۱۹۲۶ء میں وہ برلن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ (معاشیات) کی سند لے کر واپس آئے۔

ہم میں سے بہت لوگوں نے اردو دیوان غالب کا برلن اڈیشن دیکھا ہوگا، لیکن اس کے چھپنے کی داستان شاید سب کو معلوم نہ ہو۔

جس زمانے میں ذاکر صاحب برلن میں تھے، انہی دنوں پروفیسر محمد مجیب بھی وہیں تھے۔ یہ وہاں خاص طور پر چھاپے خانے سے متعلقہ امور کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے تھے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین بھی یہیں تعلیم پا رہے تھے۔ یہ دونوں حضرات تو خیر کچھ پڑھنے لکھنے کو گئے تھے اور اس میں لگے رہتے، لیکن ذاکر صاحب کو علی گڑھ میں جولی کاکلنڈری اور کھلنڈری پن کا پڑچکا تھا، اس سے مجبوراً یہ بالعموم طرح طرح کے منصوبے بازی اور اسکیم بازی میں مشغول رہتے۔ یہاں برلن میں ایک چھاپہ خانہ کاویانی پریس کے نام سے قائم تھا جس کے مالک ایک ایرانی صاحب، تقی زادہ نامی تھے۔ ذاکر صاحب نے تجویز پیش کی کہ اردو کی بعض کتابیں صحت اور صفائی سے چھاپی جائیں۔ تقی زادہ بھی اس پر تیار ہو گئے۔ پہلا قرعہ غالب کے

اردو دیوان پر پڑا۔ اس کے مصارف کے لیے ذاکر صاحب نے ان دونوں - مجیب صاحب اور عابد صاحب - کی جیبیں خالی کر والیں۔ یہ دیوان چھوٹے جیبی کتابی سائز پر چھپا ہے۔ اعلیٰ کاغذ، خوبصورت ٹائپ، بیل دار جدول، دورنگی چھپائی، نفیس مضبوط جلد۔ غرض ہر ایک چیز خوب سے خوبتر ہے۔ اس کے ساتھ غالب کی ایک موقلم تصویر بھی ہے۔

اس اڈیشن کی دو خصوصیتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں! پہلی یہ کہ اس کی کمپوزنگ کا بیشتر کام خود ذاکر صاحب نے کیا تھا۔ یہ اس زمانے میں ساتھ ساتھ حرف جوڑنے (کمپوزنگ) کا کام بھی سیکھ رہے تھے۔ اتفاق سے ان ایام میں شہر میں یہ کام کرنے والے بھی کافی نہیں تھے۔ اس لیے تاخیر کا اندیشہ تھا۔ شاید اس طرح مصارف میں کچھ بچت بھی منظور ہو، چنانچہ انھوں نے دیوان اردو میں اس کام کا زیادہ حصہ خود کیا؛ کچھ حصہ مجیب صاحب کا بھی جوڑا ہوا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کے ساتھ جو تصویر شامل ہے، یہ اصلی نہیں ہے، بلکہ لاپرنٹنگ کے رہنے والے ایک جرمن مصور کی بنائی ہوئی ہے۔ ہوا یہ کہ جب دیوان چھاپنا طے ہوا، تو تجویز ہوئی کہ اس میں غالب کی تصویر بھی ہو۔ موجودہ تصویروں میں سے کوئی انھیں پسند نہ آئی۔ اردوئے معلیٰ اور یادگار غالب میں غالب کے چلیے اور لباس سے متعلق اچھی خاصی تفصیل موجود ہے۔ دیوان فارسی کے ساتھ لیتھو کی تصویر بھی چھپی ہے۔ یہ سب باتیں اس مصور کو بتائی گئیں اور انھوں نے اپنے ذہن سے

یہ تصویر بنا دی۔ خدا کی شان، آج ہی تصویر سب سے زیادہ دیکھنے میں آتی ہی!

برسبیل تذکرہ، یہ بھی یاد رہے کہ مسیح الملک حکیم اجل خاں صاحب مرحوم اچھے خاصے

شاعر بھی تھے۔ وہ اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے؛ شیدائے تخلص تھا۔ دیوان

غالب کے بعد ذاکر صاحب نے اسی چھاپے خانے سے دیوان شیدائے بھی اسی اہتمام

سے شائع کیا تھا۔ اس کی کمپوزنگ سرتا سر مجیب صاحب کا کارنامہ ہے۔
جرمنی سے واپس آنے کے بعد ذاکر صاحب کی زندگی کا سب سے اہم دور شروع
ہوا۔ ان کی غیر حاضری ہی میں جامعہ ملیہ کی جوائنٹس اور دفتر علی گڑھ سے دلی منتقل
ہو چکے تھے۔ ذاکر صاحب اب شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) مقرر ہوئے خوش
قسمتی سے انھیں سا تھ کام کرنے والے ایسے کارکن مل گئے جنھیں ان پر
کامل اعتماد تھا اور جو خود بھی پورے اعتماد کے قابل تھے۔ ان میں پروفیسر محمد
مجیب (موجودہ شیخ الجامعہ) ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا اسلم جے راج پوری،
مولانا خواجہ عبدالحی، سعید انصاری، حافظ فیاض احمد، حامد علی خان، وغیرہم
خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جامعہ ملیہ کی مالی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ حکیم اجل خان مرحوم کا
بہت بڑا سہارا تھا۔ وہ خود بھی بہت کچھ دیتے رہتے تھے اور ان کے ذریعے سے
فتوح بھی ملتی رہتی تھیں۔

جب دسمبر ۱۹۶۲ء میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے، تو اب جامعہ ملیہ کا بار ڈاکٹر انصا
رحوم کے کندھوں پر آ پڑا۔ یہ بڑا سختی کا دور تھا۔ آمدنی کم، بلکہ مفقود اور قرض
کی مصیبت اس پر مستزاد۔ اُمنا (سٹیشنوں) کی کثرت نے یہ رائے دی کہ چونکہ
جامعہ کو چلانے کے لیے ضروری مالی انتظام نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بند کر دی
جائے۔

ذاکر صاحب کی ایک خصوصیت جو روزِ زمانہ سے ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی،
ان کا خطرے میں بید ہر اک کو دڑنے کا انداز تھا۔ کوئی نازک مرحلہ ہو، مشکل
مقام ہو، مصیبت کا احتمال ہی نہیں، یقین ہو۔ اس سے ان کے اندر کا ٹھکان
جویوں نضوف اور تعلیم کی چادر تانے سو یا رہتا، جاگ اٹھتا۔ یہ ان کے لیے

چیلنج کا حکم رکھتا، اور یہ بات ان کی شانِ مردانگی کے منافی تھی کہ وہ یہ بیڑا اٹھانے سے انکار کر دیں۔ اب بھی یہی ہوا۔ جب ٹریسٹوں نے جامعہ کے بند کر دینے کا فیصلہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ سب نے کہا:

ہم جامعہ کو بند نہیں ہونے دینگے، اور جیسے بھی بن پڑا، اسے چلائینگے۔ گیاہ اساتذہ اور کارکنوں نے عہد کیا کہ ہم بیس برس تک ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ شاہرہ طلب نہیں کریں گے۔ لیکن ان بے چاروں کو یہ ڈیڑھ سو بھی کب دیا گیا، بلکہ بعض اوقات مہینوں کسی کو ایک حصہ تک نہیں ملا۔

غرض اس کے بعد ان لوگوں کو کلیئہ اپنے زور بازو پر تکیہ کرنا پڑا۔ ملک کے درو مند اور صاحبِ احساس طبقے نے جب بھی اور جو کچھ بھی ان کی جھوٹی میں ڈال دیا، انھوں نے اسے صبر و شکر سے قبول کیا۔ ان غریبوں نے یہ ایام کس تنگی ترشی سے گزارے، اس کا اندازہ ایک واقعے سے کیجیے۔ ۱۹۴۳ء یا شاید ۱۹۴۴ء میں نظام حیدر آباد کی حکومت نے جامعہ ملیہ کو پانچ لاکھ کا گرانقدر شاہانہ عطیہ دیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی راوی ہیں کہ جب ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی، تو میں نے اس کا میانی پر انھیں مبارک باد دی۔ خوش ہو کر کہا: رشید صاحب، آج گیارہ برس میں پہلی مرتبہ جامعہ کے اسٹاف کو پوری تنخواہ دے سکا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جس تہذیب اور یکوئی، صبر اور استقلال، ایثار، اور خودداری سے یہ فرض نبھایا، اس کی شاہد ساری دنیا ہے۔ خدا نے بھی ان قربانیوں کو نوازا، اور شرف قبولیت بخشا۔ ملک آزاد ہو گیا اور آج جامعہ ملیہ اسلامیہ ملک کی تعلیمی جدوجہد میں ہر پہلو سے صفِ اولیٰ میں ہے۔

آغشتہ ایم ہر ہر خارے بخون دل
قانونِ باغبانیِ صحرانوشہ ایم

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا، لیکن چونکہ آزادی اور ملک کی تقسیم تو ام آئیں۔ اس لیے مدتوں ملک میں انتشار اور بد امنی کا دور دورہ رہا۔ خاص طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے اور اس کی ہستی تک معرضِ خطر میں آگئی۔ حکومت وقت نے دیکھا کہ اگر اس وقت کوئی تجربہ کار اور معتبر شخصیت یونیورسٹی کا نظم و نسق ہاتھ میں نہیں لیتی، تو یہ سر تید کا لگا یا ہوا پودا صرصر جود کا شکار ہو جائیگا۔ آخر نگاہِ انتخابِ ذاکر صاحب پر آن ٹھہری۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم وزیرِ تعلیم تھے۔ انھوں نے بلوا بھیجا اور ان سے کہا کہ یونیورسٹی کو بچانے کی ایک ہی صورت ہو کہ آپ وائس چانسلر بن کر وہاں چلے جائیں۔ یہ عذر کرنے لگے۔ اپنی گونا گون مصروفیتوں اور جامعہ ملیہ کی ذمہ داریوں کا بھی ذکر کیا۔ اس پر مرحوم نے نفسیاتی ہتھیار استعمال کیا۔ کہنے لگے: اچھا اگر آپ نہیں جانا چاہتے تو ہمیں مجبوراً فلاں صاحب کو بھیجنا پڑیگا۔ یہ صاحب مرفوعِ انقلم ہو چکے تھے۔ ایسے چیلنج پر ذاکر صاحب بھلا کیونکر طرح دے جاتے ان کے نام کا سنا تھا کہ انھوں نے فوراً پیشکش قبول کر لی اور علی گڑھ چلے گئے۔

یہ نومبر ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ یہاں یہ ۱۹۵۷ء تک رہے۔ ان آٹھ برس میں انھوں نے یونیورسٹی کی ساکھ پھر سے قائم کر دی، جو آزادی سے پہلے کے دو تین برس میں ملیا میٹ ہو گئی تھی۔ وہ پودا جو بادِ سموم کے بھونکوں سے مرجھا یا جا رہا تھا، ذاکر صاحب کی آبیاری اور نگرانی کے صدفے پھر سے لہلہا اٹھا اور اس میں نئے سرے سے پھل پھول آنے لگے۔

۱۹۵۷ء میں وہ بہار کے گورنر مقرر ہوئے؛ اور جب چار برس بعد اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے تو ۱۳ مئی ۱۹۶۲ء کو جمہوریہ ہند کے نائب صدر بنا دیے گئے۔ ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر اداکراشن کی صدارت جمہوریہ ہند کی میعاد ختم ہوئی۔ نیا انتخاب ہوا، تو قوم نے ملک کے اس سب سے بڑے عہدے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو منتخب کیا۔ یہ انتخاب چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ اسنو اس کہ قوم ان کی خدمات سے اس پوری مدت کے لیے بہرہ مند نہ ہو سکی!

۳ مئی ۱۹۶۹ء صبح گیارہ بجے ان پر دل کا دورہ پڑا اور چند منٹ کے اندر جان بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ اپنی محبوب جامعہ ملیہ کے درمیان ایک خاص احاطے میں سپرد خاک کیے گئے۔
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت

ڈاکٹر صاحب کو اپنی تعلیمی اور انتظامی ذمہ داریوں نے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت نہیں دی۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف معاشیات کے موضوع پر تھی۔ انھوں نے تعلیم سے متعلق بھی اپنے تجربات اور خیالات قلمبند کیے ہیں۔ کسی زمانے میں انھوں نے "رقیہ ریچانہ" کے نام سے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ اس وقت تک ان کی مندرجہ ذیل چیزیں شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ مبادی معاشیات (ایڈون کینن کی کتاب کا ترجمہ، ۱۹۶۲ء)

۲۔ ریاست (افلاطون کی کتاب Republic کا ترجمہ، ۱۹۳۱ء)

(نظر ثانی کے بعد دوبارہ ۱۹۶۷ء)

۳۔ معاشیات: مقصد و منہاج (۱۹۳۲ء)

۴۔ معاشیات قومی List کی کتاب National Economy کا ترجمہ

۵۔ ذکر حسین (محرم کی تقریر)

۶۔ حالی بہ حب وطن (یوم حالی کی تقریر)

۷۔ تعلیمی خطبات

۸۔ جامعہ کیا ہے؟

۹۔ شکشا (ہندی)

Educational Reconstruction in India ۱۰

The Dynamic University ۱۱

(۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے مختلف یونیورسٹیوں کے خطبات صدارت ۱۹۶۵ء)

۱۲۔ ہندستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم (پٹیل خطبات کا اردو ترجمہ) ڈاکٹر سید عابد حسین، ۱۹۶۲ء

۱۳۔ دیانت (دورانا)

۱۴۔ ابو خان کی بکری (بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ)

Die Borachast des Mahatma Gandhi ۱۵

(۱۹۶۴ء جرمن)

۱۶۔ خرگوش اور گھوڑا (۱۹۷۱ء)

تحریر میں ذاکر صاحب کا نظریہ یہ تھا کہ تصنیف بول چال کی زبان میں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ خیالات کی گہرائی، زبان و بیان کی سلاست اور سادگی، لب و لہجے کی صداقت اور خلوص ان کی ہر تحریر کا طرہ امتیاز ہے۔ اگر آپ کو ان کی کسی تحریر میں مشکل الفاظ یا فارسی کی ثقیل ترکیبیں ملیں تو یقین کیجیے کہ یہ انہوں نے بہت سی جلدی میں لکھی ہے اور اس پر انہیں نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔ ہر پڑھے لکھے آدمی کی طرح کبھی کبھی تفنناً شعر بھی کہ لیتے تھے۔ دو شعر سنئے:

مانا ہجویم درد بھی ہے جزو زندگی پر کیف زندگی نہ سہی، زندگی تو ہے
لشہ اس کے ذکر سے نفرت نہ کیجیے ذاکر شکستہ حال سہی، آدمی تو ہے

شاد، نریش لکار

اردو کا یہ جوان مرگ شاعر ۱۱ دسمبر ۱۹۲۷ء کو مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں تیحی پور (اڑمٹانڈہ) ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوا۔ ان کے والد نوہر یار ام درد تلمیذ جوش ملیانی بھی اپنے زمانے میں پنجاب کے ادبی حلقوں میں خاصے معروف تھے۔ شاد نے شاعری گویا ورثے میں پائی۔ لیکن دوسری بلا شراب نوشی بھی اسی کے ساتھ آئی۔ درد بلا نوش تھے اور اسی نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ گھر باد کی خبر نہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال۔ شاد نے جوں توں کر کے دسویں درجے تک کی تعلیم تو مکمل کر لی، لیکن کچھ تو عیسر الحالی کے باعث اور کچھ اپنے لاابانی پن سے اسے جاری نہ رکھ سکے اور کم عمری ہی میں انھیں ملازمت اور تلاش روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا۔ چنانچہ راولپنڈی، جالندھر، لاہور میں مختلف اداروں میں کام کرتے رہے۔

تقسیم ملک کے بعد زبوں حالی میں اور اضافہ ہوا۔ وہ بے سروسامانی میں جان بچا کر دتی آئے۔ بعض دوستوں کی مدد سے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت ملی،

لیکن بس اتنا ہی کہ جان و تن کا رشتہ برقرار رہ سکے۔

اسی زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ شاعری میں وہ بہکتے نہیں تھے۔ خیالات میں نچنگی، بیان میں شگفتگی، زبان میں چستی اور ان سب پر مستزاد ملکا سا تیکھا پن اور طنز۔ لیکن امنوس کہ شراب نوشی نے ان کی جملہ صلاحیتوں کو برباد کر دیا۔ وہ کئی مرتبہ موت کے دروازے سے لوٹ کر آئے۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کو اچانک ان کے والد درود صاحب لاپتا ہو گئے۔ خدا معلوم، انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نے اچک لیا، گھر سے بھلے چٹکے نکلے، اور واپس نہ آئے۔ شاد نے ان کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرو کرنا شست نہیں کیا، لیکن بیود، ان کا سراغ ملنا تھا نہ ملا۔ شاد نے غم غلط کرنے کو شراب میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ یوں گھریلو زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ آخری شام ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء وہ گھر آئے، تو یہاں کا ماحول معمول سے زیادہ ناقابل برداشت پایا۔ ان کی سکوخت دریاے جہنا کے کنارے کی بستی تیمار پور میں تھی۔ دس گیارہ بجے شب گھر سے نکلے اور رات بھر غائب رہے۔ اگلی صبح ان کی لاش دریا سے ملی۔

انھوں نے بہت کچھ لکھا:

(۱) نظمیں؛ بتکدہ؛ فریاد؛ دستک؛ لکڑہ؛ آہیں؛ قاشیں؛ آیات جنوں؛ پھوار؛ سنگم؛ میرا منتخب کلام؛ میرا کلام نوبہ نو؛ دو آتشہ (حافظ کا ترجمہ)؛ وجدان۔

(۲) نثریں؛ ڈارلنگ؛ راکھ تلے؛ سرخ حاشیے؛ سرقہ اور توارد؛ مطالعے؛ جان پہچان، غالب اور اس کی شاعری؛ انداز غالب (شرح)؛ محاورات غالب؛ آواز غالب؛ پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری؛ پانچ مقبول طنز و مزاح نگار؛ شام نگر میں سینما آیا؛ چینی بلبل؛ سمندری شہزادی۔ آخری تینوں کتابیں بچوں

کے لیے ہیں

شاد نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا۔ شروع میں کچھ غزلیں اپنے والد درویش کو درسی کو یہ کہہ کر دکھلائیں کہ یہ میرے ایک دوست کا کلام ہے؛ وہ ڈرنے لگے کہ اگر والد کو معلوم ہوا کہ میں شعر کہتا ہوں، تو خفا ہونگے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا، تو انھوں نے ناراضی کی جگہ خوشی کا اظہار کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ نشی تلوک چند محروم سے مشورہ کرتے رہے۔ اس کے بعد جناب جوش ملیح آبادی سے اصلاح لی؛ اور تقسیم کے بعد دلی پہنچے، تو چند غزلیں جوش ملیح آبادی کو بھی دکھائیں۔ شاد کا کلام ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور اردو کے منظوم سرمایے میں مقامِ بلند کا مستحق ہے۔

کچھ مختصر کلام بطور نمونہ ملاحظہ ہو؛

ظلوں مہر و محبت کی جلوہ گاہ تو ہیں
اگر ثواب کے قابل نہیں ہیں ہم نہ سہی
نہیں ہیں منزلِ مقصود انگِ راہ تو ہیں
خدا کے فضل سے شالیستہ گناہ تو ہیں

حسن ہو، یا پھلکتا سا غریب
آئینہ آتی ہے جسم سے ایسے
چال ہو، یا لطیف گیت کی نے
جیسے مندر میں عود جلتا ہے

زندگی کے حسیں گلستاں میں
جب پھوٹا ہے خندہ گل کو
دہریں ہم وفا شعاروں کو
دشمنوں سے تو بچ گئے، لیکن
ہر تبسم ہے مرا داغدارِ الم
اس سے ٹپکا ہے گریہِ شبنم
دوستی کے بھرم نے مار دیا
دوستوں کے کرم نے مار دیا
مری حیات کی پستی میں بھی بلندی تھی
زمین پہ گر کے قدم میں نے آسمان کے لیے

ایسر طائر ہیں سخت بزدل، فضول بھرتے ہیں سروا ہیں

قفص کو بھی ساتھ لے آئیں یہ، اگر قفس سے نجات چاہیں

مرے تخیل کا حاصل ہیں، مرے تصور کی زندگی ہیں
 دراز گیسو، حسین آنکھیں، جمیل چہرہ، گداز باہیں
 خوشی کے نغموں میں کار فرما، بشر کی بے چارگی کے نوحے
 ہر اک مبسم کی تہ میں آنسو، ہر ایک حسرت کی تہ میں
 رہ طلب میں جو تھک کے بیٹھے مری نظر میں وہ بواہوس ہے
 پناہ کی اس میں جستجو کیا، کہاں ہیں اس میں پناہ گاہیں!
 جن گلیوں میں تو نے مجھ سے کچھ بھڑے اقرار کیے تھے
 اب بھی بحال افسردہ میں ان گلیوں میں گھوم رہا ہوں
 تیرے غم میں غم حیات بھی ہے مجھ میں جینے کی کوئی بات بھی ہے
 رنج سے خوگر نہ تھے، واقف نہ تھے آلام سے
 کیا وہ دن تھے، جب گزرتی تھی بڑے آرام سے
 صبح تک کیا جانے، کیا گزرے مریض عشق پر
 ٹمٹماتا ہے چراغِ زندگی جب شام سے
 ایک ہم ہیں یاد کرتے ہیں انھیں صبح و سوا
 ایک وہ ہیں، جن کو نفرت ہم ہمارے نام سے
 صبح عشرت میں کہیں شام الم پہناں نہ ہو
 دور رہا ہے دل، فریب گردشیں آیا م سے
 اللہ ری بخودی کہ تیرے پاس بیٹھ کر تیرا ہی انتظار کیا ہے کبھی کبھی
 دیر و حرم سے دور، وجوہ عدم سے دور
 لے جا رہی ہے مجھ کو تری رہگزر کہاں؟

ایک شب گزری تھی تیرے گیسوؤں کی چھاؤں میں
 عمر بھر بخو ابیاں میرا مقدر ہو گئیں
 آپ ہی کا یہ فیض ہے، ورنہ زندگی اس قدر ادا اس نہ تھی
 آپ دل کے قریب ہیں پھر بھی آنکھ دیدار کو ترستی ہے
 بادہ و جام پر نہیں موقوف تشنگی میں بھی ایک مستی ہے
 شاداب جس کو خوشی سمجھتے ہو وہ بھی صہبانے غم کی مستی ہے
 کٹ تو گئی ہے بھر کی رات کیسے کٹی؟ یہ اور ہے بات
 اک تخیل ہے جو محتاج بیاں رہتا ہے
 بے وہ حسن جو بے نام و نشان رہتا ہو
 زندگی گوش بر آواز ہوئی ہے جسے

ہر نفس پر تری آہٹ کا گماں رہتا ہو
 نگاہ اہل محبت کا فیض ہے ورنہ تری نظر کو بھی کیا علم تھا کہ تو کیا ہو؟
 جو بن پڑے تو بھٹک جا رہ محبت میں سفر ہو سہل، تو پھر لطف جستجو کیا ہو؟
 ہیں نگاہ متسخر سے دیکھنے والو! یہ حادثات جو تم پر گزر گئے ہوتے!
 یہ ناخدا جو نہ ہوتے تو شاداب ہم اب تک

بفیض موز بلا پار اتر گئے ہوتے
 کون سلگتے آنسو روکے، آگ کے ٹکڑے کون چبائے
 اے ہم کو سمجھانے والے! کوئی تجھے کیوں کر سمجھائے
 برکھا بر سے، نغمے گونجیں، شیشے سے شیشہ ٹکرانے
 کون اس وقت انجام کی سوچے، کون خرد کے پھیریں لے
 بیون کے اندھیار سے تھپہ پر، جس نے تیرا ساتھ دیا تھا
 دیکھ، کہیں وہ کوئل آشا، آنسو بن کر ٹوٹ نہ جائے

اس دنیا کے رہنے والے، اپنا اپنا غم کھاتے ہیں
 کون پر اپنا روگ خریدے، کون پر اپنا دکھ اپنائے!
 ہائے مری مالوس امیدیں، دائے مرے ناکام ارادے
 مرنے کی تدبیر نہ سوچھی، جینے کے انداز نہ آئے
 اس دنیا کے غمخانے میں، غم سے اتنی فرصت کب ہو!
 کون تاروں کا منہ چومے، کون بہاروں میں لہرائے!
 ضبط بھی کب تک ہو سکتا ہے، صبر کی بھی اک حد ہوتی ہو
 پل بھر چین نہ پانے والا، کب تک اپنا روگ چھپائے!
 شاد و ہی آوارہ شاعر، جس نے تجھ سے پیار کیا تھا
 نگر نگر میں گھوم رہا ہے، ارمانوں کی لاش اٹھائے!
 کہاں کہاں نہیں موجود میرے نقش قدم!
 کہاں کہاں نہیں ٹوٹا مرا دل حساس!
 کہاں کہاں نہیں تڑپی نگاہِ درد شناس!
 کہاں کہاں نہیں چھلکے، یہ دیدہ رُخِ غم!
 کہیں بھی نہ سخی میرے رخ سے گردِ دلال
 کہیں بھی مل نہ سکا کوئی حبادِ منزل
 کہیں بھی رک نہ سکا میں مسافرِ غمِ دل
 یہی ہوا میری ساری مسافرت کا آل
 گیا جہاں بھی، پلٹ کر میں سو گوار آ یا
 کسی جگہ بھی تو تسکین جستجو نہ ہوئی
 کہیں بھی تو نہ ملا، تجھ سے گفتگو نہ ہوئی

پکارنے کو تجھے ہر طرف پکار آیا

جواب میں وہی آواز باز گشت آئی

کہاں ہوئی مری فریاد کی پذیرائی!

ہر تمنا پہ بے حسی ہوتی ہر مسرت بھی سمجھتی ہوتی

موت ہوتی اگر نہ دنیا میں زندگی موت بن گئی ہوتی

زندگی کی ستم ظریفی کو واقعہ ہے کہ کم سمجھتے ہیں

وہ بھی روٹھی ہوئی مسرت ہی جس کو ہم لوگ غم سمجھتے ہیں

تابش ہے ہر میں نہ تجلی ہے ماہ میں تیری نگاہ جب سے ہو میری نگاہ میں

دل میں ہو شوق دید کا عالم تو دیدنی گو دیکھنے کی تاب نہیں ہو نگاہ میں

اے شاد رہبروں کے رویے کو دیکھ کر آنا پڑا ہے راہزوں کی پناہ میں

کچھ میکشی کو اس نے بھی رسوا کیا، مگر کچھ میکشی بھی شاد کو بدنام کر گئی

سواہیوں پہ بھی مجھے کرنا پڑا ہے خیر یاران نیک نام کے اطوار دیکھ کر

جیسے مری نگاہ نے دیکھا نہ ہو کبھی محسوس یہ ہوا تجھے ہر بار دیکھ کر

کچھ تلخی شراب نے مجھ کو کیا ہلاک کچھ تلخی شعور کا مارا ہوا ہوں میں

آج تک وہ نظر نہیں بھولی تم نے دیکھا تھا ایک بار مجھے

یہ چاندنی، یہ گھنی خامشی، یہ تنہائی دل شکستہ کی ہر چوٹ پھرا بھر آئی

ہربانی میں تغافل کی ادا ہے تو سہی کچھ نہ کچھ آپ کا دل ہم سے خفا ہو تو سہی

موسم دلکش، ساقی گلرد، صحن گلستاں، بادہ رنگیں

اس ماحول میں رہ کر بھی میں شاد بہت مغموم رہا ہوں

زندگی سوز سے عبارت ہو یہ کسی ساز کی نقیب نہیں

کس قدر بد نصیب انساں ہیں کوئی غم بھی جھپٹیں نصیب نہیں

سمٹے تو بن گئے کسی ہوش کے نقشِ پا پھیلے تو ہم قضا و قدر تک پہنچ گئے
 گوہرِ قدم پہ دیروڑم کے تھے پیچ و خم ہم پھر بھی تیری رہگزر تک پہنچ گئے
 دل نے بنا دیا ہے محبت کا دل مجھے ہر وارداتِ شوق مری واردات ہو
 فسرہ دیکھ کے تم کو خیال آتا ہے فسردگی میں بھی کم دل کشی نہیں ہوتی
 غم حبیب کا جب تک نہ حسن شامل ہو غم جہاں میں کبھی دل کشی نہیں ہوتی
 دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے
 آپ سے یوں تو اور بھی ہوں گے آپ کی بات آپ ہی کی ہے
 عقل سے صرف ذہن روشن تھا عشق نے دل میں روشنی کی ہے
 کسی رخ پہ جب گردِ غم دیکھتے ہیں تو اپنی ہی تصویر ہم دیکھتے ہیں
 کسی کی نگاہوں کی بیگانگی میں ہمیں جانتے ہیں، جو ہم دیکھتے ہیں
 کریں کیا غم زندگی کی شکایت یہی غم تو ہے زندگی کا بہانہ
 شاید یہ سب ز غم نہیں دل میں پھول کی گود میں شرار ہے
 اُغم زندگی! اداس نہ ہو آج تھے ہم گلے لگاتے ہیں
 مجھ سے ملنے سے پیشتر وہ نظر آئے سے بھی روشناس نہ تھی
 سکوں کسی کو نہیں مجھ کو مضربِ ہی ملا کوئی قفس کے لیے کوئی آشیاں بکے لیے

ناطق گلاؤ ٹھوی، سید ابوالحسن

کہا جاتا ہے کہ نواب مرزا خان داغ کے ہزاروں شاگرد تھے جن کے نام ایک رجسٹر میں تاریخ تلمذ کی ترتیب سے درج تھے۔ اس بیان کی صحت سے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ جب داغ کا ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا ہے تو ان کے بلا مبالغہ سینکڑوں شاگردان کا سلسلہ قائم۔ کھنے کو موجود تھے۔ ۶۵ برس بڑا مبارک زمانہ ہے، آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ اب کئی برس سے صرف دو حضرات رہ گئے تھے، خوش ملیانی اور ناطق گلاؤ ٹھوی۔ گزشتہ مئی میں ناطق بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب صرف ایک حضرت خوش کی ذات اپنے استاد کی یادگار رہ گئی ہے۔ خدا ان کا حامی و ناصر رہے!

سید ابوالحسن ناطق گلاؤ ٹھوی ۱۱ نومبر ۱۸۸۶ء کو کامٹی میں پیدا ہوئے، جو ناگپور کے قریب اچھا خاصا بڑا قصبہ ہے۔ ان کے بزرگ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مندرستا آئے تھے۔ ان کے دادا سید غلام غوث وکالت پیشہ تھے اور اسی سلسلے میں بدتوں میرٹھ میں مقیم رہے۔ پھر خاندان نے گلاؤ ٹھوی (ضلع میرٹھ) میں سکونت اختیار کر لی۔

یہاں ان کی کافی بڑی جاداد اور زمینداری تھی۔ ناطق کے والد سید ظہور الدین نے تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ وہ وسیع پیمانے پر لکڑی کا کاروبار کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں وہ کامٹی میں سکونت پذیر تھے، چنانچہ ناطق یہیں پیدا ہوئے۔ سید ظہور الدین کا ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔

ناطق کی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر شروع ہوئی۔ قدرتا فارسی عربی پر خاص توجہ رہی، اور انھوں نے اس کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی۔ آخری دورہ حدیث شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے پڑھا۔ وہیں طب بھی ان کے برادر خرد حکیم احمد حسن (عرف حکیم بدن) سے حاصل کی۔ بعد کے زمانے میں روزمرہ کے کام کاج کے لائق انگریزی سے بھی اپنے طور پر واقفیت حاصل کر لی تھی۔ بلکہ ان کے کلام میں بعض انگریزی شعرا مثلاً شیلی، لانگ فیلو وغیرہ کی نظموں کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔

سید معشوق حسین اطرہا پوڑی، ناطق کے خالہ زاد بھائی تھے۔ انھیں کی ترغیب پر انھوں نے کسی کے زمانے میں شاعری شروع کی، لیکن ان سے مشورہ نہیں کیا۔ اس کے لیے انھوں نے بیان ویزدانی مرحوم (۱۹۰۰ء) کا انتخاب کیا، جو اساتذہ وقت میں بھی درجہ خاص کے حامل تھے۔ لیکن چند ہی ماہ بعد بیان فوت ہو گئے۔ اسی زمانے میں امیر مبنائی بھی چل بسے۔ اتفاق کی بات کہ کہیں سے داغ کے دو دیوان بکرا دیواغ اور آقاب داغ — ان کے ہاتھ لگ گئے۔ انھیں دیکھا، تو یہ داغ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تھوڑے دن بعد خط و کتابت کے ذریعے ان کا تلمذ اختیار کر لیا۔ بعض اصحاب نے انھیں جلال بکھنوی کا شاگرد بھی کہا، یہ درست نہیں، وہ شاگرد داغ ہی کے تھے، یاد و چار غزلوں کی حد تک بیان ویزدانی کے کھلی کچ لیجیے۔ بالآخر انھوں نے مشتق اور غور و فکر سے خود درجہ استاد حاصل

کر لیا تھا چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں ان کے شاگرد زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔
تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے ملک کی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ یہ گویا ان کا ورثہ
تھا۔ ان کے ایک چچا سید عنایت اللہ کو ۱۸۷۵ء کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں
انگریزوں نے سولی پر ٹوکا دیا تھا۔ ناطق مرحوم کانگریس اور خلافت کی تحریکوں
میں کامے، درے، قدمے بڑھ چڑھ کر شریک ہوئے۔ چوں کہ گھر کے کھاتے پتے تھے، اس
لیے معاش کی طرف سے کوئی تشویش نہیں تھی۔ وہ مسلسل ۳۰ سال تک کانگریس میں
کیٹی کے رکن رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مرکزی اسمبلی کے بھی رکن منتخب ہوئے تھے۔ لیکن
روز بروز مالی حالت کمزور ہوتی گئی، اور قوار کے اضمحلال کے ساتھ وہ سیاسی
سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکے، اور بالآخر خانہ نشین ہو گئے۔

ان کا کلام مجربن (دور اول)، اور پیسہ اخبار (دور دوم) میں ملتا ہے۔ اپنے زمانے کے دوسرے
مختلف رسائل و جرائد میں بھی ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔ ان کی غزلیات کا دیوان آج تک
شائع نہیں ہوا۔ چند نظموں کا مجموعہ "ناطق" کے عنوان سے گلدرستہ "جلوہ یار"
(میرٹھ) کے شمارہ مارچ ۱۹۱۳ء کے ساتھ بطور ضمیمہ چھپا تھا۔ چند سال ہوئے، ایک
طویل مکتوب جس میں فنی معلومات ہیں (کیل میں غلیل) اور تنقیدی موضوعات سے
متعلق چند خطوط اور مضامین "سبعہ سیارہ" کے نام سے شائع ہوئے تھے (ناگپور
۱۹۶۰ء) غالب کے دیوان کی شرح کنز المطالب اگرچہ ۱۹۲۶ء میں لکھی تھی، لیکن شائع
ابھی پارسال (دیکھو فروری ۱۹۶۸ء) ہوئی۔ جس شخص نے ستر سال مشق سخن کی ہو
اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے کلام کی مقدار کتنی ہوگی۔ دیوان کے علاوہ کچھ اور
تصنیفات بھی غیر مطبوعہ رہ گئیں، جن کے مسودے ان کے بعض شاگردوں کے
پاس ہیں۔

مرحوم بہت کم آمیز تھے، بلکہ بہت حد تک زودرنج اور اظہار رائے میں بیباک تھے۔

اسی لیے ان کے احباب کا حلقہ وسیع نہ ہو سکا۔ انوس کہ ان کا آخری زمانہ بہت عسرت اور کس پرسی کی حالت میں کٹا۔ اولاد میں چھوٹے ہوئے۔ تین بیٹے اور تین بیٹیاں؛ لیکن وہ سب داغ مفارقت دے گئے۔ چار کا تو کتنی ہی میں انتقال ہو گیا؛ ایک لڑکا اور ایک لڑکی گھر بار والے ہو کر مرے۔ ان صدقاتِ ذہنی و جسمانی نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ چھ ماہ بستری مرض پر پڑے پڑے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے۔ اعضا بیکار ہو گئے اور حافظہ بھی رخصت ہو گیا۔ نقل و حرکت تک سے معذور ہو چکے تھے۔ آخر وہ دن بھی آگیا، جو اٹل ہے۔ انھیں بہت دن سے مسلسل بول کا عارضہ تھا؛ لیکن خدا کی شان، دسمبر گزشتہ میں اس کے بالکل حسیں بول کی شکایت پیدا ہو گئی۔ اسی کے علاج کے لیے انھیں اسپتال میں داخل کیا گیا۔ جب افاقہ ہوا، تو گھر پر آ گئے، اور یہاں علاج ہوتا رہا، لیکن اب کمزور و مجید ہو گئے تھے۔ ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء کی شام سے حالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور زبان بند ہو گئی۔ آدھی رات کے وقت آخری سچکی آئی، یوں وہ شب ۲۶/۲۷ مئی ۱۹۶۹ء زاریع الاول ۱۳۸۹ھ) کو ناگپور میں مالکِ حقیقی کے بلاوے پر وہاں جا پہنچے، جہاں ہم سب آگے پیچھے جانے والے ہیں۔

صبح ہوتے ہوتے اس حادثے کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی۔ سوگ میں کارپوریشن کے دفتر بند کر دیے گئے، جس کے وہ ۳۰ برس تک رکن رہے تھے۔ سہ پہر کو جنازہ ان کی قیامگاہ سے اٹھا اور سر شام انھیں قبرستانِ مومن پورہ (ناگپور) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایک قلمی بیاض سے انتخاب کردہ چند اشعارِ ملاحظہ ہوں؛ یہ جناب محمد عبدالملک، ناگپور کی مملو کہ ہے، جو ان کے مخلص نیاز مندوں میں سے ہیں؛

پھولیوں کا رنگ روپ، پرندوں کے چہرے
کس کو خبر ہو، سب کدھر آئے، کدھر گئے

ہم کو تو رات نہ آئی کسی گل کے وصل کی
اب کے بھی دن بہار کے یو نہیں گزر گئے
آج میخانے میں برکت ہی سہی
میکشوا آؤ، عبادت ہی سہی
آپ، اور جنسِ دل کے خریدار! جی نہیں
پہنا تا ہوں، صورتِ اہل نظر کو میں
تائشِ رخسار نور آراے شمعِ بزمِ عیش
آتشِ گل کار فرماے شرابِ نغمہ ہے
ہمنوائی دیکھ، آئینِ ہم آہنگی نہ پوچھ
نے لبغلی نالہ و مطرب بکارِ نغمہ ہے
مستی یزداں پرستی کے لیے، اللہ نس
یاں دفور کیف و جہِ اختصاصِ نغمہ ہے
آج کل نغمے یہ ہے: نا طق! مدارِ شاعر
شاعری پر پہلے کہتے تھے، مدارِ نغمہ ہے
کس کو ہر باں کہیے، کون ہر باں اپنا
وقت کی یہ باتیں ہیں، وقت اب کہاں اپنا
اے خدا! انگلہ سن لے اپنی بے نیازی کا
آج حال کہتا ہے، ایک بے زباں اپنا
نامراد دنیا میں رہ کے خوب بھر پائے
چل نکل چلیں اے دل! کچھ نہیں یہاں اپنا
یہی اندازِ حوادث ہے، تو دن ہو گا، نہ رات

یہی دن رات اگر ہیں، تو وہ دن دور نہیں

دوسروں کو کیا کہیے، دوسری ہے دنیا ہی

ایک ایک اپنے کو، ہم نے دوسرا پایا

کم سمجھ میں آتے ہیں اب تو، اس کے گل بوٹے

ہم نے نقشِ ہستی کو کچھ مٹا مٹا پایا

رکھتا ہے تلخ کام، غمِ لذتِ جہاں
کیا کیجیے کہ، لطف نہیں کچھ گناہ کا

میں حاصلِ نظر ہوں، تمنائے دید میں
یتیموں کا مہربن مونسے نگاہ کا

ہنگامہ حیات سے لینا تو کچھ نہیں
ہاں دیکھتے چلو، کہ تماشا ہے راہ کا

کہیں کس سے، پتے کی بات کہتا ہی نہیں کوئی

سینس کس کی، یہاں جس نے کہی، اپنی کہی تم نے

اے جنوں! باعثِ بد حالی صحرایا کیا ہے؟

یہ مرا گھر تو نہیں تھا کہ جو دیراں ہوتا
آہی جاتا ہے بڑے وقت میں اپنوں کو خیال

کوئی ہوتا جو سہارا بھلی، تو پیراں ہوتا
کھیل ہو ہستی موہوم، مگر ہے دلچسپ
جو یہاں بیٹھ گیا آکے، وہ مشکل ملے کھٹا
سہ سفر ہو کوئی اقتاد تو پیش آنے کو
کہ قدم آج الجھتا ہوا منزل سے اٹھا
جی چرائے کی نہیں شرط، دل زار! یہاں
دنخ اٹھانے ہی کی ٹھہری ہو، تو پھر ملے کھٹا
یہ مقام حسن کب، تھا کہ وفا شعار ہوتا
کوئی کارِ خیر ہوتا، تو گناہ گار ہوتا
ترایتیر نیم کش، ہو مرے شوق کی ترازو
اسے کون تول دیتا جو جگر کے پار ہوتا
جسے ذرہ کہہ رہے ہو، یہی اک شرار ہوتا
اسے پابہ گل نہ رکھتا جو خیال تیرہ سختی
تھی جہاں میری مصیبت خاطر مشکل پسند
کوئی آسانیاں کہہ دوں کہ آساں ہو گئی
جل اٹھے تیری گاہِ کرم سے سینے کے درخ
میں زچہ شمعیں بجھا دی تھیں، فرداں ہو گئی
تھا جنوں پرور مرا ذوقِ تن آرائی مجھے
بے سروسامانیاں خود ساز و ساماں ہو گئی
ہو گئی دیوانگی تکمیل اسبابِ خرد
گالیاں مجذوب کی اسرارِ عرفاں ہو گئی

ہماری داستاں کے ساتھ رودادِ جہاں کیوں ہو

جہاں ہم ہوں، ہمیں تم ہوں؛ زمیں کیوں آساں کیوں

بھروسہ عالم اسباب پر کس نے بتایا ہے

چمن کے چار تنکوں میں قریب آشیاں کیوں

افسردہ خاطری دل محزون کو لے مری
کھیتے ہوئے چراغ نے گھر کو حبلادیا

اٹھ گئے ہم درمیاں سے، اٹھ گیا ہم سے حجاب

وہ گئے ہم اس کے ہو کر، رہ گیا پردا، نہ ہم

دولتِ دل کیا ہے، جا کر اہلِ دل سے پوچھیے
 مل تھا اپنا بھی کچھ، جانے مگر رکھنا نہ ہم
 رنجِ رسوائی نہیں، دنیا ہے رسوائی کا گھر
 ہیں سبھی رسوا، تو یوں سمجھو، نہ تم رسوا نہ ہم
 فائدہ کیا، رہتی دنیا تک اگر کوئی رہا
 یہ تو ظاہر ہے کہ رہنے کے لیے، دنیا نہ ہم
 کوا گئی اہلِ ہوس کی وضع، اہلِ عشق کو
 بات کس کی رہ گئی کوئی، عدو سچا نہ ہم
 ہم کہاں ہونگے دعاؤں میں اثر ہونے تک
 کچھ نہ کچھ ہو تو رہیگا، مگر ہونے تک؟
 خود ہو کے کچھ خدا سے بھی، مرد خدا نہ مانگ
 رسم دعا یہ ہے کہ دعاے دعا نہ مانگ
 میں اپنی بے زری کی ندامت کو کیا کہوں!
 تو اور شرمسار نہ کیا اے گدا! نہ مانگ
 اس خاکدانِ دہر میں، گھٹنا اگر ہے دم
 مقدور ہو تو آگ لگا دے، ہوا نہ مانگ
 رسم طلب میں کیا ہے، سمجھ کر اٹھا قدم
 آ، تجھ کو ہم بتائیں کہ کیا مانگ، کیا نہ مانگ
 خوگر ہو درو کا کہ یہی ہے علاجِ درد
 یہ کس کے بس کا روگ ہے، اس کی دوا نہ مانگ
 ملتی نہیں مراد، تو ناطق! خیال چھوڑ
 میری صلاح یہ ہے کہ تو روٹھ جا، نہ مانگ

الم منظر نگری محمد اسحق (مولانا)

قوم کے افغان تھے۔ ان کے جد اعلیٰ حسین خان پٹرانہ (ضلع منظرنگر) کے رہنے والے تھے۔ یہ دیہات ان نواح میں افغانوں کی مشہور بستی ہے، اور یہاں کے کھنڈرات افغانوں کی گزشتہ عظمت کی داستان زبان حال سے کہہ رہے ہیں۔ الم کے والد مولانا خان الہ دیا شاہ صاحب، سید منظر علی شاہ ایرانی سے بیعت کرنے کے بعد تارک دنیا ہو گئے تھے۔ جس پر ان کے نام میں لفظ "شاہ" کا اضافہ دال ہے۔

خان الہ دیا شاہ صاحب کے ایک پیر بھائی تھے، سید صفدر علی ایرانی، علوم متداولہ پر ان کی نظر وسیع اور قدرت مسلمہ تھی۔ چنانچہ الم جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو سید صفدر علی نے ان کی بسم اللہ کرائی۔ انھوں نے دنیات میں قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ، اور ادب عربی کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد علم نجوم کی طرف توجہ ہوئی، تو اس میں بھی دستگاہ کامل حاصل کی۔ جب عربی فارسی پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا، تو پنجاب اور الہ آباد یونیورسٹیوں سے السنہ شرقیہ کے مختلف امتحانوں کی اسناد حاصل کیں۔ ساری عمر مدرسہ میں گزار دی۔ پہلے چندے ایڈورٹ کا

میں رہے اور ۱۹۴۳ء میں وہاں سے متعفی ہو کر اسلامیہ ہائی اسکول مظفر آباد میں آگئے، یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

نجوم سے متعلق ان کی معلومات کی وسعت کا اندازہ ان مضامین سے ہوتا ہے، جو ان کے قلم سے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ مومن کے بعد اردو شعراء کے حلقے میں الم سے بڑا مقہم کم ہی ہوا ہوگا۔ اس کی شہادت ان کا تیار کردہ حضرت رسول کریم صلعم کا زائچہ ہے، جس میں انھوں نے حیات مبارکہ سے متعلق تفصیلی احکام لگائے ہیں۔ علم نجوم سے متعلق انھوں نے ایک مفصل کتاب بھی لکھی تھی، یہ غیر مطبوعہ رہ گئی۔

وہ سیما بابر آبادی کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں تھے، اور خود استاد کو ان کے علم اور استعداد پر فخر تھا۔ نظمیں ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں: سلسبیل، گورنمنٹ سدرہ وطوبی، معرکہ بلا (تاریخ دادب ۱۹۶۳ء لاہور)، گیتا منظوم، موخر الذکر ہی پریوپی حکومت کی طرف سے ان کے لیے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ علیم اختر منظر نگری انھیں کے شاگرد ہیں، اگرچہ خود انھیں کے ایما پر شروع میں انھوں نے سیما بابر مرحوم سے بھی اپنی چند غزلوں پر اصلاح لی تھی۔ اپنی شعر گوئی کے آغاز میں پروفیسر راجندر ناتھ شیدا نے بھی ان سے مشورہ کیا تھا۔ جب سیما بابر کی صحت زندگی کے آخری ایام میں بہت سقیم ہو گئی، تو انھوں نے اپنے نو مشق شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے فارغ الاصلاح تلامذہ سے رجوع کریں، الم بھی ان اصحاب میں شامل تھے۔ اسی زمانے میں الطافی مشہدی اور احمد ندیم قاسمی نے الم سے بھی مشورہ کیا۔ گورنمنٹ کالج، جہلم (مغربی پاکستان) کے پرنسپل سید صفدر حسین صفدر نے بھی شروع میں الم سے اصلاح لی تھی۔

انہیں پراسٹیٹ گلینڈ کی تکلیف تھی۔ اس کے لیے عملِ جراحی ہوا، لیکن ناکام رہا اور اسی سے ان کا ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء کو منظرِ نگہ میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت عمر تقریباً ستر سال کی تھی۔ منظرِ نگہ ہی میں ان کے ذاتی مکان (فردوسِ نرل) کے شمال کی طرف کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

شورشِ ہستی کے ضامنِ حسن کے جلوے بھی تھے

عشق تنہا باعثِ نہنگانہ محفل نہ تھا

گرا ہے خاک پہ مژگاں سے، دیکھو وہ آسنو کہ جس کا منزلِ دل میں قیام ہونہ سکا
ازل کے دن سے بیاں کر رہا ہوں میں پھر فسانہٴ غمِ ہستی متا م ہونہ سکا
نوازشیں تو بہت کیں نگاہِ ساقی نے مگر ہمیں سے کبھی شغلِ جام ہونہ سکا
الم ہمیشہ رہا مقتدرِ پیرِ مغاں جی بھی تو اہلِ حرم کا امام ہونہ سکا
چشمِ زدن میں کج دیا زندگی جہاں کا راز دیکھا بھی تو نے بے خبر اقصائے سر نے کیا کیا
سینکڑوں عالم بہ فیضِ عشق ہیں پیشِ نظر پھر بھی تیری بزمِ نگاہِ ناز میں تنہا ہوں میں
میں نے یکھے ہیں نکاتِ فنِ الم! سیما ہے جانتے ہیں سب کہ مرزا داغ کا پلوتا ہوں میں

حقیقتِ آشنائے گلستاں فصلِ بہاراں میں

ہجومِ رنگِ دلو کو برقِ کاشانہ سمجھتے ہیں

کسی دن جس کے شعلے خرمنِ ہستی کو پھونکنگے

اسی بجلی کو ہم شمعِ طرب خانہ سمجھتے ہیں

چھپا لیتے ہیں ہرزخمِ جگر کو فصلِ گل میں بھی

چمن میں پھولِ منشاے غمِ نہراں سمجھتے ہیں

کچھ ایسی بھی آزادیاں ہیں کہ جن کی فضاؤں میں پھیلا ہے دامِ اسیری
بڑے پرخطر ہیں وہ گوشے چمن کے، جو کنجِ قفس کی حدوں سے ملے ہیں

کسی گلشن میں یا صحرائیں جا بیٹھینگے دیوانے

بے تسکینِ وحشت آپ ہی کی انجمن کیوں ہو

مجھے احساں نہیں منظور، اس دستورِ گلشن کا

فروزاں آتشِ گل سے مری شاخِ چمن کیوں ہو

ہر رگِ دل میں کھٹکتے ہیں المِ بادِ وچکایں درد کے ساتھ، نگاہِ غلط انداز کھلی ہے

کسی بہارِ گزشتہ کی یادگار تو ہے ہمارا باغِ تمنا خزاں رسیدہ سہی

وہ بھی ایک جلوہ بے پردہ کی نمود اہلِ نگاہ پر دہ حائل کہیں جسے

یہ ساغریں ہر گلِ بادہِ گلفام آتا ہے بہار آتی ہے یا گلشن میں دورِ جام آتا ہے

کم ہیں سامانِ طرب میرے، کم ہی سہی جنگ و نغمہ نہ سہی، نالہ و ماتم ہی سہی

ہے تو اک سلسلہ دعوتِ فرگاں قائمِ خونِ نشانیِ رگِ زخمِ جگر کم ہی سہی

حوصلے دل کے بڑھانے کے لیے شامِ قیامتِ ہمیشہ! تذکرہ گیسوئے برہم ہی سہی

سینے میں کھٹکتی رہتی ہے، نشر کی طرح، الفت کی خلش

یہ پھیانس یوں ہی رفتہ رفتہ پیوستِ جگر ہو جاتی ہے

خوابِ عیشِ زمانہ! تجھے خبر ہی نہیں جو زندگی کو سنبھالے، وہ قوتِ غم ہے

فیضِ ساقی سے نہیں محروم، بادہ کش کوئی

میکدے میں مل ہی جاتی ہے، اگر چہ کم سہی

کھینچ کے ساقی! جو دل سے آتی ہے، وہ کچھ اور ہے

تیرے شیشے میں جواب کوثر و زمرم سہی

اتصالِ گاہِ وفا میں ہے یہ کیسی خاموشی

اب حریفِ غم نہیں ہوتا کوئی، تو ہم سہی

ازل سے ان کے سنگِ درد کو بھی جس کی تمنا ہے

لیے ہے ایک وہ سجدہ، ابھی ذوقِ حبس میرا

پھولوں کو دیکھیے نہ ستاروں کو دیکھیے
ان میں کسی کے شوخ اشاروں کو دیکھیے
چلیے تو سیرِ لالہ و گل کو بہار میں
اک دن تو اپنے سینہ فکاروں کو دیکھیے
اللہ ہے! یہ بارشِ مستی رنگِ دیو
کس کا شباب ہے یہ بہاروں کو دیکھیے
عشقِ بتاں کو بہرِ خدا چھوڑے الم!
کب تک جہاں میں ہر نگاروں کو دیکھیے

دعوتِ جوش

(۱)

شمعِ حیاتِ شوق اب جلوہ طراز ہی نہیں
محلِ سوز و ساز میں کیف و گداز ہی نہیں
وقت نہیں ہے ساز کا رُنا و نیا تکے لیے
مختم ہے ذوقِ غزلوی زلفِ ایا ز شہنشاہ
کوئی نہیں ہے مشغلہ دستِ جنوں کے دھڑکنے
حبیبِ خرد ہے خود ہی چاکِ اُمین ز شہنشاہ
آئندہ بہار سے دل کو تسلیاں ہوں کیا!
اس لیے بڑھ گئی ہیں اور اہلِ نظر کی چٹریں
شدتِ درد و غم کے بعد دل کو سکون کہاں نصیب
بزمِ سکندری میں آج، آئینہ سازی نہیں
جوشِ نیاز کا جواب گر می تا نہ ہی نہیں

نہ عم غلط کا ہے اسیر جس کو بھی دیکھا ہوں
شیخ ہو یا کہ برہمن واقفِ راز ہی نہیں

(۲)

باعثِ انقلاب ہے گردشِ چرخِ چٹری
باقی رہی نہ حسن کی طرزِ ادا میں دلبری
چھایا ہوا ہے رنگِ عید کی صبح و شام پہ
گیت میں سازِ عیش کے گونج رہی ہے بزمِ
اس کی خبر نہیں ابھی مسلمِ خفتہ بخت کو
حسنِ عمل سے زندگی پاتی ہے اوجِ شہری

عید ہے ان کی جو کہ ہیں خلق و دفا سے بہرہ
جن کے کمال عجز سے دستی ہے شانِ قمیصری
خلقِ خدا کی خدمتیں کرتے ہیں جو کہ وقت پر
وہی تو ہیں مقلدِ رسم و ردہ چمپیری
ان کی جنہیں ہے سجدہ ریز عشق کی بارگاہ میں
ان کی خودی کو مل گیا، عز و وقار بوزدی

(۳)

ا کہ جگائیں خواب سے جذبہ کامیاب کو
عزمِ جواں سے موڑ دیں بازوئے انقلاب کو
ظلمتِ زندگی ہو دوزخس کی تجلیات سے
ایسا جمال بخش دیں گرمی آفتاب کو
ذروں کی نبضِ سست میں جاگ اٹھے حیاتِ شوق
نغموں کا جوش لے اڑے نغمہ گرِ رباب کو
فطرتِ سازِ عشق میں ایسی نوا ہو موجزن
ضبط و سکون کی راحت دے جو ہر اضطراب کو
مرکزِ اہل ہوش کی جا کے بلند یوں سے
مطلعِ عید پر ہم آج، لائیں اس آفتاب کو
جس نے صفا کے اوج سے، ہو کے طلوعِ وقت
لفظ و بیاں میں رکھ دیا مقصدِ الکتاب کو

انتباہ

باغیاں جب تک کہ ہے بیگانہ رازِ چین
ہو نہیں سکتا کسی صورت میں دسانِ چین
جس کنارے میں نہیں محفوظ اعجازِ خودی
وہ حریفِ موجِ طوفاں ہو نہیں سکتا کبھی
وہ جنوں شوق جو ہمارا سوزِ دل نہیں
شورشِ آوارگی ہے رونقِ محفل نہیں

سازِ بے سوز و وفا کے گیت کو سمجھ گیا کون
جلوۂ بے فیض کی تنویر کو دیکھ گیا کون

دیکھ ان کی سمت بھی، اے مالکِ سر و زمین!
جن کی چو لائنگاہ، ہے مدت سے پہنچائے چمن

سہر و فادارِ گلستاں مستحقِ داد ہے

قدرِ آزادی ہے لازم، تو اگر آزاد ہے

ہو اختوت کا پجاری، تو ہے گر مردِ وفا

ورنہ سن لے، قادرِ مطلق کا ہے یہ فیصلہ

جس سے وابستہ نہیں انسانیت کا احترام

خود بخود ہو جائیگا اک دن فنا وہ انتظام

ماظر کا کوروی، مشیر احمد علوی

ان کے والد مرحوم امیر احمد علوی بھی مشہور اور کامیاب لکھنے والے تھے، گویا تصنیف و
الیف کا شوق اور ملکہ ورثے میں پایا۔

نہوں نے اپنی سوانح عمری "آشفۃ سرى میری" میں لکھا ہے کہ میری ولادت ناخیا
رگڑھی (کا کوری) میں ۲۶ محرم ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) کو ہوئی۔ تعلیم علی گڑھ کالج
ور یونیورسٹی میں پائی۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی کتابوں اور تحریروں میں
ملی گڑھ کا ذکر بھی بہت ہے اور تعریف بھی؛ دراصل انھیں اپنی مادر علمی سے عشق
تھا اور اسی نے ان کی علی گڑھ شہر، یہاں کے احوال، اور باشندوں سے دلچسپی اور
محبت کو المضاء عرف کر دیا۔

وہ نظم و نثر دونوں پر قادر تھے جب تک قواعد درست رہے، قلم ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔
بب صحت کمزور ہو گئی اور بنیائی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا، تو دوسروں سے لکھواتے؟
تو دہلتے جاتے اور کوئی شخص اسے قلمبند کر دیتا۔ معلومات اور مضامین اتنا وسیع
تھا کہ وہ کسی موضوع میں بند نہیں رہتے۔ اگر مضمون علمی اور تحقیقی ہوتا، جب بھی

وہ حافظے کی مدد سے اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات بکھوایتے اور کسی حوالے کی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

آخر عمر میں مذہب سے بہت شغف ہو گیا تھا۔ صوم و صلوات اور اذکار کے بہت پابند ہو گئے تھے۔ نجوم و جفر میں بھی خوب دستگاہ تھی۔ اور یہ بھی انھیں اپنے والد سے وراثہ ملی۔ اکثر حکم ایسا درست ہوتا کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ لوگوں کو تعویذ بھی دیتے تھے اور ہر طرح کا مشورہ بھی۔

خوش اخلاق، خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے، دعوتیں کھلانے کے بچہ شبوین۔ حال آنکہ آخری زمانے میں مالی حالات بہت ستیم ہو گئی تھی، جب بھی ان کی ضیافت کرنے کی عادت نہ گئی۔

بدقسمتی سے کینسر کا جان لیوا مرض لاحق ہو گیا، لیکن ان کے صبر و شکر کے قربان جانیے کہ کبھی اُن تک نہیں کی، اور نہ دیکھا گیا ہے کہ اس عارضے کے مریض درد سے چیخیں مارا کرتے ہیں۔

اسی میں ۷ جولائی ۱۹۶۹ء صبح کے وقت لکھنؤ میں جاں بحق ہو گئے۔ لاش کا کوری گئی اور وہیں تاجیکہ شریف کے قبرستان میں آخری خواب گاہ نصیب ہوئی۔

ثمر بسوانی نے تاریخ کہی :-

جہانِ علم دفن مفارقت سے غم فرا ہے آج کوئی رورہا ہے، کوئی ہاتھ لہا ہے آج
بپا ہوا ہے حشر ایک رحلتِ مشیر سے ہائے، کیا ثمر! وہ محسنِ دباٹھا ہے آج

(۱۳۸۹)

جہانی یادگار چار بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ ان میں سے دو لڑکے اٹکستان میں ہیں اور ایک پاکستان میں، چوتھے جناب احمد ابراہیم علوی روزنامہ قومی آواز میں ملازم ہیں۔

تینوں لڑکیاں بھی اپنے گھر بار والی اور خوش و خرم ہیں۔ ان کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں سے چند زیادہ اہم یہ ہیں:

(۱) ناول: چند رکلا؛ سنہرا حلقہ؛ ستاروں سے آگے۔ (۲) تنقید: حالی کا نظریہ شاعری؛ تنقیدی شعور؛ جائزے، مطالعہء حالی؛ مطالعہء شبلی؛ مطالعہء انیس۔ (۳) تذکرہ: اردو کے ہندو ادیب۔ (۴) اسلامیات: ولی اللہی تحریک وغیرہ۔

عندلیب شادانی، وجاہت حسین

سنبھل (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے ایک صاحب اشتیاق حسین تھے۔ وہ چمڑے اور جوتوں کی بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ اصلاً صدیقی شیخ تھے۔ ان کا نکاح کوچہ قاضی، رامپور کے ٹھانوں میں ہوا، اور اپنی سسرال کے رواج کے مطابق انھوں نے بحیثیت خانہ داماد اپنی زندگی رامپور میں بسر کر دی۔ یہیں ان کے ہاں وجاہت (عندلیب شادانی) پیدا ہوئے۔ ان کی دسویں درجے کی سرکاری سند پرتاریخ ولادت یکم مارچ ۱۹۰۴ء ثبت ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، وہ اس سے بہت بڑے تھے۔ سرکاری ملازمت میں اس طرح کی غلط بیابیاں ہو جاتی ہیں۔ ان کا سال ولادت غالباً ۱۸۹۷ء تھا۔ مدرسہ عالیہ رامپور میں تعلیم ہوئی، جہاں ان دنوں سید اولاد حسین شادان بلگرامی کی بدولت چشمہ فیض جاری تھا۔ انھیں کے فیضان کا نتیجہ تھا کہ عندلیب نے شادانی کی نسبت اختیار کی اور وہ بھی ایسی کہ جزوِ علم ہو گئی۔

مدرسہ عالیہ کی تعلیم کے دوران میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحاناتِ منشی عالم (فارسی)

اور مولوی عالم (عربی) کی اسناد حاصل کیں۔ دسویں درجے میں تھے کہ ایک بدعنوانی کے باعث مدرسے سے نکال دیے گئے۔ اب یہ لاہور چلے گئے۔ یہاں انھوں نے بی اے تک کے امتحانات پرائیوٹ حیثیت میں پاس کیے (۱۹۲۵ء) انھوں نے ملازمت بہت کم عمری میں شروع کی۔ عربی فارسی کی تعلیم تو مکمل کر ہی چکے تھے اور اس زمانے میں پنجاب میں ہر تعلیمی درسگاہ میں یہ زبانیں پڑھائی جاتی تھیں، اس لیے مدرسہ کی ملازمت کے حصول میں چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ پہلے ۱۹۲۱ء میں چند ماہ خالصہ ہائی اسکول، گردوالہ (ضلع ہوشیار پور) میں رہے، اور اس کے بعد اسلامیہ اسکول بریلی چلے آئے۔ ۱۹۲۴ء میں اسی حیثیت سے ایچ پی کانج لاہور میں ملازمت مل گئی، جہاں والیان ریاست اور امار کے بچوں کی تعلیم کا خاص انتظام تھا۔ اسی زمانے میں ان کی نواب دو جانہ (ضلع روستک) سے شناسائی ہو گئی اور وہ انھیں اپنے ولی عہد کا اتالیق بنا کر اپنے ہاں لے گئے۔ دو جانہ میں کئی دوبرس رہے اور ۱۹۲۶ء میں وہاں سے دلی آ گئے، جہاں منہد کانج میں اردو فارسی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔

دو جانہ کے قیام کے زمانے سے متعلق ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ غالب کے احباب میں محمد تفضل اللہ خان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کے فارسی اور اردو کے مجموعوں میں ان کے نام کے خطوط شامل ہیں۔ منشی تفضل اللہ خان نے غالب کے دیوان فارسی کا ایک نسخہ اپنے لیے ۱۲۷۰ھ میں لکھوایا تھا۔ بعد کو یہ نسخہ کسی طرح دو جانہ ریاست کے کتاب خانے میں پہنچ گیا، اور جس زمانے میں عندلیب شادانی وہاں گئے ہیں، وہیں موجود تھا۔ اپنے منصب کے باعث پورا اکتلاخانہ ان کے تصرف میں تھا۔ انھوں نے یہ خطی نسخہ دیکھا، تو ان کا حجبی للجا گیا۔ اس کے ساتھ غالب کی ایک رنگین تصویر بھی تھی۔ بعد کو ان سے یہ تصویر پرینڈنسی کانج کلکتہ

کے فارسی کے پروفیسر محفوظ الحق مرحوم نے لے لی؛ وہ غالباً اس کا عکس تیار کروانا چاہتے تھے۔ کرنا خدا کا کیا ہو کہ اس کے جلد بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ وصیت کر گئے تھے کہ میرا ذخیرہ کتب وغیرہ خدائے بخش اور ٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ کو دے دیا جائے۔ چنانچہ ان کتابوں کے ساتھ یہ تصویر بھی پٹنہ پہنچ گئی اور آج بھی وہاں موجود ہے۔ شادانی مرحوم جب ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہو گئے، تو انھوں نے دیوان کا خطی نسخہ یونیورسٹی کتاب خانے کی نذر کر دیا۔ اس طرح گویا یہ بھی محفوظ ہو گیا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

۱۹۲۸ء میں شادانی صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ یہیں سے وہ ۱۹۳۱ء میں لندن گئے، جہاں سے انھوں نے ہندستان کے مسلمان مؤرخ کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی۔ انھوں نے مسلمان مؤرخوں کی فارسی تصنیفات، انشا، اسلوب وغیرہ پر بحث کی ہے، ان کی تاریخی حیثیت سے اعتنا نہیں کیا۔ گویا موضوع فارسی زبان تک محدود رہا، تاریخ سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ وہ مئی ۱۹۶۹ء تک شعبہ فارسی دہلی سے متعلق رہے۔ اور اسی ہینے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ اب وہ نقل مکان کر کے رامپور آنے کی تیاریاں میں مصروف تھے کہ خالق حقیقی کا بلا دا آگیا۔ ان پر دل کا دورہ پڑا جس پر اسپتال میں داخل ہو گئے۔ یہیں ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو عصر سے کچھ پہلے راہ گراے عالم جاودانی ہوئے۔

انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔ جو کچھ انھوں نے پیچھے چھوڑا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ کے اہل تھے۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ایک زمانے میں وہ پریم بھاری کے فرضی نام سے افسانے بھی لکھتے رہے۔ مطبوعہ

سرمایہ یہ ہے !

نظم : نشاطِ رفتہ (رغزلیات و منظومات) (لاہور ۱۹۵۱ء)

تحقیق : تحقیقات (۱، تحقیقی مضامین)

تنقید : اردو غزلگوئی اور دورِ حاضر پر یہ مضامین پہلے سلسلہ وار ماہنامہ ساقی، دہلی میں چھپے تھے، پیامِ اقبال (خطبہٴ صدارت یومِ اقبال - ۱۹۵۰ء)

افسانہ : سچی کہانیاں، دینش

ناول : چھوٹا خدا - (دو طویل افسانے، چھوٹا خدا اور بے روزگار)

دورانِ قیام لاہور انھوں نے بعض نصابی کتابوں کے ترجمے بھی تیار کیے تھے مثلاً انشای ابو الفضل (دفتر اول)، چہار مقالہ نظامی سمرقندی (مقالہ اول)، رباعیات باباطاہریان، قصائدِ قافی، نقشِ بدیع، جدید فارسی زبان کا لغت بھی اسی زمانے کی تالیف ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۸ء میں ایک روزنامہ مشرقی پاکستان، جاری کیا تھا۔ چار سال بعد ماہنامہ اخاد، نکال لایکین دونوں مالی مشکلات کا شکار ہو گئے۔ ان کے اٹھ جانے سے مشرقی پاکستان میں بزمِ اردو کی ایک ایسی شمعِ فروزاں گل ہو گئی جس نے زندگی بھر اپنی علم کی روشنی سے دلوں کو منور کیا تھا۔

پہلے نشاطِ رفتہ کے چند شعر سینے :

گزارِی تھیں خوشی کی چند گھڑیاں انھیں کی یاد میری زندگی ہے

بتیغِ ادرتِ ہا ہوں اور کچھ نہیں معلوم دل میں اک تمنا ہے، یہ خیر نہیں، کیا ہو

محبت میں بھی سب کا حال ایسا تو نہیں تھا کہ دل آتشِ کدہ بن جائے، آنکھوں سے ہوتے ہو

جب کسی سے کوئی پیمانِ وفا کرتا ہے کانپ اٹھتا ہوں کہ میرا ہی سا انجام نہ ہو

جو نترے، کوئی مرے پاس کہاں ہوتا ہو! اپنے سایے پہ بھی تیرا ہی گماں ہوتا ہے

رات اک بزم میں تھے جو روحِ جفا کے شکوے دل بھر رہا ہے جو تری ہر و وفا یاد آئی

چاندنی، اور اداس تنہائی تم ہو کس حال میں، خدا جانے!
 تم پاس ہو، اور دل کا یہ عالم، تو بہ! یہ حال تو جب دور تھے، جب بھی نہ ہوا تھا
 چاندنی، سب سے، لب جو، لوگ سحرِ حلاط تم اگر ہمراہ ہو تیں، ہم بھی سنتے بولتے
 چاندنی اسرہ، گل بے رنگ و بو، نغمے اداس
 اک ترے جانے سے، کیا تبادلوں، کیا کیا ہو گیا

ہاں، کیا گھر ریگی اس بربادِ الفت پر جسے
 دردِ دل کہتا ہو، اور یار نہ ہو تقریب کا
 بنی کبھی نہ حسن و محبت کی داستاں تاکا میوں نے بات کا افسانہ کر دیا
 زمانے کی طرح اے کاش وہ بھی بی وفا ہوتا

کہ اب اس کی وفا میں یاد آ کر خوں رلاتی ہیں
 اللہ دے، دیوانگی شوق کا عالم وعدہ نہیں، اور جانبِ درد دیکھ رہا ہوں
 ایک شعلہ ہے کہ سینے میں پکنا ہے مدام شاید اتنا ہی محبت کا صلہ ہوتا ہے
 بہت مختصر تھے محبت کے لمحے مگر پھر بھی ہر لمحہ اک زندگی تھا

ناداں سہی، پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
 خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے
 کہتے تھے تم سے چھوٹ کے کیونکر جیئیں گے ہم!
 جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے، تقدیر جو دکھائے

دل آج بیحد گھبرا رہا ہے اے دوست! ان کا کچھ تذکرہ کر
 دل کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے جی چاہتا ہے رونے کو اکثر
 دل کا یہ حال کیا ہے غم تنہائی نے کہ ملے صحبت دشمن، تو بہل جاتا ہے
 اب کچھ ایسا کلام ملاحظہ ہو جو ان کے مطبوعہ مجموعہ نظم کے بعد کا کہا ہوا ہے:- یہاں

پوری پوری غزلیں اس لیے دی جا رہی ہیں، تاکہ ایک تو یہ محفوظ ہو جائیں؛ دوسرے
اس لیے بھی کہ اس طرح ان کا رنگ سخن پورے طور پر سامنے آجائیگا :-

بڑھ کے جب گیسوئے شب تابا کر آتے ہیں اور چہرے مری یادوں کے نکھرتے ہیں
دوستو! تم پہ بھی گزرا ہے کبھی یہ عالم؟
کھل اٹھے پھول، تاروں کی ضیا تیز ہوئی
چاند پھر لوٹ کے اس بام تک آئے کہ نہ آئے
پیکرِ ناز کبھی ہو، کبھی تصویرِ نیا نہ
ہر نے چھین لیا ماہ سے اپنا پر تو
یک بیک رات کچھ اس طرح تری یاد آئی
اب بھی آ جاؤ کہ آنکھوں میں ضیا باقی ہے
کشتِ ثقل سے بڑھ کر ہے محبت کی کشت
ہم ایسوں کے لیے یوں بھی قیامت ہو بہا
اس نے بھیجا ہے مجھے میری محبت کا خرچ
خاک میں مل گیا میرا حسنِ گماں، خود فری کا اب کوئی پہلو کہاں
عہد و پیمان ترے کا غدی پھول ہیں، رنگ ہی رنگ ہے ان میں خوشبو کہاں
خواب کیوں کر کہوں، میں تو بیدار تھا اور اگر سچ ہے یہ سب تو کنوینکریا
اب تو آتا نہیں خود مجھے بھی یقین اس کے گیسو کہاں، میرے بازو کہاں
کون بد ذوق تھا جس نے تشبیہ دی چاند سے اس کے رونے دلا رام کو
چاند کے پاس وہ چشمِ جادو کہاں، چاند کے پاس وہ لعلِ دلجو کہاں
وہ غرورِ جوانی کی باتیں گئیں، وہ محبت کی بیدارِ راتیں گئیں
وقت کا سیل سب کو بہا لے گیا، اب نگاہِ تمنا میں جادو کہاں

یلتہ القدر کل میری تہائی تھی، آسمانوں سے جنت اتر آئی تھی
آج لیکن کسے اعتبار آئیگا، بالمش نا ازابیر بادو کہاں

کا مرد لیس بھی چھان مارا، مگر سحر و افسوں کا پایا نہ کوئی اثر
تیری آنکھوں میں ہے موہنی زفتہ گر بادرنہ بنگال میں اوجادو کہاں
اپنے دامن سے پونچھے وہ آنسو مرے بس ہیں در الفت کی مہرچہ

نقش بر آب ہے یہ تمتا نگر، اُس کا دامن کہاں میرے آنسو کہاں
ان میں صہیائے الفت پھیل چکی تھوئی، اُن میں وحشت سی وحشت بھل چکی
کیف الفت سے وحشت کو نسبت ہی کیا تیری آنکھیں کہاں چشم آہو کہاں

شب نیم غم کی تراوش، کبھی ایسی تو نہ تھی
دل میں کبھتی تھیں بہت چاند کی کرنیں لیکن
جذبِ اخلاص کا اعجاز ہے یا موح سرب
ترے جلوے تو وہی ہیں مگر اے ماہ تمام!
سجدے کرتی تھی نظر چاند کو پہلے بھی مگر
تو نے پہلے بھی مجھے روشنیاں دی تھیں مگر
نہ ٹھہر سکتی ہیں نظریں، نہ پلٹ سکتی ہیں
سمن اندامی و گل پریشانی، قہر پہ قہر

اب جو پایا ہے تراپار تو جی ڈرتا ہے

سحر و شام کی گردش، کبھی ایسی تو نہ تھی

شوق کی رات ہے، ناز کی رات ہے اور تقدیر سے چاندنی رات ہے

نغمہ ہے چاندنی، بادہ ہے چاندنی آج طوفانِ جذبات کی رات ہے

غملکہ پھر شبستانِ عشرت بنا چاند نکلا تو پھر چاندنی رات ہے

اک پہلی ہے بوجھ تو جانیں کہ ہاں
 خود ہی تگن لومری زبیت کی ساعتیں
 آج تم سے ملے کون سی رات ہے؟
 بزمِ انجم فقط رات کی رات ہے
 جو نہ آئیگی پھر یہ وہی رات ہے
 کیا خبر تھی کہ یہ آخری رات ہے
 دل سنبھلتا نہیں، اور اکھی رات ہے
 رات کل بھی تھی، اور آج بھی رات ہے
 زندگی اب فقط رات ہی رات ہے
 میری پلوں پہ تاروں بھری رات ہے

کتنی سنان و دیران داندہ گیں
 یہ وہی کل کی منہتی ہوئی رات ہے
 اگلی سی کہاں وہ رونقِ بزمِ سخن!
 حسرت ہیں، نہ اصغر ہیں، نہ فانی باقی
 کل ہم بھی نہ ہونگے، اے عزیزانِ وطن!
 رہ جائیگی بس ایک کہانی باقی

بنجود، عباس علی خان

ان کا خاندان پٹھانوں کا تھا لیکن ان لوگوں نے مدت سے لڑائی بھڑائی کا مشغلہ ترک کر کے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے والد رمضان علی خان، بھی مدرسہ پیشہ تھے۔ بنجود ۲ جولائی ۱۹۰۶ء کو قصہ قاضی کی سرانے (ضلع فیض آباد یوپی) میں پیدا ہوئے۔ بچپن وطن ہی میں گزرا۔ سن بمشکل بارہ برس کا ہو گا کہ ۱۹۱۸ء میں بھر بارہ برس، اپنے دادا کی معیت میں کلکتہ چلے گئے، جو تلاش روزگار میں وہاں گئے تھے۔ ابتدائی درجوں کی تعلیم وطن میں مکمل ہو چکی تھی؛ اب بڈل کے بعد سے آخر تک پوری تعلیم کلکتہ میں پائی۔ دسویں درجے میں امتیاز حاصل کرنے کے نتیجے میں دو سال کے لیے 'امیر کبیر وظیفہ' ملا۔ ۱۹۳۰ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ سے بی اے کا امتحان پاس کیا، تو فارسی (آنرڈ) میں نہ صرف درجہ اول پایا، بلکہ صوبے بھر میں اول آئے۔ یہی صورت دو سال بعد ایم اے میں رہی۔

ایسے کامیاب تعلیمی دور کے بعد ملازمت کی کیا کمی تھی! چنانچہ فوراً ہی کلکتہ مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ چندے بعد اپنی مادر علمی اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) میں

میں چلے گئے۔ سب سے آخر میں پرنسپل ڈیسنی کاٹھ، کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے رہے، زندگی کا آخری زمانہ یہیں گزرا۔

بڑے یار باش اور مجلسی آدمی تھے، دوستوں کے درمیان، جن کا حلقہ بہت وسیع تھا، خوب چمکتے تھے۔ ابتدائی زمانہ بہت عیسرا حالی اور تنگی ترشی میں بسر ہوا تھا، اس لیے طبیعت بہت جڑ رس ہو گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کلکتہ جیسے گراں شہر میں انھوں نے اپنی سلیقہ مندی سے ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں جج بھی کیا تھا۔

بہت دن سے تنفس کا عارضہ تھا۔ ۶ اگست ۱۹۶۹ء صبح کے وقت اس کا شدید دورہ پڑا۔ علاج کے لیے رحمت بائی اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ لیکن وہاں بھی کوئی افادہ نہیں ہوا۔ اسی دن آدھی رات سے کچھ پہلے ساڑھے گیارہ بجے انتقال ہو گیا۔ اگلے دن (۷ اگست) سہ پہر کو جنازہ اٹھا۔ تلجلا روڈ کے گوبرا قبرستان (۱۱) میں دفن ہوئے۔ پرویز شاہدی بھی یہیں مدفون ہیں۔ بنجود کی قبر ان کے بالکل ہی قریب بلکہ عین اس کے پائین کوئی گز بھر کے فاصلے پر ہے۔ وصیت کی تھی کہ میری قبر کچی رکھی جائے۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں یہی کیا گیا۔ اس سے قوی اندیشہ ہے کہ مردِ زمانہ سے اس کا نام و نشان تک مٹ جائیگا۔ لیکن یہ بھی وہم اور خام خیالی ہے۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے۔ ان کے خواجہ تاش جمل منظری نے ایک رباعی میں ہجری تاریخ کہی ہے:

بزمِ احباب کی وہ زینت نہ رہا وہ وارثِ مسندِ صدارت نہ رہا
بیرونِ نقی بزمِ پیرِ مرگ کہتی ہے کہ "جانشینِ وحشت نہ رہا"
(۱۳۸۹ھ)

اگرچہ انھوں نے تفنناً چند نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن ہے یہ کہ وہ غزل کے شاعر تھے۔ ان کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں (۱)، مطالعہ قدرت (کلکتہ ۱۹۳۵ء) یہ دوسری کتاب ہے جس میں

بچوں کے لیے مختلف معلوماتی مضامین ہیں (۲) جام بخودی (کلکتہ ۱۹۴۶) کلام کا مجموعہ ہے۔ بعد کا کوئی ربع صدی کا ذخیرہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ کچھ نثری مضامین بھی ہیں جو مختلف رسائل میں منتشر پڑے ہیں۔ مطبوعہ کلام میں غزلیات، منظومات، نعتیہ کلام اور جارج پنجم کی مدح میں قصیدہ تک ہے۔

کلام پر رضا علی وحشت مرحوم (دف جولائی ۱۹۵۶ء) سے اصلاح لی۔ اور انھیں سے غالب سے عقیدت بھی ورثے میں پائی، کلام غالب کے عاشق تھے۔ لکھتے ہیں،

کلام حضرت وحشت پسند ہے، بخود!

کمال حضرت غالب کو مانتا ہوں میں

جس طرح وحشت سے بہت لوگوں نے فیض پایا، اسی طرح بخود کے طفیل اس شمع سے کئی اور شمعیں روشن ہوئیں کلکتہ میں ان کے شاگردوں کا اچھا بڑا حلقہ موجود ہے خدا نے انھیں قابل اور نیک جسمانی اولاد سے بھی نوازا۔ چار صاحبزادے اپنی یادگاہ چھوڑے ہیں۔ انھوں نے سب کو معقول تعلیم دلائی۔ سب سے بڑے لڑکے جناب اختر حسن خان، ایم ایس سی، سینٹ زیویر کالج، کلکتہ میں سائنس پڑھاتے ہیں۔

پہلے چند شعر ملاحظہ ہوں، جو جام بخودی سے بعد کا کلام ہے:

کسی سے عشق کرنا اور اس کو یا خبر کرنا ہے اپنے مطلب دشوار کو دشوار تر کرنا

نزع کی سختی بڑھی، ان کو پشیاں دیکھ کر موت مشکل ہو گئی، جینے کا ساماں دیکھ کر

بدل سکا نہ زمانے کے ساتھ ہی افسوس! بدل گئی ہے نگہ اس لیے زمانے کی

الگ ہو اختر سے یہ کچھ کر میں اپنی منزل پہ جا رہا ہوں

آپ کیے، مگر خیال رہے بات پھر لوٹ کر نہیں آتی

کون کس کا ہے، کون سنتا ہے کس سے کس کا گلہ کرے کوئی

موت وہ مانگے جو لذت کش بیدار نہیں ناخن غم کا بدل، تیشہ، فریاد نہیں

آئینہ بن کے تری بزم کی زینت تو ہوا کچھ تو کام آیا، مجھے دیکھ کے حیراں ہونا
تعب کیا، اگر مجھ کو محبت پھر حواں کر دے جھلک ہے حسن یوسف کی زینجا کی جوانی میں
دل آسنو کی دو بوندوں سے کچھ ہلکا سا ہو جاتا ہے

اب اس سے زیادہ اور اُجالا ٹوٹے تارے کیا کرتے!
نہ سنگ میل نہ نقش قدم، اندھیرا ہے تری تلاش نے گم کر دیا کہاں مجھ کو
چمک کر رنگ پر آنا، یکایک پھر اجڑ جانا تمنا کی ہیں تصویریں، یہ آنے کی دہ جائے کی
کوشش ہے عبث، تدبیر غلط، فطرت کا بدلنا ناممکن

جو ہوتا ہے، وہ ہونا تھا، جو ہو گا، اس کو ہونا ہے
آخر میں چند شعر اور دیکھیے، جوان کے مطبوعہ مجموعے جام بخودی سے ماخوذ ہیں
بخود پڑا تھا در پہ، تو پوچھی نہ بات بھی اب حال پوچھتے ہیں غریب الدیار کا
ہزلو الہوس پہ حیف، ستم ہو گیا ردا جنس وفا کو آپ نے ارزاں بنا دیا
بخود ہمارے دل میں بھی کیا کیا خیال تھے سب کو فلک نے خواب پریشاں بنا دیا
یہ شان بے نیازی ہے، خدا معلوم ہوتا ہے

خدا معلوم، کیا ہوتا، اگر وہ بت خدا ہوتا!
اگرچہ عہد وفا کا نہ اعتبار آیا بہت ہے یہ بھی کہ دل کو تو کچھ قرار آیا
بخود کہاں ہیں اگلی بہاریں جنوں کی جب تھا تنگ ہم سے پیڑیں اور پیڑیں سے ہم
جب آئے منزل الفت، اپٹک دے بوجھ حکمت کا

کہ لذت ہے محبت کی، فریب حسن کھانے میں
نکاتِ علم و فن سارے یہاں اوہام باطل ہیں

نہیں کچھ فائدہ ان مسئلوں پر سر کھپانے میں
بصد سرمایہ دانش جبکا دے سر کو قدموں پر
بصد بندار خود داری اور سوا بن زمانے میں
۱۳۵

بتکدے سے چھوٹ کر ایسا ہوا بے خانماں جیسے زیرِ آسماں میرا خدا کوئی نہیں
 جان کر بخود ہوا خود دشمن اپنی جان کا پھر گلہ کیوں دوستوں سے ہے مرا کوئی نہیں
 مرے خیال نے خلوت کو کر دیا محفل تری نگاہ نے خلوت بنا یا محفل کو
 کہاں سے آئی یہ حیرت نگاہ بخود میں کہ اس کو دیکھ کے سکتے ہے اہل محفل کو
 وہ ہر باں نہیں، تو کوئی ہر باں نہیں کیا کم ہے یہ زمیں جی، اگر آسماں نہ ہو
 ان کو منظور خود عنائی تھی چھپر تھی ایک لن ترانی بھی
 ہم ان کو ہر باں پا کر، کہیں کیا آرزو دل کی نگاہ برق سے ظاہر ہے جو قسمت حاصل کی
 فقط اک پاسِ ذوقِ جستجو ہے، کیا کروں بخود! وگرنہ عافیت معلوم ہے مجھ کو بھی منزل کی
 جامِ گردش میں ہوا اور دور بھی مجھ تک پہنچے کبھی ایسی بھی تو اک گردشِ دوراں ہو جائے
 بخود سرحدِ ادراک و جنوں ہے، بخود! دو قدم اور کہ طے عالم امکاں ہو جائے
 چمن میں برق ہے، گلچیں ہے، اور ہے صیاد نفس میں پھر بھی تڑپتا ہے دل چمن کے لیے
 راضی بہ رضا تھا تو، لیکن جب پوچھا تھا، کچھ کہنا تھا

بخود! یہ تری خاموشی میں اک شکوہ پایا جاتا ہے
 شکوہ جو روجفا کیونکر کریں اہلِ وفا آپ کے ہر وفا کی یاد اب تک دل میں ہے
 توشِ پیہم کا حاصل التفاتِ برق ہے فکرِ حاصل ہے جسے وہ سعیِ لاحاصل میں ہے
 نہ پھر ونگا میں بتوں سے، تو خدا کو مالِ اہلِ مجھے خوف ہے خدا کا، تجھے خوف ہے خدا سے
 ہماری ہستی نمود اس کی، جو وہ ہے جو ہر، تو عرض ہیں ہم
 نہ تجھے جو ہم، تو خدا کہاں تھا، نہیں جو ہم، تو خدا نہیں

ابوسعید محمد مخدوم محی الدین

سلسلہ نسب مشہور صحابی رسول حضرت ابوسعید خدریؓ تک پہنچتا ہے۔ بزرگوں کا وطن اعظم گڑھ دیوبند تھا۔ یہ خاندان سلطنت مغلیہ سے وابستہ رہا۔ اسی سلسلے میں ان کے جدِ اعلیٰ اور نیکو نسب عالمگیر کی ہم دکن میں ان کے ساتھ چلے گئے اور پھر وہیں حیدر آباد کے ہو کر رہ گئے۔ مخدوم کے والد غوث محی الدین تعلقہ اندول میں تحصیل کے محرر تھے اگرچہ مخدوم کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن غالباً صحیح تاریخ ۴ فروری ۱۹۰۸ء (دیکھ محرم ۱۳۲۶ھ) ہے یہ مشکل سے چار سال کے ہونگے کہ والد کا عین جوانی میں عمر ۲۹-۳۰ سال انتقال ہو گیا اور ان کی کفالت اور تعلیم و تربیت ان کے چچا بشیر الدین نے اپنے ذمے لے لی۔

گھر کا ماحول ٹھیک نہ ہی تھا۔ اس لیے نہ صرف تعلیم کا قرآن اور عربی سے آغاز ہوا بلکہ نماز روزے کی پابندی اور روزانہ ختم خواجگان اور مسجد کی جاوید کشی اس کا لازمی جزو قرار پائے۔ غالباً بعد کے زمانے میں مذہب سے بعد اور اشتراکی خیالات سے قرب اسی ابتدائی ماحول کا ردِ عمل تھا۔

مخدوم نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند لی اور اس کے بعد وہیں سٹی کانج میں اردو پڑھانے لگے۔ لیکن جلد ہی اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا ان کی دلچسپی اشتراکی خیالات اور اسی وجہ سے ٹریڈ یونین تحریک سے تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض کانفرنسوں میں شرکت کے لیے یورپ کا سفر بھی کیا، اور چندے وہاں مقیم بھی رہے۔

۱۹۵۶ء میں عام انتخابات کے موقع پر وہ آئندھرا پردیش اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اپنی وفات تک وہ اس کے رکن رہے۔

وہ بعض جلسوں میں شرکت کے لیے دلی آئے ہوئے تھے کہ بدقسمتی سے ۲۴ اگست ۱۹۶۹ صبح کو ان پر دل کا دورہ پڑا۔ فوراً اردن اسپتال بھیج دیے گئے۔ وہاں حالت کچھ سہم رہی تھی کہ اگلے دن مرض کا دوبارہ حملہ ہوا؛ اب کے یہ جان بوجھ ثابت ہوا۔ ۲۵ اگست کی شام کو ساڑھے آٹھ بجے جان بحق ہوئے۔ ۲۶ اگست کو لاش ہوائی جہاز سے حیدرآباد منتقل ہوئی جہاں اسی دن رات کو نام ملی کے نواح میں قدیمی قبرستان، درگاہ شاہ خاموش میں سپرد خاک ہوئے۔

انھوں نے کسی زمانے میں چیغون کے ڈرامے (Cherry Orchard) کو اردو میں "پھول بن" کے نام سے منتقل کیا تھا اور اس کے نام و مقام تبدیل کر کے اسے بالکل حیدرآبادی فضا کے مطابق کر لیا تھا۔

ان کی زندگی میں کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے: سرخ سویرا (۱۹۴۴ء) گل تر (۱۹۶۱ء) اور بساطِ رقص (۱۹۶۶ء) آخری مجموعے میں مجموعہ اول (سرخ سویرا) کی تمام نظمیں شامل ہیں۔ مخدوم کا کلام اگرچہ اشتراکیت اور سیاست سے بہت متاثر ہے، لیکن ان کے خلوص نے اس میں ایسا رنگ و روشن بھردیا ہے کہ انھیں قبول عام کا درجہ حاصل ہو گیا۔

ان کی وفات کے بعد ان کے مجموعے 'بساطِ رقص' پر ساہتیہ اکاڈمی نے ۱۹۶۹ء کا پانچ ہزار

انعام دیا، یہ ان کی بیوی کو ادا کیا گیا تھا۔

کلام کا نمونہ بلا خطہ ہو، جو بساطِ رقص سے ماخوذ ہے:

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو
بات کیا تھی، ذکر کس کا تھا کہ شکامِ نشاط مکر نے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

جہاں بھی بیٹھے ہو جس جا بھی رات نئے پی ہے

انھیں کی آنکھوں کے قصے، انھیں کے پیار کی بات

یہ زرد زرد اچالے، یہ رات رات کا درد

یہی تو رہ گئی اب جانِ بیقرار کی بات

تمام عمر چلی ہے، تمام عمر چلے

اکٹی! ختم نہ ہو یادِ غمگسار کی بات

بجارت تھا کہیں دور کوئی شہنائی اٹھا ہوں خواب میں اک خوابِ تمام لیے

وہ جو چھپ جاتے تھے، کعبوں میں صنم خانوں میں ان کو لالاکے بٹھایا گیا ایوانوں میں

فصل گل ہوتی تھی، کیا جشن جنوں ہوتا تھا آج کچھ بھی نہیں ہوتا ہے گلستانوں میں

آج تو تلخی دوراں بھی بہت ہلکی ہے گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیانوں میں

آج تو طنزِ محبت کا اثر باقی ہے تہقے گو سنجے پھرتے ہیں بیابانوں میں

صل ہے ان کی ادا، ہجر ہے ان کا انداز کونسا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدوم!

تذکرے رستوں میں چرچے ہیں پرخیانوں میں

شاعر

کچھ قوسِ قزح سے رنگت لی، کچھ نورِ چرا یا تاروں سے

بجلی سے ترپ کو مانگ لیا، کچھ کیف اڑا یا بہاروں سے

پھولوں سے مہک شاخوں سے پک اور منڈوؤں سے ٹھنڈا
جنگل کی کنواری کلیوں نے دے ڈالا اپنا سرا یہ

بمست جوانی سے بھینی، کچھ سبکدوشی، کچھ اڑھ پسن
پھر حسن جنوں پر دے دی، آشفتنہ سری، دل کی دھڑکن
بکھری ہوئی رنگیں کر نوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
قطرت کے پریشاں نغموں سے اک اپنا گیت بناتا ہوں
فردس خیالی میں بیٹھا، اک بت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو تپھر کے دل میں بھرتا ہوں

انتظار

رات بھر دیدہ نمناک میں بہا رہا ہے
خوش تھے ہم اپنی تمنائوں کا خواب آئینکا
نظریں نیچی کیے، شرمائے ہوئے آئینکا
آگئی تھی دل مضطرب میں شکیبائی سی
پیشیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو، آپ آہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
صبح نے سچ سے لٹھتے ہوئے انگڑائی لی
میرے محبوب! مری نیند اڑانے والے!
آبھی جا رہا کہ مرے سجدوں کا اداں تکلی
سانس کی طرح سے آپ آتے ہے جانے رہا
اپنا اداں برا فکندہ نقاب آئینکا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئینکا
بج رہی تھی مرے غنائ میں شہنائی سی
سجدے مسردہ کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی
اوصبا! تو بھی جو آئی، تو اکیلی آئی
میرے مسجود! مری اوج پہ چھانے والے
آبھی جا رہا، تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلی

اقبال

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گلے لگا!
جانبِ مشرق اجالا سا نظر آنے لگا

موت کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں، چھٹنے لگیں
 نفلتوں کی چادریں مٹنے لگیں، چھٹنے لگیں
 اک شرارہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا
 آسمانوں کے نور سیکرہ نوجوانوں تک گیا
 عالم بالا پہ باہم مشورے ہونے لگے
 آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے
 پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا
 زندگی کے موڑ پر گاتا ہوا پایا گیا
 وہ نقیب زندگی، شام و سحر کا گیتا گیا
 گیت سننے کے لیے خلق خدا آنے لگی
 ”نغمہ جبریل ہے، انسان کا گانا نہیں
 ”عش کی قندیل ہے، اک آسمانی لکڑی
 ”راگ کیا ہے سر سے پاتک عشق کی اک لکڑی“
 ”صویر اسرافیل ہے، دنیا نے پہچانا نہیں“

آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے، بہت راتوں کے بعد آئی ہے
 دیر سے، دور سے آئی ہے، مگر آئی ہے
 مر مر صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آ گیا
 رات ٹوٹ گئی، اجالوں کا پیام آ گیا

آج کی رات نہ جا

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزار بھی ہے
 ساز و آسنگ بھی، زنجیر بھی، جھنکار بھی ہے
 زندگی دید بھی ہے، حسرت دیدار بھی ہے
 زہر بھی، آب حیات لب و زخار بھی ہے
 زندگی درد بھی ہے، زندگی دلدار بھی ہے

آج کی رات نہ جا

تذکرہ معاصرین

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب، کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لیے، تیری محبت کی نظر
آج کی رات نہ جا

بھاگ متی

پیار سے آنکھ بھرتی ہے، کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نام دفا آتا ہے

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگنا تھی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

دھن کی گھنگھور گھٹائیں ہیں، نہ ہن کے بادل
سونے چاندی کے گلی کوچے، نہ ہیروں کے محل
آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
نواجہ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں

شہر باقی ہے، محبت کا نشان باقی ہے
دلبری باقی ہے، ولہادی جاں باقی ہے

تذکرہ معاصرین

سرفہرست نگاران جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے، تری چشم نگراں یابی ہے

منہرو

ہزار رنگ ملے، اک سبو کی گرو شس میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا عبا، مشیت بہار
ہو ہے داوی جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دور، جستجو بن کر

راز چاند پوری، محمد صادق

۲۵ مارچ ۱۸۹۲ء کو چاند پور (ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ خاندان میں پیشہ پسہگری نشیوں سے چلا آتا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد حالات دگرگوں ہو گئے، اور ان کے والد حافظ محمد جعفر کو کمزور ملازمت کو ذریعہ معاش بنانا پڑا۔ راجہ جب تعلیم مکمل کر چکے، تو انھوں نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا۔ اسی سلسلے میں جب ان کا تباہ کانپور ہوا تو وہ وہاں کے مشہور ماسنامہ زمانہ کی ترتیب میں نشی دیا نرائن نجم (ف ۱۹۴۲) کے معاون بن گئے۔ یہ سلسلہ کم و بیش چار برس تک قائم رہا اور اس کے بعد ان کے جیلو چلے جانے کے باعث منقطع ہو گیا۔

کلام پر اصلاح سیما بکری آبادی سے لی اور اس میں شک نہیں کہ خود استاد کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ نظم کے علاوہ نثر سے بھی دلچسپی تھی، افسانے بھی لکھتے تھے۔ مطبوعہ کتابوں میں زیادہ اہم یہ ہیں:

زریں افسانے؛ دنیاے راز (منظومات)؛ نواسے راز (غزلیات)؛ سیما بکری آبادی (سوانح)؛ داستانے چند (یادداشتیں)

غیر مطبوعہ کتابوں میں صحیفہ مراد (منظومات) اور حدیثِ راز (رباعیات) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ٹالسٹائی کے ایک ناول کا بھی ترجمہ بعنوان 'ماشا' کیا تھا، یہ بھی قابل ذکر ہے۔ بچوں کی جو نامرنگی اور خاص کر رفیقہء حیات کی دائمی مفارقت کے باعث ان کے آخری ایام بہت افسردگی اور دل گرفتگی اور گوشہ نشینی میں بسر ہوئے۔ اسی عالم میں ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔
اب چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں جو ان کے مجموعہء کلام نوائے راز (الہ آباد ۱۹۶۱ء) سے منتخب ہیں:

راز سے مل کے آپ خوش ہو گئے آدمی ہے بڑی محبت کا
جینے کا مزہ جب ہے، جینے سے ہو کچھ حاصل

یوں لاکھ جیے کوئی، تو جینے سے کیا ہو گا

محبت اور پھر اُس کی محبت، آہ کیا کیے!
تڑپ اٹھتا ہے دل، جب نام سنتا ہوں محبت کا
وہ متکدر تھا غلط، خیر، تنکدر ہی سہی

مری نگاہ میں تو اُس کا آستانہ تھا
سو طریقے ہیں پرستش کے، اگر ذوق ہو کچھ
کیا بڑی بات ہے کوئی اسے سجدہ کرنا؟
مشکلیں آساں ہوں، یہ آساں بھی ہے، دشوار بھی

مطمئن ہوں کیا نظامِ بزمِ امکاں دیکھ کر
جانتا ہوں، مگر بشرِ طِ ادب ہوں خطا دار جیٹا ہو کر
رکھ نظر میں حدودِ حسنِ عمل کامیابی کا ہے یہی اک راز
جس طرف اٹھ گئی نگاہِ شوق وقفِ سجدہ ہوئی جبینِ نیاز
دل نہیں پہلوئیں، دردِ دل نہیں آہ! اب جیتے کا کچھ حاصل نہیں

چہن ملتا ہی نہیں دہریس دیوانے کو
اک خانماں خراب کی دولت کہیں جسے
رعنائی خیال کے قتر بان جاٹھے !
دردِ فراق یار کی مجبوریاں، سجا !
دے سکتا ہو، تو دے مجھے دادِ ستمکشی
لذت کشِ نظارہ ہے تیری نظر، تو کیا !
باقی کہاں ہے رازِ زمانے میں آجکل
اک وقت میں دو باتیں، کیونکہ نہ ہو دشواری

دنیا کی طلب کوشی، عقبی کی طلب گاہی

اللہ اللہ! یہ بیچارگی اہل ہنس و ہنر!
زندگی ہو گئی کیا بزمِ جہاں سے خست؟
نا کام محبت ہوں میں، اے راز تو کیا غم؟
جو دم ہے غنیمت ہے خراباں جہاں میں
حاصل نہ ہوگا کچھ بھی اخفائے راز سے
موقع بھی مل ہی جائیگا پھر عرضِ حال کا
ہے جستجوئے تیر حقیقت ابھی فضول
اے خوشنوا اے بزمِ محبت! اٹھا رباب
وہ نغمہ چھیڑ، وجد میں آجائیں اہلِ دل
اللہ، ایک جامِ مے جاں نواز کا!
اعجازِ چشمِ لطف کا احسان ہے یہ، رازِ آ
کیا زمانہ ہے، اے معاذ اللہ!

زندگی ہے نہ اب وہ زندہ ولی زابہ خشک ہے ہر اک منخواہ
مرا زبکس سے کہوں میں حال لں برمن غیر شیخ دنیا دار
قدم آگے بڑھا، اے مردِ میداں! دیکھتا کیا ہے
فریبِ رہبری دتی ہے دنیا، خود نما ہو کر
یہ برمن ہے، یہ شیخِ حرم، یہ پیرِ مغاں یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی میفروش نہیں!

مفتی انتظام اللہ شہابی

قصبہ گوپاٹو (ضلع بیتا پور) کے ایک علمی خاندان کے نام لیا تھا۔ ان کے مورخ علی شیخ آدم بن محمد نیرہ حضرت شہاب الدین سہروردی اوچہ سے ۸۰۰ھ میں گوپاٹو آئے۔ سب سے پہلے عہد باری میں ان کے ایک بزرگ عہدہ افتا سے سرفراز ہوئے اور اس کے بعد درکنی حضرات بھی مفتی مقرر ہوئے۔ جس سے خاندان کے افراد کے نام میں لفظ مفتی کا جوہر و علم کی طرح سے اضافہ ہو گیا۔

قناری عالمگیری کی ترتیب میں اس خاندان کے ایک فرد شیخ وجیہ الدین بھی شامل تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کے دادا مفتی انعام اللہ تحصیل علم کے بعد کلکتہ گئے اور وہاں مسٹر کوبروک کے بیٹے کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ جب کوبروک دہلی میں ریزیڈنٹ مقرر ہوا، تو یہ ریزیڈنٹ میں سرشتہ دار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ اسی زمانے میں اکبر شاہ کی طرف سے انھیں خاقی کا خطاب عطا ہوا۔ غالب کے دوستوں

تذکرہ معاصرین

میں منشی غلام غوث خان بیخبر بھی تھے؛ یہ انھیں مفتی انعام اللہ کے داماد تھے۔ مفتی انعام اللہ بالآخر ریاست ٹونک میں ہتھم بند و بست مقرر ہوئے تھے، وہیں سے بیاد ہو کر آگے آئے اور یہاں ۲۱ شوال ۱۳۷۲ھ کو انتقال کیا۔

مفتی انتظام اللہ صاحب تصنیف و تالیف بزرگ تھے۔ انتظام اللہ کی تعلیم سراسر فارسی اور عربی تک محدود رہی، لیکن آخری زمانے میں اپنے طور پر اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ مختلف کتابوں سے استفادہ کر سکتے تھے۔ متوسطات تک دینیات کی تکمیل کی۔ اس کے بعد نقشہ نویسی اور انجینئرنگ سیکھی، لیکن ملازمت کی بجائے تجارت میں لگ گئے؛ تہ توں اپنے ہنوئی ارشاد حسین کی شراکت میں جانوروں (شیر، ہاتھی وغیرہ) کی خرید و فروخت کرتے رہے۔ یہ مشغلہ دس سال یعنی ۱۹۲۵ء تک رہا۔

لکھنے پڑھنے کا شوق شروع سے تھا۔ اور انتظامی قابلیت بھی اچھی تھی، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں بائبل سوسائٹی کے طرز پر دائرہ معارف قرآنیہ قائم کیا اور اسی کی طرف سے قرآن، حدیث، سیرت رسول وغیرہ سے متعلق کئی چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کیے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ یہاں دلی آگئے اور دنیا کتاب گھر (ناشرین) کے ہاں سو سو روپے مشاہرے پر ملازمت کر لی۔ یہاں سے ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں مددۃ المصنفین سے بھی تعلق پیدا ہو گیا۔ اس ادارے کے لیے انھوں نے سلاطین منہ اور تاریخ ملت کے کئی حصے مرتب کیے۔ برہان (ماہنامہ) کی ترتیب میں بھی کچھ دنوں شریک رہے۔

۱۹۲۹ء میں وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں متعدد علمی و ادبی اداروں سے منسلک ہو گئے تھے۔ وہ آخر تک لکھتے رہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ”داعی اسلام“ ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تھی، اور آخری ”قافیہ سخن اکبر باد“ ۱۹۶۸ء میں۔ ان ۵۲ برس میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ ”مشاہیر اکبر باد“ میں انھوں نے اپنی ۱۲۹ کتابوں کی نشاندہی

تذکرہ معاصرین

مکی ہے۔ ان میں سے بعض کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ ان کے موضوعات بھی بہت متنوع ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری حالات اور حوالے وضع کرنا تھی۔ اس کے لیے وہ بے تکلف کسی کتاب کا حوالہ دے دیتے، اور لکھ دیتے کہ یہ قلمی کتاب ہمارے خاندان گوپامٹو کے کتابخانے میں موجود ہے۔ حالانکہ نہ وہ واقعہ ہی درست ہوتا، نہ اس تاہم کی کوئی کتاب ہی عالم وجود میں ہوتی، اور نہ گوپامٹو میں کوئی کتاب خانہ ہی تھا۔ لوگ ان پر اعتراض کرتے، لیکن یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی اپنی حرکت سے پشیمان ہوا، نہ اس نے اپنی یہ افسوسناک اور گمراہ کن روش ترک کی۔ معترضوں سے کہہ دیتے: میاں، تم اعتراض کرتے رہو۔ میں اپنا کام کرتا ہوں، بعد کے لوگ درست کو لینگے؛ لیکن اس سے کسی نہ کسی طرح سے "یار خاں" کا نام تو آجاتا ہے، ان کا تکیہ کلام تھا اور اس سے ان کا اشارہ اپنی طرف ہوتا تھا، خود میں ایک مرتبہ بہت پریشان ہوا۔ انھوں نے اپنی ایک تحریر میں ایک قلمی کتاب کا حوالہ دیا اور لکھ دیا کہ یہ خطی نسخہ اربکاٹ کے کتابخانے میں محفوظ ہے۔ چونکہ موضوع سے مجھے دلچسپی تھی، میں نے اپنے بعض مددگار اسی دوستوں سے استدراکی۔ مہینوں کی تگ و دو کے بعد راز کھلا کہ سب جعل تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پیر کے دن ۸ ستمبر ۱۹۶۹ء ساڑھے چھ بجے شام کو اچھی میں انتقالی ہوا۔

علی عباس حسینی (سید)

سید علی عباس حسینی ۳ فروری ۱۸۹۷ء کو ضلع غازیپور کے ایک گاؤں پارہ میں پیدا ہوئے۔
 ۱۹۱۹ء میں بی اے کی سند لے کر انھوں نے ایل ٹی میں داخلہ لے لیا اور جب ۱۹۲۱ء میں
 یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا، تو مدثری کا پیشہ اختیار کیا اور محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء
 میں پرائیوٹ امتحان سے ایم اے کی سند لے لی۔ ساری عمر درس و تدریس میں گزری اور
 تقریباً ۴۴ برس کی ملازمت کے بعد ۱۹۵۴ء میں پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔
 انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں انگریزی زبان کے افسانوی ادب کا بہت وسیع
 مطالعہ کیا تھا۔ اسی کے زیر اثر خود بھی افسانہ نویسی کی طرف مائل ہوئے۔ ان کا سب
 سے پہلا افسانہ 'پژمردہ کلیاں' تھا جو انھوں نے ۱۹۱۷ء میں لکھا۔ لیکن ان کا سب سے
 پہلا مطبوعہ افسانہ 'جذبِ کامل' ہے جو کانپور کے مشہور رسالے 'زمانہ' میں شائع ہوا
 تھا۔ ۱۹۳۱ء میں جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'رفیقِ تنہائی' شائع ہوا، تو اس پر
 ہندستانی اکادمی، آلہ آباد نے انعام دیا تھا۔

انہیں اپنی تصنیفات پر چار مرتبہ انعام ملا۔ ایک تو ہی ہندستانی اکادمی کی طرف سے؛ دو مرتبہ پرسکار یو جتا سمیتی کی طرف سے اور ایک بار ایک امریکی اخبار کی طرف سے، جس نے مختلف ملکوں کے افسانوں کے مقابلے کا اعلان کیا تھا۔ اسی سلسلے میں انٹر پریش جوتھا کے اس پانچ ہزار کے خاص انعام کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے، جو ان کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں مایچ ۱۹۶۸ء میں دیا گیا تھا۔

دوران ملازمت میں انھوں نے درسی نصاب کے سلسلے بھی تیار کیے تھے۔ ایک نوکامن لینگویج ریڈرس کے عنوان سے یہ تقریباً ۱۴ برس تک یوپی کے مختلف اضلاع میں رائج رہا۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں درجوں کے لیے اردو کورس اور پھر ہائی اسکول کے لیے۔ اس وقت بھی ان کی کتاب گلستانِ شرو نظم کشمیر میں ہائر سکندری درجوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ انھیں ترجمے پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ والدین کا ترجمہ بہت مدت ہوئی، کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ یادگاری لیکچر بعنوان

One World and India جو شہرہ آفاق مؤرخ آرٹلڈ ٹامین ٹی نے ۱۹۶۰ء میں دیے تھے، ان کا اردو ترجمہ بھی جیسی صاحب کا کیا ہوا ہے۔ متعدد مسلمان حضرات نے کشمیر کے موضوع پر ریڈیو سے اردو میں تقریریں نشر کی تھیں؛ ان کا انگریزی ترجمہ بھی ان کے قلم سے ہے۔

آخری دو تین سال بستر علالت پر گزرے۔ دل کے مریض تھے۔ اسی حالت میں، ستمبر ۱۹۶۹ء صبح ساڑھے آٹھ بجے اللہ کو پیارے ہوئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا اور کربلا ملکہ جہان لکھنؤ میں آخری خواجگاہ نصیب ہوئی۔ ان کی وفات سے اردو نے ایک صاحبِ نظر مصنف کھویا، اور میں نے ایک بزرگ ہربان اور دوست۔ ان کی محبت یاد آتی ہے، تو دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے:-

تذکرہ معاصرین

۱۔ افسانوں کے مجموعے: رفیق تنہائی، آئی سی ایس؛ کچھ سنسی نہیں؛ باسی پھول؛ میلہ گھومتی؛ ہمارا گاڈ؛ کانٹوں میں پھل؛ ایک عورت ہزار جلوے۔

۲۔ ناول:

سر سید احمد پاشا؛ شاید کہ بہار آئی؛ ندیا کنارے؛ حکیم بانا؛ ڈینگوں کا بادشاہ (مضحکات)

۳۔ ڈراما:

نورتن (ایک ایکٹ کے ڈرامے)

امیر خسرو کی کہانی (اردو مندی)

۴۔ ناول کی تاریخ و تنقید۔

۵۔ مندی:

پھولوں کی چھڑی؛ گائے باں؛ کولنگری۔

بہت سی چیزیں نامکمل اور غیر مطبوعہ رہ گئیں۔ نامکمل میں دو ناول ہیں؛ اور مکمل؛ لیکن غیر مطبوعہ میں؛ ہماری اردو شاعری؛ راج ہٹ؛ اور تقریباً ۲۵ فلمی کہانیاں۔

آربری، آرتھر جان (پروفیسر)

ماہرین علوم شرقیہ کے حلقے میں عموماً اور فارسی اور عربی کی دنیا میں خصوصاً پروفیسر آربری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پچھلے ۳۰-۳۵ سال میں انھوں نے تصنیف و تالیف ترجمہ و تحشیہ کے میدان میں جو قابلِ تعریف اور مستقل کارنامے سرانجام دیے، ان کی بدولت انھوں نے عالمی شہرت حاصل کر لی تھی۔ انوس کہ ان کا ۲ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو کیمبرج میں انتقال ہو گیا۔

پروفیسر آربری کے والد ولیم آربری برطانوی بحریہ میں ملازم تھے۔ پروفیسر آربری ۱۲ مئی ۱۹۰۵ء کو پورٹس ماوتھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم دیہی مقامی گرامر سکول میں ہوئی، جو اس وقت قدیمہ (کلاسیکی) تدریس کے سلسلے میں خاص طور پر مشہور ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے پیمبروک کالج، کیمبرج میں داخلہ لیا۔ یہاں اپنی محنت اور قابلیت سے انھوں نے متعدد دوئیے اور تمغے حاصل کیے۔ وہ اس وقت قدیمہ اور اس وقت شرقیہ دونوں امتحانوں میں اول آئے، جس کے جلد وہیں انھیں ولیم براؤن

تذکرہ معاصرین

تمغہ اور ایڈورڈ جارج براؤن وظیفہ اور رائٹ وظیفہ عطا ہوئے۔ اب ہر ایک کی نظر ان پر تھی۔ مبصرین کے دل میں جائزہ طور پر توقع پیدا ہو گئی کہ عربی اور فارسی علوم کے آسمان پر ایک نئے ستارے کا طلوع ہوا ہے اور خوش قسمتی سے آبربری نے انھیں مایوس نہیں کیا۔

تعلیم سے فراغت پر اولادہ چندے اپنے کالج ہی میں تحقیق کے شعبے سے متعلق رہے؛ اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں شعبہ السنۃ قدیمہ کے صدر مقرر ہو گئے۔ یہاں سے جب وہ ۱۹۳۶ء میں انگلستان واپس گئے، تو انڈیا آفس لائبریری میں نائب کتابدار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی، تو ان کا وزارت جنگ کے محکمہ رقابتہ البرٹ سنسٹر میں تبادلہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ تھوڑے دن کے لیے وزارت اطلاعات سے بھی منسلک رہے۔ اگرچہ ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن اب اس کے نتیجے سے متعلق کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے ۱۹۴۲ء میں انھیں جنگی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اس پر وہ دوبارہ تعلیمی میدان میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد موت تک تعلیم و تدریس اور تصنیف و تدوین کا شغل ان کا اور حنا بھونا بنا رہا۔ پہلے وہ لندن یونیورسٹی میں فارسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور دو سال بعد عربی کے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ اپنے اصلی گہوارہ علوم یکمیرچہ پنچے، عربی کے پروفیسر بن کر۔ یہ وہ کسی ہے جس پر کسی زمانے میں پروفیسر براؤن (ف ۱۹۲۵ء) متمکن رہے تھے۔ اس لیے علمی دنیا میں اس عہدے کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ آبربری کو ان کی جانشینی کا فخر حاصل ہوا اور انھوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا۔

آبربری کے تصنیفی کارناموں کا جائزہ لینا آسان نہیں ہے۔ ان کی پہلی کتاب (دلی محن) ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دوران جنگ کے صرف ایک سال ۱۹۴۱ء کو چھپو کر

۱۹۶۸ء تک کوئی سال خالی نہیں گیا، جب ان کی کوئی نہ کوئی کتاب شائع نہ ہوئی ہو۔ بعض سالوں میں تو دو دو تین تین کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اسٹھ (۷) کتابیں میرے علم میں ہیں، اور ممکن ہے کہ بعض تک میری رسائی نہ ہوئی ہو۔ انھوں نے انڈیا آفس، کیمبرج یونیورسٹی، چیسٹر بیٹی کتاخانوں کی فارسی اور عربی کتابوں کی فہرستیں مرتب کیں، جو شائع ہو چکی ہیں۔ ان سے ان کی وسعت معلومات اور دقیقہ بینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے شائع کیے، انکی کتابوں کو حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ انھیں تصوف سے بہت شغف تھا اور اسی سے انھیں قرآن کے مطالعے کا بھی خاص شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا، جو ہر لحاظ سے بلند پایہ تراجم میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اقبال کی دو کتابوں — مذہب و عجم اور رموزِ بخودی کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ پیام مشرق میں سے لائے۔ طور کا اور بانگ درا میں سے شکوہ اور جواب شکوہ کا ترجمہ بھی کیا۔ اسرارِ خودی پر مفصل حواشی بھی قلمبند کیے تھے۔

بسیار گو اور زود نویس مصنفین کا تمام کام ایک معیار اور پائے کا نہیں ہوا کرتا۔ غفلت کی وجہ سے وہ اس کی نوک یا کد درست کرنے کے لیے وقت صرف نہیں کر سکتے، جس سے ان کی تحریروں میں رطب کے سانھ یا بس کا بھی اچھا خاصہ حصہ داخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے تعجب ہوتا ہے کہ اتنے کثیر التصانیف ہونے کے باوجود آبروی نے کہیں معیار کو مگر نہ نہیں دیا۔ میری ان سے پچھلے دس بارہ برس سے خط و کتابت تھی، لیکن پہلی ملاقات ۱۹۶۰ء میں ہوئی، جب میں بلجیم میں مقیم تھا۔ رفتہ رفتہ تعلقات میں استواری اور وسعت اور قربت پیدا ہوتی گئی۔ انھوں نے میری فرمائش پر نذر عرشی اور نذر ذاکر کے لیے مضامین قلمبند کیے، جو ان کتابوں میں شامل ہیں۔ نذر ذاکر کی ترتیب کے زمانے میں ان کی تندرستی بہت خراب تھی اور اطبانے کام کاج سے منع کر رکھا تھا۔ اس کے

تذکرہ معاصرین

باوجود انھوں نے میری درخواست پر انکار نہ کیا اور ایک مختصر مضمون بھیج دیا۔ میں گوشہٴ خون میں لندن گیا تھا۔ قدرتا ان سے ملنے کی تمنا تھی۔ لہذا ان وقت مقرر کرنے کے لیے میں نے کیمبرج ٹیلیفون کیا، تو ان کی بیگم (لسنا) نے بتایا کہ ان کی طبیعت بہت علیل ہے، ڈاکٹروں نے کسی سے ملنے جلنے کی ممانعت کر رکھی ہے لیکن آپ اتنی دیر سے اور اتنی مدت کے بعد آئے ہیں، چاہیں تو آجائے۔ ایسے میں مجھے انھیں زحمت دینے میں تکلف محسوس ہوا۔ میں نے کہا، نہیں، میں ابھی چند دن اور یہاں ہوں، پھر کسی دن، جب ان کی طبیعت بہتر ہوگی، حاضر خدمت ہو جاؤنگا۔ چار پانچ دن بعد پھر معلوم کیا، تو انھوں نے بتایا کہ ہنوز ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی اور ڈاکٹروں کی پابندی بھی بدستور قائم ہے۔ غرض ان سے ملاقات کی فرصت نہ مل سکی اور میں واپس چلا آیا۔ اب جو اطلاع ملی، کہ ان کا انتقال ہو گیا، تو بے حد قلق ہوا۔ ان کی عزت گزشتہ، انکسار، لطف و کرم، عالمانہ گفتگو۔۔۔ غرض ایک ایک بات رہ رہ کے یاد آتی ہے اور دل سے نکلتی ہے۔

اولادِ جسمانی میں ایک بیٹی 'انا ہے' وہ اپنے گھر بار والی ہیں۔

محمد اجمل خان

اصل میں ایک افغان خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کا پیشہ سیالپوری اور کشاورزی تھا۔ ان کے والد کا نام اسماعیل خان تھا۔ محمد اجمل خان صاحب کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء کے جنگائے سیالپور میں حصہ لیا تھا، جس کی یادداشت میں وہ انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے۔ محمد اجمل خان ۲ فروری ۱۸۹۷ء کو یوپی کے قصبہ گوتسی (ضلع پرتاب گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اور ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک دوڑھائی سال الہ آباد یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے شعبے میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی لیے کبھی کبھی بعض لوگ ان کے نام کے ساتھ پروفیسر کا لفظ لکھتے تھے۔ اس کے بعد چند دکانت بھی کی، لیکن یہاں وہ جم نہ سکے۔ ۱۹۳۵ء میں ٹیکسور کی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے چلے گئے۔ دو سال بعد ۱۹۳۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے انھیں اپنا سکرتھر مقرر کیا اور پھر ان کی وفات تک وہ اسی حیثیت سے ان کے وابستہ رہے۔

عربی زبان پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ مطالعہ قرآن سے بہت شغف تھا اور ترتیب قرآن حسب نزول قرآن، ان کا خاص موضوع، چنانچہ انھوں نے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری قرآنی پس منظر اور وحی کی ترتیب زمانی کے مطابق سے مرتبہ کر کے شائع کی تھی۔ اس کا مختصر انگریزی ترجمہ بھی چھپا تھا۔ دوسرے مذاہب سے بھی دلچسپی تھی، گیتا اور حبیبی کے ترجمے اس کے گواہ ہیں۔ اور کبھی چند چھوٹے چھوٹے رسالے ان سے یادگار ہیں۔ لیکن ان کا بہت بڑا کام ایک لغت تھی، گیارہ حصوں میں اسے وزارت تعلیم نے طبع کروایا تھا۔ لیکن خدا معلوم شائع کیوں نہ ہوئی اور یہ بھی کچھ پتہ نہ چلا کہ اس کا حشر کیا ہوا۔ اس میں برکاری استعمانی کے اردو منہدی کے مرادفات دیے تھے۔ بڑے کام کی چیز تھی۔ میری ان سے ۱۹۳۶ء سے ملاقات تھی، آخری ان کے انتقال سے کوئی دس بارہ دن قبل ہوئی۔ ان کے سوچنے کا انداز چونکا نے والا تھا، انھیں کسی بڑی سے بڑی مسئلہ روایت کے خلاف رائے کا اظہار کرنے میں کبھی باک نہیں ہوا۔ پھر لوگ جتنا اس پر بدکتے، وہ اس سے لطف لیتے ہوئے اور چھڑتے۔ اس کے باوجود میں نے انھیں کبھی مذہب کی حمایت اور اخلاق کے احترام میں کسی سے کم نہیں پایا۔

مولانا آزاد کی وفات ۱۹۵۸ء کے بعد انھیں راجیہ سبھا کا رکن نامزد کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی رحلت تک یہاں رہے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۹ء صبح وینکٹن اسپتال، نئی دہلی میں انتقال ہوا اور اسی دن سہ پہر کو اپنی وصیت کے مطابق بستی نظام الدین (غربی) میں احاطہ خاندان خواجہ حسن نظامی میں دفن ہوئے۔ لیقہ اللہ۔

رئیس احمد حفری

ان کا وطن ستیا پور تھا اور ان کے خاندان کا وہاں کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ تاہم خیال اسی ضلع میں خیر آباد کا مردم خیز قصبہ تھا۔ ان کے نانا نیازا احمد صاحب مشہور شاعر ریاض خیر آباد (ف ۱۹۳۲ء) کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ تین بھائی تھے، ریاض احمد، نیازا احمد، فیاض احمد۔ اپنے والد سید فیصل احمد کی طرح یہ تینوں بھائی کبھی پولیس میں ملازم ہوئے، ریاض تو یہ کھڑاگ زیادہ دن نہ نباہ سکے اور متعفی ہو گئے۔ البتہ دوسرے دونوں بھائی آخر تک ملازم سرکار رہے۔ سید نیازا احمد (رئیس احمد کے نانا) تلوں بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے پر فائز تھے۔ اور یہیں ملازمت سے سبکدوش ہو کر مدتوں مقیم بھی رہے۔ رئیس احمد حفری کے والد کا نام ناظر حسین تھا۔ رئیس احمد ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ (ایک جگہ تاریخ ولادت ۱۹۱۳ء بھی لکھی جاتی ہے، جو ٹھیک نہیں ہے)۔ ناظر حسین کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا، جب رئیس احمد بھی بہت کم سن تھے، اس لیے ان کی پرورش اور تربیت ان کے نانا بھائی (خیر آباد) میں ریاض کی سرپرستی میں ہوئی۔

سید ناظر حسین کی جوانی مرگی کے باعث جاواد کی مناسب دیکھ بھال نہ ہو سکی اور کارندہ

کی غور و برد کے باعث تباہ ہو گئی۔ اس کا اثر رئیس احمد اور ان کے بڑے بھائی عقیل احمد صاحب کی تعلیم پر پڑا۔ عقیل احمد تو آنکھوں میں درجہ سے آگے نہ بڑھ سکے، البتہ رئیس احمد نے زور بازو سے بہت کچھ پیدا کر لیا۔ انھیں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیجا گیا جس کا ان ایام میں ترقی پسند حلقوں میں شہرہ تھا۔ یہ غالباً ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔

چونکہ ان کی پرورش علمی و ادبی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے شروع سے مطالعے کا شوق تھا۔ اس زمانے میں دارالعلوم ندوہ میں ایک انجمن "الاصلاح" تھی۔ یہ اس کے دارالمطالعہ میں جانے لگے اور یہاں کے رسائل و جرائد کے مطالعہ سے انھوں نے اپنی استعداد میں خاصہ اضافہ کیا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ خود انجمن کے رکن بن گئے اور ایک دستی قلمی رسالہ بھی جاری کر دیا۔ ۱۹۲۹ء میں وہ انجمن کے نائب ناظم اور ۱۹۳۰ء میں ناظم منتخب ہوئے۔ ان کے دورِ زمامت میں انجمن نے بہت ترقی کی۔

اپنی قابلیت اور محنت کی عادت کے باعث وہ اساتذہ کے بہت چہیتے تھے خصوصاً شیخ الحدیث مولانا حمید حسن خان ٹوٹکی (ف ۱۹۶۲ء) شاگرد شیخ حسن بن محسن یانی و خلیفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی انھیں بہت چاہتے تھے۔ اپنے قیامِ ندوہ کے زمانے میں انھوں نے جن اساتذہ سے پڑھا، ان میں مولانا حفیظ اللہ (شاگرد مولانا عبدالحی فرنگی محلی) مولانا عبدالحکیم صدیقی، مولانا عبدالحسن نگرانی (ف ۱۹۲۶ء) مولانا عبدالودود حیرا چوہدری، مولانا سید علی زبیدی، مولانا شبلی نقیہ اول کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صرف و نحو میں مولانا حکیم احمد بھرائی اور مولانا محمد سلیم گنتوری ان کے استاد تھے۔

۱۹۳۰ء میں دارالعلوم ندوہ کے طلبہ میں ایک سخت احتجاجی تحریک پیدا ہوئی تھی، طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ بعد کو چند طلبہ کو مدرسے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس احمد علی ان سرائے فتنہ میں تھے چونکہ اب ان کا ندوۃ میں تعلیم جاری رکھنا ممکن نہیں تھا، انھوں نے جامعہ اسلامیہ دلی میں داخلہ لے لیا۔ وہ جامعہ میں تین برس (۱۹۳۰-۱۹۳۲ء) رہے۔ اس زمانے

میں انھوں نے انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم حاصل کی۔ اس دور کے حجازی سائنسدانوں کے کرامات سے انھوں نے بڑھا اور استفادہ کیا۔

مضمون نویسی تو وہ اصلاح کے زمانے سے کر رہے تھے، یہاں رسالہ جامعہ کی موجودگی نے گویا ہمیز کا کام دیا۔ انھوں نے اس کے لیے متعدد علمی مضامین لکھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے بعض عربی چیزوں کا ترجمہ بھی کیا مثلاً منقولی کا افسانہ الی الاخر الفقراء؛ مرحوم نے اس کا عنوان غریب خانہ تک رکھا تھا۔ یہ ترجمے کا شوق اور تجربہ بعد کو ان کے بہت کام آیا۔

۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی نے لندن میں انتقال کیا، تو حامد علی خان مینجر مکتبہ جامعہ ف دسمبر ۱۹۶۳ء نے ان کی سوانحی لکھوانے اور شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی نظر انتخاب نوجوان رئیس احمد پریڈی، جوان کی مردم شناسی کی روشن دلیل ہے۔ رئیس احمد کو مولانا محمد علی سے غیر معمولی عقیدت تھی؛ انھوں نے اپنی جوان عمری اور ناتجربہ کاری کے باوجود یہ کتاب ایسی محنت سے قلمبند کی کہ صحیح معنوں میں آج تک بھی محمد علی مرحوم کی کوئی سیرت اس سے بہتر تو درکنار اس کے برابر بھی نہیں لکھی گئی۔ یہی کتاب ان کے مرکزی خلافت کمیٹی کے روزنامے خلافت (بھٹی) کے ایڈیٹر بننے کا باعث بن گئی۔

اس زمانے میں خلافت ہاؤس اور خلافت اخبار بلکہ آل انڈیا خلافت کمیٹی عبارت تھی، مولانا شوکت علی سے۔ اس کی بہار اور شباب کب کا رخصت ہو چکا تھا، لیکن مولانا شوکت علی اسے سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ آمدنی کم، خندہ ندارد اور خرچ بدستور۔ ملازموں کی تنخواہیں چڑھنے لگیں اور قرضوں ہوں کے تقاضے بڑھنے لگے۔ اخبار کی اشاعت ببقاعد ہو گئی اور غیر مطمئن ایڈیٹر اور کارکن آہستہ آہستہ باری باری کنارہ کرنے لگے۔ آخری ایڈیٹر جو یہاں سے گئے، وہ احسن مراد آبادی تھے۔ جب تک کوئی ڈھنگ کا آدمی نہ ملے، مولانا شوکت علی اسے جاری رکھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ ایک نئے ایڈیٹر کی تلاش میں تھے کہ

کسی نے انھیں سیرت محمد علی کے مصنف رئیس احمد حفری کا پتہ دیا۔ شروع میں رئیس احمد نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن بالآخر وہ بھی پہنچ گئے۔ یہ جون ۱۹۳۳ء کی بات ہے، جب ان کی عمر مشکل ۲۶ برس کی رہی ہوگی۔

جب وہ خود یہاں جم گئے، تو انھوں نے اپنے بعض قدیم دوستوں کو بھی بھی بلا لیا۔ ان میں مولانا عبدالسلام قدوائی (حال شیخ و تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ نائب مدیر مقرر ہوئے تھے۔ غرض تدریج انھوں نے نہ صرف اخبار کا علم مضبوط کیا، بلکہ خلافت کو اندر لے کر صاحب اثر روزنامہ بنا دیا۔ لیکن پرچہ مسلسل نقصان میں جا رہا تھا۔ انجام کار مولانا شوکت علی نے فیصلہ کر لیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ حفری صاحب نے ان سے کہا کہ اگر آپ اخبار اور مطبع کا انتظامی شعبہ بھی کھلیے میرے سپرد کر دیں تو میں اس کا حج و خرچ برابر کر دینے کا ذمہ لیتا ہوں۔ مولانا شوکت علی نے بفرض تجربہ یہ چیلنج قبول کر لیا اور حفری صاحب نے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کر دکھایا۔ پرچہ نہ صرف اپنا خرچ پورا کرنے لگا، بلکہ اس سے منافع ہونے لگا۔

مولانا شوکت علی کے انتقال (نومبر ۱۹۳۸ء) تک حفری صاحب خلافت سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد وہ اس سے الگ ہو گئے اور اپنا مفقہ دار پرچہ 'جوہر' جاری کر دیا۔ اس نے بہت کم عمر پائی، غالباً آٹھ شمارے نکلتے تھے لیکن اس دوران میں انھوں نے متعدد کتابیں، ناول وغیرہ لکھے اور یوں ان کا نام ایک کامیاب صحافی اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوا۔

وہ شروع سے مولانا محمد علی سے بہت متاثر، بلکہ مرعوب تھے۔ اس کے بعد مولانا شوکت علی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، اور خلافت کی ادارت کے زمانے میں تو وہ خلافت کے داعی اور کانگریس کی مخالف سیاست کے گویا نفسِ ناطق بن گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ملک تقسیم ہوا، تو وہ بھی پاکستان چلے گئے۔ یہاں پرانی ادبی ساکھ ان کے بہت کام آئی۔

کراچی سے انھوں نے ایک روز نامہ خورشید اور ادبی ماہنامہ ریاض جاری کیے، لیکن مالی مشکلات کے طفیل انھیں بند کرنا پڑا۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے جس کے صدر پہلے خلیفہ عبدالحکیم تھے اور ان کی وفات (۲۰ جنوری ۱۹۵۹ء) کے بعد ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مقرر ہوئے، انھیں لاہور طلب کیا اور وہ اس سے وابستہ ہو گئے۔

وہ زود نویس اور بسیار نویس تھے۔ بکایہ عام اطلاع یہ ہے کہ چند اصحاب ان کے ہاں ملازم تھے جب کسی عربی فارسی کتاب کا ترجمہ مطلوب ہوتا، اس کے چاس پچاس ساٹھ ساٹھ صفحات ان میں تقسیم کر دیتے! یوں بڑی سے بڑی کتاب کا ترجمہ دس ہندسہ دن میں مکمل ہو جاتا۔ پھر وہ اسے ایک نظر دیکھ کر کتابوں کے حوالے کر دیتے اور نہیں بھر میں کتاب شائع ہو جاتی۔ بلا مبالغہ ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد سینکڑوں سے کم نہیں ہوگی، اور بعض ان میں سے اچھی خاصی ضخیم ہیں۔ پھر ان کے موضوعات بھی بے حد متنوع ہیں: ناول، افسانہ، علم و ادب، سیاست و معیشت، سیرت و سوانح، تاریخ و تذکرہ، حدیث و فقہ غرض تراجم و تالیفات کا ایک انبار ان سے یادگار ہے۔

ظاہر ہے کہ اتنی محنت شاقہ اور تنگ و دو میں صحت کب تک ساتھ دیتی! تندرستی خراب ہو گئی اور بہت بیمار رہنے لگے۔ لاہور میں وہ اکیلے رہتے تھے، بیوی بچے کراچی میں تھے۔ یہاں دو مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ اس سے کچھ احتیاط برتنے لگے تھے، لیکن مدتوں کی بگڑی ہوئی صحت کیسے بحال ہو جاتی!

کراچی جانے کے لیے ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن گئے۔ یہیں دل کا دورہ پڑا اور آٹا ناٹا جان بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

واقف مراد آبادی، سید یعقوب الحسن

۲۶ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو سنبھل میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد مدثری کا پیشہ اختیار کیا۔ طبیعت میں مزاج کا مادہ تھا اور پڑھنے کا انداز بہت ڈرامائی اور سیاختہ! اور اسی پہلو سے ان کی شہرت تھی، اسی باعث فلم داؤں کی نظر بھی ان پر پڑی۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں یہ فلموں کے گانے اور گیت اور مکالمے لکھنے کے سلسلے میں ممبئی پہنچے۔ تقسیم ملک کے بعد بھی بہت دن پریشان اور بیکار رہے۔ ۱۹۵۷ء میں بعض دوستوں کی مدد سے کیمپ کالج اور دیال شیکھ کالج، دلی میں اردو پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ اگلی چند برس ہوئے، وہاں سے الگ ہوئے تو اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ان کا پانچ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ تحقیق مقرر کر دیا تھا۔

بہت دن سے بیمار تھے، غالباً کینسر کی شکایت تھی۔ یہ موزی مرض لا علاج ہے۔ اسی میں ۱۶/۱۵ دسمبر ۱۹۶۹ء کی درمیانی شب میں انتقال ہوا، اور ۱۶ دسمبر کو کوٹلہ فیروز شاہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

انھوں نے کسی زمانے میں رباعیات، عمر خیام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا؛ یہ چھپ چکا ہے۔

تذکرہ معاصرین

اور کلام بھی مقدار میں بہت ہوگا، جو غیر مطبوعہ رہ گیا۔
نمونہ کلام میں دو نظمیں ملاحظہ ہوں:

ٹرانزسٹریاگانوں کا پیارہ

اس ترقی کے زمانے میں بڑھیں شفعیال
ریڈیو ہر گھر میں ہے یوں تو چائے اک وال
کائنات شوق ہے، یادقت کی سوغات ہے
کیا کوئی سمجھے، جو اس کا فیض بے اندازہ ہے
عشق کا میٹر ہے یہ، تب تو گلے کا بار ہے
شانے پر لٹکائے آنکھیں بند، اس کی دھن میں
کتنے موسیقاروں کا ہے اتنے سے ڈبے میں گھر
مبہ ہیں اس میں، رفیع و زہرہ و طلعت، کیش
چلتے پھرتے سنتے رہیے، طلبہ، سارنگی، ستار
وٹھوکی، نویت، نگار، بانسری اور جلیترنگ
دادرا، بھمری، غزل، ہنگامہ، شعر و سخن
قرأتِ قرآن، امان بھی اور تو انلیاں
اس سے ہلکا پڑ گیا ہے ہجر کا کالانجار
یار کی آواز میں جلوہ منائی دیکھنی
زن سے نکلی سائیکل، گاتی بجاتی شان سے
کاش اپنے ہوش میں ہوں، سر پھرے نیچو
اک بڑی بی جا رہی تھیں، مجھک چکی جن کی کمر

لڑکے البیلے تے ہیں، لڑکیاں البیلیاں
دیدنی پر آج سڑکوں پر نئی اک بھیر چال
آج جس رسیا کو دیکھیں، ٹرانزسٹریاگانوں کا پیارہ ہے
ہر خواں کا جوشِ افسردہ اسی سے تازہ ہے
یہ بتا سکتا ہے، اب وحشت کی کیا رفتار ہے
ہجر میں بھی وصل جاناں کا کیے ہے بندوبست
گیتاوت، شمشاد، آشا اور لت منگیشکر
ہیں شریا، نور دشتی اور اقبال و سریش
والم، برڈنگ، شہنائی، کلارونٹ، گٹار
ڈھولا، نوشکی و کجری، آہا اور ددل کے رنگ
گیت اور ٹپتہ، ترانہ، دوپے، میر کے بھجن
لہرائیں، ناچ کی گیت، گھونگر و اداریاں
ہے اسی ڈبے میں اب آواز اور تصویر آیا
اک ذرا کھٹکا دیا، گردن جھکائی دیکھنی
چونک اٹھے رہ گئے اک دم اس چائیکٹان سے
دیکھیں موقع محل، گانا ہے کیا، ہیں کہاں
اور ادھر چالو ہے گانا، آج کے برج رنگ پر

”یا تم ہم کو بنا لو، پھر مزہ ہے پیار کا“
 آگئی اُن کو سنہی، پٹی وہ خواری کے لیے
 اپنی نانی سے کرے یاری تو ہو گا دل بھی سا
 گھر سے کیوں نکلا ہے باہر لے بھینا کا فراق
 ساتھ میت کے اُدھر چنیں کسی غمناک کی
 پھر صدائی کہ منہ مت بردلی سے موڑنا
 راجہ نامی پہلو اُن وں سے ٹرانک، کٹن
 بے تحاشا پہلو اُن نے مڑ کے گردن دابی
 طالبہ کا پیچھا کر کے پھٹ پڑیں رسوائیاں
 جاری ہے ساتھ دلہن کو لیے کوئی برات
 ”خاک ڈالو اس خوشی پر جب کہ جی گھبراہا
 دھوم سے دیکھو محبت کا خزانہ جا رہا“

مستقبل کی تعلیم و تعلیم کا ہیں

اس ترقی کے زمانے کی جو کچھ رفتار ہے
 آج کی تعلیم کا ہیں، ہوئی مستقبل پہ باد
 ہوگی اپنے دیش میں تعلیم کی دنیا بحال
 سنکر ترقی دیش کی پھر جی اٹھیں گی ایک بار
 اک انوکھے ڈھنگ پر بدلیگا تعلیمی نظام
 کورس سے خارج وہ سب بیکار جو بیکٹ،
 مہتری یا تھیلو جی، سائنس، کامرس و حنا
 وہ بتاتی ہے کہ اب کلچر کا بیڑہ پار ہے
 اتنی جنریشن تک آجائیں گی اک تازہ بہار
 حسب اندازہ ہے، ڈٹینگ پریڈ پچیس سال
 ثوق سے ڈالے گلے میں، ویٹ کے کلچر کا ہا
 آئینے تہذیب نو کے، کالجوں کے صبح و شام
 ماڈرن کلچر میں اسٹوڈنٹ سب پرفیکٹ ہوں
 جاگرتی، انجینئرنگ اور بیالوجی، دور از نصا

گیس، ریونگ، بانگ اور انڈنگ کمپری
ہر پر دوسرے بھی ہوگا ڈانس ڈگری ہو لہ
مینو، آشا بھوسلے، موتی، ادے سنگ، بریش
جس میں ہوگی دور پوری چھوٹ مسنگ کے لیے
ٹھیکس، ڈنڈ پلینا، خوش فعلیاں، گماٹنگ
چل کبڑی، دے چھپا چھپ ہر طرف ترال ہو
کمپٹیشن سازوگانے میں، یہ پریاں، وہ پری
پھر انہ کھے ڈھنگ سے تہذیب کی ہو سچ
ہیرو، ہیر دین، وین اور ویمپ کے سب مشغلے
اڈرن کلچر کے اپنانے پہ ہوگا بارڈ فورس
گر جو آزادی کے ہیں سارے سکھائے جائینگے
ننگنی، ٹیکہ، بیاہ کے سارے جھیلے طاق پر
مین کلچر، نو پلین، نو کو، سچن آف کاسٹ
یوں نظام نو، سہولت کے موافق آئیگا
سب بھلا دیگا وہ کالی داس اور غالب کے نام
پھر تو دنیا نے محبت میں، مزہ دوانس کا
آئے دن لڑکوں سے ہوگی لڑکیوں کی بھٹی
گر ہوئے عاجز تو تھانے میں رپٹ لکھو اٹینگے
اور نہایت ہی ادب سے جھنپ کر فرمائینگے
گھر میں اپنے بھائی سے فرمائے، ایسا مذاق
ہوگی بدنامی ہماری ہر کوئی سن رہیگا

ڈانس، میوزک، ایکٹنگ، سنگ، سوئیڈن سٹری
گیس اور گانے میں ماہر ہونگے سارے لکچر
ہونگے ٹیچر، جیسے دارا سنگھ اور طلعت، مکیش
پیریڈ پہلا، یہ ورزش اور ریلنگ کے لیے
لڑکیوں، لڑکوں کی کشتی، مگر راو رحمتا سنگ
دور گر گھنٹہ بجے، پانی میں والی بال ہو
تیسرے گھنٹے میں میوزک، سانگس اور کسٹرا
ہوگا چوتھے پیریڈ میں ڈانس بھی کمپری
پانچویں گھنٹے میں فلمی ایکٹنگ کے سب فرے
پھر چھٹے گھنٹے میں سوشل اسڈی کا خاص کورس
کیا فریڈم کے ہیں معنی، وہ بتائے جائینگے
ہر طرح آزاد سب ہوں خود چنیں اپنے پیر
پایکنگے دیش میں کوئی نہ سائن آف پاسٹ
آخری گھنٹہ فقط تعلیم کا رہ جائیگا
کارلائل، شکسپیر، رینالڈ دملٹن کا کلام
ایٹ کے کلچر کا نمبر بھی نہ ہوگا پاس کا
ذہنیت پھر سٹیکس کی بدے وہ ہوگا یا لٹ
لڑکیاں لڑکوں کو چھیرینگے تو وہ ٹرائینگے
ان میں کچھ حیدار اگر ہونگے تو وہ ڈٹ جائینگے
دیکھنے میں صاحبہ! ہم کو منسی ایسی ہے شاق
گر کسی نے دیکھ پایا، آپ کا کیا جائیگا

ہم کو آوارہ سمجھ کر آپ کرتی ہیں خفیف
ہم بھی باغزت ہیں جی ہاں اور گھرانے کے شریف

اب کچھ خیام کی رباعیوں کے ترجمے کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ مقابلے کی سہولت کے لیے خیام کی
اصلی رباعیاں بھی دے رہا ہوں

دی کو زہ گرے بدیم اندر بازار
بر پارہ بگلے مکدہمی زد بسیار
داں گل بزبان حال باومی گفت
من بچو تو بودہ ام، مرا نیکو دار

تا بود و دم ز عشق محروم نشد
کم بود ز اسرار کہ معلوم نشد
اکنوں کہ ہمی سنگرم، از رخسار خود
معلوم شد کہ بیچ معلوم نشد

گر من ز بے مغانہ مہتم، ہستم
ور کا فرد گبر و بت پرہتم، ہستم
ہر طائفہ بمن گمانے دارو
من زان خودم چنانکہ ہستم، ہستم

گر بادہ خوری تو، با خرد منداں خور
یا با صنی سادہ رخ و خنداں خور
بسیار خور و در ممکن آقا ش مساز
اندک خور و گہ کہ خور و پہناں خور

کل دیکھتا رہا میں حسین ایک کو زہ گر
مٹی کو منہ رہا تھا جو لاتوں سے کھوند کر
مٹی زبان حال سے گویا یہ کہتی تھی
کچھ گلہ خوں کی خاک ہے مجھ میں بھی، بیخبر!

کہتے کو میں تحقیق سے محروم نہیں
اک نکتہ اسرار بھی معدوم نہیں
از رخسار خود اب جو یہ سب دیکھتا ہوں
معلوم ہوا، خاک بھی معلوم نہیں

بدست شرابی ہوں، دیوانہ کہ سودائی
کافر ہوں کہ مشرک ہوں، موسائی کہ عیسائی
کیا میری بد اعمالی پٹیلی زمانے کو
لاکھوں مرے مذہب ہیں، مسلک ہر جانی

جو مے کا شوق ہے پی جا کے ذی شعور دں میں
گلوں کی چھاؤں میں، یا ناشگفتہ حور دں میں
نہ ڈگدگا کے، جو عادت پڑے بھرم جائے
چھپا کے ٹھوڑی سی، وہ بھی نہ جی حضور دں میں

تذکرہ معاصرین

گرے نخوری طعنہ مزں متاں را
ہے فخر اسی پر کہ توئے خوار نہیں
گردست دہا تو بہ کنم بڑواں را
زندوں کی بھی تو بہ کوئی دشوار نہیں
تو فخر بدیں کنی کہ من کے نخورم
اعمال وہ بترے ہیں کہ شر ہے شراب
صدکار کنی کہ منے غلام است
صد شکر کہ ہم رند بیاکار نہیں

پیرے دیدم بجائے نھارے
میں لے اک بوڑھے کو مینا نے میں دیکھا تو کہا
گفتم نکمی ز رفتگاں اخبار
واہ کیا کہنا یہ سن آپ کا، یہ ریش و قبا!
گفتا: منے خور کہ ہچو من بسیار
بولانا دان! غنیمت ہے یہ مہلت ملی لے
رفتہ کسے باز نیامد بارے
پھر کوئی لوٹ کے آیا ہے، یہاں سے جو گیا؟

زاہد بہ زنی فاحشہ گفتا: مستی
اک پیر جی نے فاحشہ عورت سے یہ کہا
کز خیر گستی و بہ شر پیوستی
بیشرم! تجھ کو خوفِ خدا بھی نہیں ذرا!
زن گفت: اچانکہ می نمایم، تم
کی عرض اُس نے جیسی بھی ہوں، ہوں حقیقتاً
تو نیز چانکہ می نمایم، مستی
فرمائینگے کچھ اپنے بھی باطن کا ماحرہ؟

جامی حیدر آبادی، خورشید احمد

حیدر آباد کے ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کا منقط الرأس دراصل پرہیزی (ہمارا ٹیٹر) تھا، جہاں سے ان کے نانا قاضی صدیق احمد فہیم تخلص نقل مکان کر کے حیدر آباد آئے اور یہاں وکیل سرکار مقرر ہو گئے۔ جامی کے والد مولوی محمد یعقوب بھی عالم دین تھے۔

جامی حیدر آباد میں ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہو گیا۔ اس کے بعد تعلیم و تربیت اپنی والدہ اور نانی کی نگرانی میں پائی۔ عربی فارسی اور دنیا کی تعلیم گھر پر ہوئی اور بعد کے زمانے (۱۹۳۲ء) میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔ کسب معاش کے لیے چندے محکمہ آبکاری میں ملازم رہے اور اس میں انسپکٹری کے عہدے تک ترقی کی؛ لیکن جلد ہی دل اُچاٹ ہو گیا اور اسے ^{سنت} دے دیا۔

انھوں نے ۲۲ برس کی عمر یعنی ۱۹۳۷ء میں شعر کہنا شروع کیا اور اس میں فصاحت

جنگ جلیل مانچوری سے مشورہ رہا۔ ان کی وفات کے کچھ دن بعد علی اختر حیدر آبادی ادب پر جوش ملیح آبادی سے کبھی اصلاح لی۔ وہ شاعری میں اقبال، فراق اور فیض سے بہت متاثر ہوئے جلد جلد ترقی کی منزلیں طے کیں، غزل اور نظم دونوں سے دلچسپی تھی۔ ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے ان کی متعدد کتابیں چھپیں، جن میں پنجوں کے لیے بعض کتابچے بھی ہیں۔ ان کے تین ابتدائی شعری مجموعے، شرارے، نشانِ راہ، منزل کی طرف، اٹھتے۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے رنگِ سخن بدلا۔ اس کے بعد دو مجموعے اور شائع ہوئے، رخسارِ سحر، یہ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں چھپا، اور دوسرا برگِ آوارہ ۱۹۶۸ء میں تیسرا دیوان بھی مرتب کر لیا تھا، لیکن اس کے چھپنے کی فہمت نہیں آئی تھی کہ اس سے قبل خود ان کی کتاب زندگی کا ورق الٹا دیا گیا۔ یہ ان کی وفات کے بعد یاد کی خوشبو کے عنوان سے چھپا (حیدر آباد ۱۹۷۱ء)

لیکن جتنا کلام شائع ہوا، اس سے کہیں زیادہ انھوں نے دوسروں کی نذر کر دیا۔ ان کی بدولت کئی لوگ صاحبِ دیوان ہو گئے، ان میں سے بعض آج خاصے مشہور شاعر ہیں۔ آندھرا پردیش سہ ماہیہ اکاڈمی نے ۱۹۶۰ء میں ان کی ادبی خدمات کا اعتراف، انعام سے کیا۔ پانچ سال اُن کے تذاتحوں اور قدردانوں نے جشنِ جامی منانے کی تیاری شروع کی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'قیمتِ عرضِ ہنر' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔

وہ صحیح معنوں میں شاعر اور خادمِ ادب تھے، لیکن خود نمائش سے کوسوں دور۔ تذاتحوں انھوں نے شاعروں سے کوئی سروکار نہیں رکھا، بلکہ احباب کی نجی مجالس تک میں بھی شعر نہ مانے کے روادار نہیں تھے۔ ادھر پچھلے دو چار سال سے احباب کے اصرار پر کبھی کبھی شاعر سے میں چلے جاتے، لیکن اس طرح جیسے کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہو۔ تاہم کارِ رنگِ پالا ہی نہیں سادی غمِ تجرّد میں اُڑی۔

صحت ہمیشہ بالعموم اچھی رہی۔ اگرچہ آخری ایام میں مختلف عوارض کی شکایت کرنے لگے

تھے، اور بد قسمتی سے کوئی آٹھ مہینے ہوئے، اکیسٹر کے موذی مرض کا شکار ہو گئے، جب ان کی حالت تشویشناک شکل اختیار کر گئی، تو ۱۸ فروری کو انھیں بغرض علاج دوا خانہ عثمانیہ میں داخل کر دیا گیا۔ یہیں ۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو اور شام کے وقت جان جان آفرین کے سپرد کی۔ ہوش و حواس آخر تک درست رہے، بلکہ چند منٹ پہلے تک بات چیت کرتے رہے۔ لاش اسی دن اسپتال سے ان کے مکان (محلہ سلطانپور) منتقل کر دی گئی، جہاں سے اگلے دن (۹ مارچ کو) بعد عصر جنازہ اٹھا۔ نماز جنازہ مسجد کھڑاویں دالے شاہ صاحب میں ادا کی گئی اور احاطہ چونیٹی شاہ کے قبرستان (عثمانپورہ) میں سپرد خاک ہوئے۔ نورانی بیگم نے قطعہ تاریخ وفات کہا:

شور ہے ملکِ معنیٰ میں بسا ہائے کیا جامی کو ہم نے کھو دیا
سالِ منقوطہ یہ نورانی! لکھو "حیف کی غور شیدا احمد نے قضا"

(۱۹۷۰)

جامی کے کلام میں سنجیدہ تفکر ہے۔ وہ زندگی اور زندگی کے مسائل پر انوکھے انداز میں سوچتے ہیں۔ ان کے ہاں تشبیہ و استعارہ کی تازگی بھی ملتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ اس دور کے ممتاز لکھنے والے تھے۔

پہچان بھی سکی نہ مری زندگی مجھے اتنی رواروی میں کہیں سا مٹا ہوا
ترے قریب پہنچ کر بھی کم نہیں ہوتے غم حیات نے جو فاصلے بڑھائے ہیں
ہنگامہ حیات میں اے شمعِ دلبری! لمحاتِ دل ملے، تو بہت مختصر ملے
کتنی شبوں کا زہریلا ہے نگاہ نے اس انتظار میں کہ نگارِ سحر ملے
حالاتِ خود ہی پاؤں کی زنجیر بن گئے ورنہ کچھ اتنی دور نہ تھی تیری آنجن
شعورِ غم کے سوا کچھ نہیں ہے غم کا علاج مگر یہ بات زمانے کو کون سمجھائے
ناصحو! میرے ساتھ ساتھ ذرا تم بھی اس رنگِ رملک آؤ

جلا ہے کس کا ہوا رات بھر چراغوں میں
 اسی نگاہ نے جینا سکھا دیا مجھ کو
 وہ حیات میں کتنے ہی پیچ و خم آئے
 یہ اور بات کہ دل سُن کے ہو گیا انجان
 دیکھا تو لوحِ دل پہ ترے نام کے سوا
 کچھ دور آؤ موت کے ہمراہ بھی چلیں
 جامی، مرے خلوص نے سینے میں دکھ لیے
 نیم تاریک سی گلیوں میں کہیں ٹھہرا کر
 کچھ دیے اور جلاؤں کا سہرا بہار
 دی راتیں ہیں وہی زخم، وہی رابگزر
 وہ غم، شور، غم کی جسے آگ مل گئی
 لرز گیا مری تنہائیوں کے شانے پر
 اک عمر ساتھ ساتھ مرے زندگی رہی
 کس سے کرتا دلِ خود دار غموں کا سودا؟
 جب بھی ملے وہ مجھ سے، انے روپ میں ملے
 غم کی دادی ہے، نہ یادوں کا سلگتا جنگل
 اعتبارِ نشاط سے پہلے
 غم دوراں سے مشورہ کروں
 لے کے پھرتی ہیں آندھیاں جس کو
 دل کی راہوں میں کوئی سایہ لرزاں بھی
 اس طرح ترے درد کو سینے سے لگایا
 کا ندھوں پہ اٹھائے ہوئے صدیوں کا اندھیرا
 پھرتے ہیں مہ و ہر کی آغوش کے پالے

امید کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے لگ کر سوار جو سوچا ہے وہی سوچ رہا ہوں
 اور اقی بہاراں کو ابھراک بار الٹ کر دیکھو تو سہی، نام ہمارا بھی کہیں ہے
 صدیوں سے اسی طرح بھٹکتی ہے خدائی صدیوں سے اسی طرح خدا عرش نشین ہے
 وقت نے رات کے ہاتھوں کو جکڑ رکھا تھا صبح کے پاؤں میں حالات کی زنجیریں ہیں
 آج مقروض وہی دست عزیزوں کی طرح میرے خوابوں سے گریزاں، مری تعبیریں ہیں
 جیسے ریشم میں پیٹے، کوئی انگاروں کو یوں حقائق کے بدن پر ہیں فسانوں کے لباس
 دل میں اس طرح ترا درد ابھرتا ہے نرم مٹی پہ کوئی نقش کھنکھ پا جیسے
 یوں تو ہر سمت ترے شہر میں ہنگامہ ہے اور پھر بھی ہے، ہر اک شخص اکیلا جیسے
 اس طرح پھانسیوں نے پکارا ہمیں کہ ہم جیسے کوئی رسول تھے، اہل کتاب تھے
 ہر اجنبی سے اپنا پتا پوچھتے پھرے ہم سے جہاں میں اور بھی خانہ خراب تھے
 کل ہم وہاں سے آئے یہی سوچتے رہے آخر، ہر ایک چہرے پہ کتنے نقاب تھے
 بہت کچھ، جو کتابوں میں نہیں تھا وہ چہروں کی لکڑیوں میں پڑھا ہے
 زندگی طنز ہے، دشنام ہے رسوائی ہے سب تماشا ہے یہاں، کون تماشا ٹی ہے
 غم کی قندیل جلاؤ کہ بہت ممکن ہے کوئی یہاں ہر شام، مرے گھر آئے
 لوگ پھرتے ہیں یہاں حرفِ ملامت کی طرح زندگانی کا یقیں آئے، تو کیونکر آئے
 جس طرف مجمعِ احباب کھڑا تھا، جامی! ہم پہ آئے تو اسی سمت سے تپھر آئے
 اب زندگی کے نام پہ یوں چونکتا ہوں میں جیسے نیا خیال ہے موضوعِ گفتگو
 دبے پڑے ہیں کہیں شیرگی کے مدفن میں وہ لوگ، جن کو تاروں کا قرب حاصل تھا
 بڑے عجیب ہیں یہ درد و غم کے رستے بھی کہ جس کو دیکھیے، اپنا دکھائی دیتا ہے
 زندگانی کو ہلکتے ہوئے سایے کی طرح دل کی گلیوں سے کئی بار گزرتے دیکھا
 کتنے چہروں پہ غم دہر کی تخریر پڑھی کتنی آنکھوں میں سوالوں کو ابھرتے دیکھا

ہائے، اک اذن تبسم کے لیے، کلیوں کو
 مشورہ تلخی ایام سے کرتے دیکھا
 تجھ کو پایا، تو دھڑکتے ہوئے دل میں پایا
 تجھ کو دیکھا، تو خیالوں سے گزرتے دیکھا
 وقت کی تیزی رفتار کی زد میں، آکر
 ہم نے اک عہدِ روایات کو مرنے دیکھا
 احساس کے شعلے، نہ امیدوں کے سمندر
 انسان ہیں، یا صرف تراشے ہوئے پتھر
 حباب کے خلوص میں شاید کمی ہوئی
 دل کے قریب، لوک بناں بھی نہیں کوئی
 حالات کے فریب نے پتھر بنا دیا
 اب زندگی تو بارگراں بھی نہیں کوئی
 اپنے قبضے میں تو زخموں کی بڑی دولت ہے
 کیوں نہ پھر وقت کا سب قرض چکایا جائے
 دل میں اس طرح ترے درد کو رکھ لیتا ہوں
 جیسے گھر میں کسی مجرم کو چھپایا جائے
 اب زلفِ عنبریں کی پناہیں نہیں، تو کیا
 آوارگانِ غم کے ٹھکانے ہیں اور بھی
 جلتا ہے ایک ذہن، تہکتا ہے ایک پھول
 روزِ ازل سے ہے یہی تخلیق کا اصول

دیارِ ہند

دیارِ ہند کی عظمت کا نام زندہ ہے
 اتر گیا ہے نیا آفتاب سینوں میں
 دھڑک رہے ہیں شبِ دروز کا رخاؤں کے
 ابھر رہے ہیں نئے خوابِ نرم مٹی سے
 چمک رہے ہیں نئے حوصلے کسانوں کے
 "چلے چلو" کی صداؤں سے گو بجتی ہے فضا
 رہِ حیات میں ہیں قافلے جوانوں کے

ہر ایک پھول کی پتی ہے اب مشہرہ زفاں
ہر ایک شاخ ہے کھینچی ہوئی کہاں کی طرح
نئی اُننگ نئے جوش کا تقاضا ہے
عدو پہ ٹوٹ پڑو، مرگ ناگہاں کی طرح
فریب کا راند صیروں کے فرق پر چمکو
بہ نامِ حسنِ سحر تیغِ بے اماں کی طرح

چلے چلو کہ ابھی سرحدیں ہیں خطرے میں
پک رہے ہیں جہنم کے چھتے سائے
چلے چلو کہ گلستانِ امن و آزاد ی
تھکاری جراثیمِ بیباک سے نکھر جائے
نظر میں آگِ ارادوں میں بجلیاں لے کر
چلے چلو کہ ہر اک فاصلہ سمٹ آئے
دیارِ سند کی عظمت کا نام زندہ ہے

عبد الشکور (پروفیسر)

ان کے والد عبداللطیف صاحب سرکار انگریزی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ڈپٹی کلکٹری تک ترقی پائی اور نیشن کے بعد اپنی وفات (۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء) تک بریلی میں مقیم رہے۔ پروفیسر عبدالشکور مرحوم یہیں بریلی میں ۳ جولائی ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول تک انھوں نے تعلیم بھی بریلی ہی میں پائی۔ اس کے بعد ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا اور یہاں سے یکے بعد دیگرے ایم اے (انگریزی) اور بی ٹی کی اسناد حاصل کیں۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے ملازمت کا آغاز علی گڑھ ہی سے کیا۔ یہاں وہ انگریزی کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں انھیں جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن سے دعوت ملی اور وہ علی گڑھ چھوڑ کر وہاں چلے گئے۔ یہاں ۱۹۳۳ء تک ڈربن کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ اس سال واپس وطن آئے، تو بریلی کالج میں جگہ مل گئی، اس کالج میں وہ ۱۹۴۱ء تک رہے اور اسی سال یہاں سے حلیم کالج کے پرنسپل ہو کر کانپور منتقل ہو گئے، جس اتفاق سے انھیں یہاں ترقی کا موقع میسر آ گیا، اور رضا کالج رامپور کی پرنسپل کی پیشکش ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے کانپور سے رام پور کی راہ لی۔ ان کا ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک کا زمانہ رامپور ہی

میں گزرا، رامپور کے زمانہ ملازمت کے بعد وہ چندے بیکار بھی رہے۔ بالآخر ۱۹۵۴ء میں اٹاواہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ کالج سرسید کے ایک رفیق کار مولوی بشیر الدین احمد کی کوشش سے قائم ہوا تھا۔ اس کے ابتدائی زمانے میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے بھی یہاں تعلیم پائی تھی۔ پروفیسر عبدالشکور نے اپنے زمانہ قیام میں کالج کی ترقی اور تنظیم میں بہت کوشش کی۔ یہاں جواہر میوزیم کی توسیع میں ان کی مساعی جلیلہ بھی مفید ثابت ہوئیں۔ اس عجائب گھر میں کئی بیش قیمت نادر کتب اور خطوط اور خطی نسخے محفوظ ہیں۔ فارسی خطوط کی فہرست مرتبہ خباب محمد ابراہیم فاروقی ایم اے (علیگ) تذکرہ جواہر زواہر کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے (اٹاواہ ۱۹۵۹ء)۔

اٹاواہ میں چار سال رہنے کے بعد وہ ۱۹۵۸ء میں پھر علی گڑھ آئے۔ اب کے وہ ٹرننگ کالج سے وابستہ ہوئے۔ یہیں سے سال بھر بعد وہ مستقل ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد قیام بریلی میں رہا۔

مرحوم نے اپنے سہ سالہ قیامِ دہلی کے زمانے میں وہاں کے سماجی حالات کا غائر مطالعہ کیا تھا، اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کی پسماندگی کا بڑا سبب یہاں کی عورتوں میں تعلیم کی کمی اور گھر کی چار دیواری میں ان کا مقید رہنا ہے۔ اس سے وہ رسمی پردے کے مخالف بن گئے۔ اور اس باعث انھیں لڑکیوں کی تعلیم سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بریلی کے بعض درویند اور ترقی پسند اصحاب نے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی تھی۔ ان میں خود عبدالشکور صاحب کے والد ڈپٹی عبداللطیف صاحب بھی تھے۔ چنانچہ ان اصحاب نے ۱۹۳۴ء میں بریلی میں اسلامیہ گریڈ اسکول قائم کیا۔ اس میں انھیں اپنوں اور غیروں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آدمی تھے دھن کے پکے، حوصلہ نہیں ہالے۔ جب عبدالشکور صاحب وطن واپس آئے تو یہ بھی اسکول کی کمیٹی کے ممبر بن گئے؛ بعد کو مینجر مقرر ہو گئے۔ یہ اسکول بہت کامیاب رہا، اب تو ترقی کر کے انٹر کالج بن گیا ہے۔

تصنیف و تالیف کا شوق شروع سے تھا۔ انھوں نے متعدد کتابیں شائع کیں۔ آغاز کار میں دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا تھا: اول مشہور تاریخی ڈراما انگارہ سرک ابن کے ڈرامے ڈالز ہاؤس کا مشرقی چہرہ انگریز کا گھر کے عنوان سے شائع کیا (علی گڑھ ۱۹۲۸ء)؛ اور اس کے بعد مشہور ناول پرائڈ اینڈ پریجیوڈس کا ترجمہ۔ ان کے علاوہ روضۃ الرضوان (۱۹۱۵ء)؛ صغیر (۱۹۲۵ء)؛ تنقیدی سٹریہ، حصہ اول (۱۹۲۶ء)؛ تنقیدی سرمایہ، حصہ دوم (لکھنؤ ۱۹۵۶ء)؛ فانی (دلی ۱۹۴۷ء)؛ حسرت موہانی اور جدید کے چند منتخب منہ و شعر (لکھنؤ ۱۹۴۳ء)؛ شاہ غمگین حضرت جی اور ان کا کلام، ان کی تصنیفات میں سے زیادہ مشہور ہیں حسرت موہانی سے ان کے ذاتی گہرے مراسم تھے۔ کانپور کے زمانہ قیام میں وہ اکثر ان کے وہاں آتے تھے۔ ان کی کتاب "حسرت موہانی" کے آخر میں کلام کا انتخاب خود حسرت کا کیا ہوا ہے۔ انھوں نے سلسلہ مطبوعات اسلامیہ گریزہائی اسکول، بریلی کے عنوان سے کچھ کتابچے بھی شائع کیے تھے مثلاً گرام سدھار، ضروری باتیں (مزاحیہ خاکے) یاران میکہ (دو حصے) وغیرہ اور و نصاب کی کچھ کتابیں بھی مرتب کی تھیں، خود اکیلے بھی اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی سرک میں بھی۔ رسالوں میں بھی لکھتے رہتے تھے، ان میں طبعاً و مضمون بھی ہوتے تھے اور انگریزی سے ترجمہ بھی۔ علی گڑھ میگزین میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ آخری مضمون "فضل الرحمن اسلامیہ کالج، بریلی میگزین" کے غالب نمبر (بابت ۱۹۶۹ء۔ ۱۹۷۰ء) میں بعنوان "غالب کی ان دوستی" چھپا ہے۔ ان کے یہ مضمون ہنوز کتابی صورت میں جمع نہیں ہوئے۔

شروع میں صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ لیکن آخر آخر میں مختلف امراض کی آماجگاہ بن گئے تھے، بلکہ ایک مرتبہ موت سے چند سال قبل حالت بہت خراب ہو گئی، تو مقامی مشن اسپتال میں علاج کے لیے داخل ہونا پڑا۔ جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا، اس پر گھٹنوں اور ٹخنوں میں درد رہنے لگا؛ نماز میں رکوع و سجود سے بھی معذور ہو گئے۔ مجبوراً یہ فریضہ بیٹھے

تذکرہ معاصرین

بیٹھے ادا کرتے تھے۔ بہر حال موت کا ایک دن معین ہے، اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بھی درکار ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو سینے کے بائیں حصے میں درد کی شکایت کی اور یکایک جان بحق ہو گئے۔ بریلی ہی میں اپنے آبائی قبرستان واقعہ محلہ بھوڑ (شاہ آباد) میں دفن ہوئے۔ انا اللہ و ایلہ راجعون۔

اولادِ جسمانی میں چھ بیٹیاں اور ایک بیٹا اپنی یادگار چھوڑی۔ بیٹیاں سب یہاں ہندوستان میں ہیں۔ اور بیٹا پاکستان میں ہے، وہ وہاں کسی بنک میں ملازم ہیں۔

تاج، سید امتیاز علی

میری عمر کے جو لوگ آج سے ۵۰-۵۵ برس پہلے مدرسے میں پڑھتے ہونگے، ناممکن ہے کہ انھوں نے رکاوٹوں کا مفہم وار پرچہ "پھول" اور رکاوٹوں کا تہذیب نسواں " نہ دیکھے ہوں، یہ دونوں رسالے دارالاشاعت، لاہور کی طرف سے شائع ہوتے تھے۔ اور ان کے کرتادھرتا تھے، مولوی سید ممتاز علی، جو بعد کو شمس العلماء کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔

وہ حضرت امام رضا کی نسل سے تھے۔ ان کے اجداد اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بخارا سے ہندوستان آئے۔ اسی خاندان میں سید ممتاز علی، ۲ ستمبر ۱۸۶۰ء کو دیوبند (ضلع بہاولپور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ذوالفقار علی حکومت میں ملازم تھے۔ ممتاز علی خود مولوی محمد قاسم نانوتوی کے ابتدائی شاگردوں میں تھے، چنانچہ انھوں نے قرآن، حدیث، فقہ کی تعلیم ان سے اور مولوی محمد یعقوب سے پائی۔ اس کے بعد اپنے طور پر کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی۔ ۱۸۷۶ء میں وہ لاہور گئے اور کچھ ایسے کہ پھر عمر بھر کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ وہ سرسید کے گہرے دوست اور مؤید تھے۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے عورتوں کے لیے مفتہ دار پرچہ تہذیب نسواں جاری کیا۔ اس رسالے نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ اسم با مسمیٰ

تذکرہ معاصرین

پرچہ ہمارے ملک کی عورتوں کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و ترقی میں بہت عمدہ و معاون ثابت ہوا۔ یہ اسی کی کامیابی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۰۹ء میں انھوں نے لڑکوں کے لیے بھی 'پھول' جاری کیا۔ ہمارے بعض بہترین ادیب اور شاعر اسی 'پھول' کی دین ہیں۔ افسوس کہ یہ دونوں پرچے تقسیم ملک کے بعد بند ہو گئے۔

سید امتیاز علی خود بھی مصنف تھے، منجملہ اور کتابوں کے ان کی مرتبہ تفصیل البیان فی مقاصد القرآن (جلد) معرکے کی چیز ہے۔ اس میں قرآن کی مختلف موضوعات کے تحت تبویب کی گئی ہے اور یہ قرآن کے مضامین کا بہت مفید اور آسان اشاریہ ہے۔ ان علمی اور ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا تھا۔ ان کا ۵ جون ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ ان کی بیوی محمدی بیگم بھی اردو کی اچھی ادیبہ تھیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا ۲۲ نومبر ۱۹۰۸ء کو شملے میں انتقال ہوا اور لاہور میں دفن ہوئیں۔

ان کے دو صاحبزادے تھے حمیدہ بیگم پہلی بیوی سے، حمید علی اور محمدی بیگم سے امتیاز علی۔ یہی امتیاز علی ہماری زبان کے مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج تھے۔ مولوی امتیاز علی کے کاروبار میں خدا نے بہت برکت دی۔ لاہور میں ان کے بہت سے مکانات تھے، مطبع تھا، کچھ زرعی زمین بھی تھی۔ اس تمام جاداد کی دیکھ بھال بڑے بیٹے سید حمید علی کے سپرد تھی، تعلیم یافتہ تو وہ ضرور تھے، لیکن انھیں تصنیف و تالیف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مکانوں کا کرایہ اگاہنے اور دارالاشاعت کے تجارتی حساب کتاب میں لگن رہتے تھے۔ اس کے بالعکس سید امتیاز علی تاج کو سوائے علم و ادب کے اور کسی چیز سے سروکار نہیں تھا۔ وہ ابتدا ہی سے خاندان کے مالی معاملات سے کم و بیش کنارہ کش رہے۔

سید امتیاز علی ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کینرڈ اسکول میں پائی جو اس زمانے میں شہر میں انگریزی وضع کا ممتاز پبلک اسکول تھا۔ دسویں درجے کی سند سنٹرل

تذکرہ معاصرین

ماڈل اسکول، لاہور سے ۱۹۱۵ء میں اور بی اے کی گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۲۲ء میں حاصل کی، بی اے میں انھوں نے فارسی میں امتیاز (آنرز) پایا۔ مزید تعلیم غیر ضروری خیال کرتے ہوئے، وہ دارالاشاعت کے علمی اور ادبی شعبے کی نگرانی کرنے لگے، وہ تقریباً رُبع صدی تک "ہندوب نساں" اور "پھول" کے ایڈیٹر رہے۔

انھیں لکھنے کا شوق بہت ابتدائی زمانے سے تھا۔ جب ان کا پہلا مضمون "دیگر اکبر آبادی کے مشہور رسالے نقاد (آگروہ) میں چھپا ہے، تو ان کی عمر صرف چودہ سال کی تھی اور وہ نویں درجے میں پڑھتے تھے۔ ان کی پہلی مطبوعہ کتاب "موت کا راگ" بھی زمانہ طالب علمی کا کارنامہ ہے، یہ بچوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے ماہنامہ "دیکشاں" جاری کیا۔ یہ پرمچن ظاہری و معنوی کا نمونہ تھا اور اردو کے بہترین ادیب اس کے معاون اور مضمون نگاروں میں شامل تھے۔ تاج کوڈرامے اور تمثیل اور اداکاری سے شغف کالج کے زمانے سے تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج، لاہور کی ڈراما ٹیم کلب کے سرگرم رکن اور اداکار تھے۔ ان کا محرکہ آڈراما "انارکلی" ہے اس کا آغاز انھوں نے بی اے پاس کرنے کے بعد کیا تھا۔ جب یہ ڈراما اگلے برس ۱۹۲۳ء میں مکمل ہوا، تو تاج نے اسے آغا حشر کونایا۔ آغا حشر (ف اپریل ۱۹۳۵ء) کا ڈرامے کی دنیا میں جو مقام تھا اور ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو "ٹیک پیرمنڈ" لکھا کرتے تھے۔ حشر نے انارکلی کو دیکھا اور شا تو بہت خوش ہوئے اور کہا: (وہ اعلیٰ ملاحظہ ہو):

"میں سمجھتا تھا کہ حشر کے بعد ڈراما ختم ہو جائیگا لیکن اردو ڈرامے کے بہار کے

دن تو اب آ رہے ہیں۔"

یہ ڈراما مکمل شکل میں پہلی مرتبہ دارالاشاعت کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ ظاہری شکل و صورت میں بھی یہ اتنا دیدہ زیب تھا کہ جس نے دیکھا، اشک کر اٹھا۔ حکومت پنجاب نے اس پر انعام دیا اور یہ کتاب مدتوں بی اے، ایم اے اور مشرقی علوم کے امتحانات میں

بطور نصاب شامل رہی تاج ایک زمانے تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے اور آزادی ملک کے بعد پاکستان ریڈیو کے توگو یا بانیوں ہی میں تھے۔ دونوں جگہ انھوں نے ڈراما کی قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ انھوں نے اسی شوق کی تسکین میں اردو کے کلاسیکی ڈرامے کی ترتیب تدوین ہاتھ میں لی۔ ان ڈراموں کی تلاش کے سلسلے میں وہ چند برس ہوئے، سندھ تان بھی آئے تھے۔ جہاں سے بھی انھیں یہ ڈرامے ملے، انھوں نے حاصل کیے۔ اگر مالک نے کتاب (پاکستان) ارگ کرنا منظور نہ کیا، تو اس کی نقل کروائی۔ اس کے بعد انھوں نے ان ڈراموں کا متن صحیح کیا، ان پر حواشی لکھے اور انھیں اپنے تنقیدی تبصرے کے ساتھ شائع کر دیا۔ اردو میں ڈرامے کو کبھی قابل اعتبار نہ سمجھا گیا۔ خود ڈراما نگاروں نے بھی اپنی تصنیفات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو ڈرامے شائع بھی ہوئے، وہ خود مصنف کی تصحیح اور نظر ثانی سے محروم رہے۔ نقصہ مطبوعہ ڈرامے بجز ناقص، اور ان کا متن بجز غلط تھا۔ اس لیے جب تاج نے ان ڈراموں کو مجموعہ معیار صحت متن و تنقید کے بعد شائع کرنے کا فیصلہ کیا، تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنا جان جو کھم کا کام تھا۔ لیکن ان کے صبر و استقلال کی داد دینا چاہیے کہ ان سب مشکلات کے باوجود ہمت نہیں ہارے۔ انھوں نے ان ڈراموں کو تیس جلدوں میں تدوین کیا، اور ان میں سے مندرجہ ذیل کلاسیکی ڈراما نویسوں کی تخلیقات سات جلدوں میں شائع کر دیں:

(۱) بھٹی میں اردو کا پہلا ڈراما۔ خورشید مع اردو ڈرامے کا تاریخی جائزہ؛ (۲) آرام کے ڈرامے (دو جلد)؛ (۳) ظریف کے ڈرامے؛ (۴) رونق کے ڈرامے (۲ جلد)؛ (۵) حباب کے ڈرامے۔ سات مزید جلدیں مطبع کے لیے تیار تھیں۔ یقینہ جلدوں کا مواد جمع تھا اور ان کے لیے یادداشتیں بھی قلمبند کر لی تھیں۔ افسوس کہ ان کی ناگہانی موت کے باعث یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ اسی نظر اور تجربے کا آدمی کہاں ملیگا کہ اسے پورا کر سکے!

ڈراموں کے علاوہ انھیں افسانہ اور عورتوں اور بچوں کے ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے اخراجھوٹ نہ بلوائے، عورتوں اور بچوں کے لیے کوئی سو کتابیں تو ضرور لکھی ہونگی جیسا کہ

اوپر ذکر ہوا ان کی سب سے پہلی کتاب "موت کاراگ" بھی بچوں کے لیے تھی۔ ان کتابوں کی حکمت و تعلیم نے بھی قدر کی، ان میں سے مشیر نصاب یا معاون نصاب قرار پائیں۔

افسانے سے دلچسپی کے باعث ہی انھوں نے کہکشاں جاری کیا تھا۔ اس میں وقت کے بہترین افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہو کر تے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مشہور انگریزی مزاح نگار جیروم کے ایک خاکے (Three Men in a Boat) سے متاثر کر کے مشہور مہنامہ نیرنگ خیال لاہور کے لیے ایک ہلکا پھلکا مزاحی افسانہ لکھا: چچا چھکن نے تصویر ٹانگی۔ اس کے بعد انھوں نے اسی رنگ کے چند طبعزاد خاکے اور بھی لکھے۔ یہ سب "چچا چھکن" کے عنوان سے ایک بتلی سی کتاب میں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بتلی سی کتاب (مبشکل... صفحات) کئی ضمیمہ کتابوں اور مجموعوں پر بھاری ہے۔ جس طرح سرشار کے فسانہ آزاد کا کردار خوجی سارے ادب میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح تاج صاحب کا کردار چچا چھکن ہے۔

اتیار علی تاج نے کئی انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے جن میں سکسپیر کا ڈراما: دینرٹس ڈیم لارڈ لٹن کا ایلیا یا محاصرہ غرناطہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کسی زمانے میں لارڈ لٹن کی اس کتاب کا ترجمہ جسٹس محمود (خلف سرسید مرحوم) نے ہندوستان کے لیے شائع کیا تھا۔ لیکن چند قسطوں کے بعد یہ کہہ کر اس سے ہاتھ مٹھالیا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنا ممکن نہیں، تاج کا ترجمہ پوری کتاب کا ہے۔

انھوں نے سید احمد شاہ بخاری "پطرس" مرحوم کی شرکت میں جارج برنارڈشا کا ڈراما آرمز اینڈ دی مین، ٹی، ایس ایلیٹ کے The Man at the Popomack. کیرل چپیک کی

R. U. R. اور متعدد ایک ایکٹ کے ڈرامے اردو میں منتقل کیے اور پھر انھیں کھیلوا بھی۔ ان کے علاوہ وکٹر ہیوگو، ایڈگر ایلن پو، اسکوایلڈ اور کئی اور یورپی اور امریکی مصنفوں کی نگارشات کے ترجمے بھی ان کے مرہونِ منت ہیں؛ پوری فہرست کہاں دی جاسکتی ہے!۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ تاج ان کا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے، ہوا یہ کہ بچپن میں ان کی والدہ انھیں پیار سے تاج کہہ کر پکارتی تھیں، جو گویا امتیاز کی تحریف تھی۔ رفتہ رفتہ گھر کے سب لوگ اور پھر ان کے احباب بھی انھیں اسی عرف سے پکارنے لگے، اور بالآخر انھوں نے خود بھی اسے اپنے نام کا جزو بنالیا۔

ان کی بیگم اردو کی مشہور افسانہ نگار حجاب ہیں جو شادی سے پہلے حجاب اسماعیل کے نام سے لکھتی رہی تھیں۔ اولاد جسمانی میں صرف ایک لڑکی (پاسمین) ہوئی۔

وہ پچھلے دس برس سے لاہور کے مشہور ادارے انجمن ترقی ادب کے ڈائریکٹر تھے۔ اس ادارے کی طرف سے اردو کا کلاسیکی ادب جس اہتمام اور آب و تاب سے شائع ہوا ہے، اس کے لیے بہت حد تک خود تاج صاحب دومہ دار تھے۔ حکومت پاکستان نے ان کی گونا گون علمی اور ادبی اور تہذیبی خدمات کے صلے میں انھیں ستارہ امتیاز کا تمغہ عطا فرمایا، جو ان کے نام کی مناسبت سے گویا انھیں کے لیے وضع ہوا تھا، اس کے علاوہ اعلیٰ ادبی کارکردگی کا انعام بھی ملا تھا۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۲۸ء میں ہوئی، جب میں انٹر کے بعد مزید تعلیم کے سلسلے میں لاہور پہنچا ہوں۔ لایہ تھا کہ میں تبدیکج یہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں پہنچتا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور چونکہ وہ ان حلقوں کے کل سرسبد تھے، لہذا ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء دو سال گوالمنڈی میں کرایے کے مکان میں مقیم رہا تھا۔ یہ مکان انھیں کی جاداد کا حصہ تھا۔ اسی محلے کی پشت پر یلوے روڈ ہے، جہاں دارالاشاعت کا دفتر اور ان کے خاندان کے سکونت مکان تھے۔ اس زمانے میں بھی ان سے ملنا جلنا رہا۔ ان سے مل کر دل مسرت ہوتی۔ ان میں ہمیشہ علمی وقار اور علم دوستی کی ملنساری کا جذبہ پایا۔

اخنوس کہ علم و ادب کے اس دیرینہ خادم کا انجام بہت المناک ہوا۔ ۱۸ اپریل کی شب میں دونوں میاں بیوی اپنے مکان کی چھت پر سو رہے تھے کہ دو نقاب پوش شخص آئے اور انھوں نے تاج صاحب پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ آواز سے بیگم بھی جاگ اٹھیں اور انھوں نے بچ بچاؤ

کی کوشش کی، لیکن بیود۔ دونوں میاں بیوی زخمی ہو گئے۔ تاج صاحب کو بالخصوص بہت زخم آئے۔ اسی حالت میں انھیں اسپتال پہنچایا گیا۔ علاج معالجے میں کوئی فروگزاشت نہیں ہوئی، لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے؟ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکے اور اگلے دن (۱۱۹ پرل) سہ پہر کو جان بحق ہو گئے۔ انا للہِ ذِ اِنَّا الیہِ راجعون۔

جنازہ ۲ کو اٹھا اور انھیں مومن پورہ (سیکلوڈ روڈ) کے قبرستان میں اپنی والدہ محمدی بیگم کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ کلب علی خان فائق کی کہی ہوئی تاریخ ہے:

کہو با آہ سالِ رحلتِ تاج
تاجِ خلدِ بریں میں جا پہنچے

۱۳۹۰ = ۱۳۸۳ + ۷

شکیل بدایونی، شکیل احمد

۳ اگست ۱۹۱۶ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تارخچی نام غفار احمد تھا جس سے سنہ ہجری ۱۳۳۲ (۲ سوال) برآمد ہوتا ہے۔ ان کے دادا منشی ہدایت اللہ سوختہ محکمہ سرحدوں میں ملازم تھے اور اسی جگہ سے سبکدوش ہوئے۔ ان کے دیکھنے والے ان کی نیکی، خوش مزاجی اور دینداری کا عزم کرتے ہیں۔ ان کا خاندان سوختہ کہلاتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں کوئی صاحب آگ سے جلے ہوئے تھے، اسی سے یہ نام پڑا۔ اس سے ایک بات یاد آگئی: کانگریس کے لیڈروں میں ایک صاحب منظر علی سوختہ ہوئے ہیں، وہ بھی اسی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد منشی مبارک علی سوختہ پنڈت موتی لال ہنردھرم کے محضر تھے اور آئین بھون، الہ آباد میں رہتے تھے۔ پنڈت جی ان پر بہت ہرمان تھے اور ان کے خاندان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ منظر علی کی تعلیم و تربیت بھی بہت حد تک پنڈت جی کی مرہونِ منت تھی۔

شکیل کے والد مولوی جمیل احمد قادری سوختہ نے مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں تعلیم پائی۔ ان کے وعظ میں بڑی کشش تھی۔ چنانچہ دور دور سے انھیں دعوتِ تقریر و تلقین ملتی رہتی تھی۔ اسی سے ان کے سمبھٹی میں بہت لوگ قدردان ہو گئے۔ اور بالآخر وہ مستقل طور پر نقل مکان کر کے وہاں

تذکرہ معاصرین

چلے گئے۔ یہاں وہ کم و بیش اٹھارہ سال تک خواجہ اہلسنت (خوجہ سنی) مسجد میں پیش امام اور خطیب کے منصب پر کام کرتے رہے۔ یہ ان کی اسی مذہبیت کا نتیجہ تھا کہ ٹیکسل کی ابتدائی تعلیم بھی اردو، فارسی، اور عربی تک محدود رہی اور وہ اس سلسلے میں کچھ زمانہ اپنے والد کے پاس بمبئی میں بھی رہے۔ یہ مراحل طے ہو گئے تو انھیں مسٹن اسلامیہ ہائی اسکول شیخوپورہ بدایوں میں بھیج دیا گیا یہ اسکول اب حافظ صدیقی اسلامیہ انٹر کالج کہلاتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں یہاں سے دسویں درجے کی تکمیل کی اور اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

۱۹۳۹ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کی مالی حالت بہت سقیم ہو گئی، لیکن مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری اور قیصر حسین قادری کی دستگیری اور داؤد بھائی فضل بھائی ٹرسٹ (بھٹی) کے وظیفے نے یہ مشکل آسان کر دی۔ چنانچہ انھوں نے تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۴۲ء میں بی اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ مرکزی حکومت ہند کے محکمہ سپلائی میں کلرک بھرتی ہو گئے، وہ یہاں دہلی میں ۱۹۴۶ء تک رہے۔

ان کا دہلی کے قیام کا زمانہ دوسری جنگ عظیم کے متوازی ہے۔ حکومت کو لوگوں میں موافق فضا پیدا کرنے اور انھیں جنگ میں حصہ لینے پر ابھارنے کی خاطر طرح طرح کے پارٹبلینا پڑے تھے۔ انھیں میں ایک سانگ میلٹی کا محکمہ تھا۔ اس کے کرتادھرتا مشہور شاعر حفیظ جالندھری تھے۔ یہ محکمہ شہر بشہر اور قریہ بقریہ طائفے بھیجتا رہتا تھا، جہاں ڈرامے، تواریخ مشاعرے، گانے بجانے کا پروگرام ہوتا۔ لوگ جمع ہوتے اور تفریح کے پردے میں انھیں جنگی مساعی سے سہمدی کا سبق سکھایا جاتا۔ اس زمانے میں شکیل نے بھی بہت نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اس سے ان کی شہرت اور مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔

شکیل اسم بامسمیٰ تھے، شکل و صورت اچھی تھی اور آواز بھی دلکش پائی تھی۔ شعر خوب پڑھتے تھے اور سننے والے اس کی تعریف کرتے تھے۔ اکثر حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام بڑے جوش و خروش سے سنایا کرتے تھے۔ یہ ان کے لیے پندعوام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

انہیں خود بھی شاعری سے دلچسپی تو بہت دن سے تھی، لیکن اس سے صحیح شغف علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں پیدا ہوا۔ یہ وہ دور ہے، جب جگر مراد آبادی مرحوم کا ڈنکا بج رہا تھا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حلقوں میں بہت ہر دل عزیز تھے، یہاں اکثر آتے اور مہینوں مقیم رہتے۔ ان کا زمانہ شکیل ان کے ایک شاگرد مراد آبادی کی وساطت سے جگر کے زیر اثر آئے۔ وہ اس سے پہلے اپنے والد کے جگر کی دوست مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری سے مشورہ سخن کرتے رہے تھے۔ ضیاء القادری تحصیل بدایوں میں ناظر تھے۔ ان کے تعلقات شکیل کے والد مولوی حمید احمد سے اتنے گہرے اور مخلصانہ تھے کہ عام لوگ انہیں بھائی بھائی خیال کرتے تھے۔ شکیل بھی انہیں چچا کہہ کر پکارتے تھے۔ ضیاء خود مولوی علی احمد خان اسیر بدایونی (پروفیسر عربی و فارسی سنٹ جانس کالج، آگرہ) کے حقیقی بھانجے اور شاگرد تھے۔ دونوں ماموں بھلے بھلے نعت رسول صلعم بکھتے تھے۔ ضیا کی بلامبالغہ سینکڑوں نفیس میری نظر سے گزری ہیں۔ ان کی مرتبہ اکمل التاج چھپ چکی ہے (بدایوں ۱۳۳۲ھ) اس کے دو حصے ہیں۔ دراصل یہ انھوں نے اپنے مرشد مولانا فضل رسول کی سوانح عمری کے طور پر لکھی تھی، اس کے پہلے حصے میں بدایوں کے اہل دل اور اہل علم کا بہت اچھا تذکرہ محفوظ ہو گیا ہے اور دوسرے میں مولانا فضل رسول کے مفصل حالات ہیں۔ ضیا صاحب پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں کچھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔ معلوم نہیں ہنوز حیات ہیں یا اپنی منزل آخر کو روانہ ہو گئے، جہاں ہم سب کو ایک نہ ایک دن جانا ہے۔ ادھر دو تین برس سے ان کی کوئی چیز بھی نظر سے نہیں گزری۔ بشرط حیات وہ اس وقت ۹۰ کے پیٹے میں ضرور ہوں گے۔

ایک تو شکیل کا اپنا خاندان ہی مذہبی خیالات کا اور آستانہ قادریہ کا مرید و مقصد تھا، اس پر ضیاء القادری کا تلمذ گویا سونے میں سہاگہ ہو گیا۔ خود شکیل نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

بارک اللہ، فیض تعلیم ضیاء نے اے شکیل!

خود بخود رنگِ تغزل عارفانہ ہو گیا

ایک اور شعر میں کہتے ہیں:

لحظہ لحظہ اوج پر فیض ضیا ہے اے شکیل!

رفتہ رفتہ شاعر کامل ہوا جاتا ہوں میں

جگر نے کسی کو اپنا باقاعدہ شاگرد نہیں بنایا، اگرچہ ان سے کئی اصحاب نے وقتاً فوقتاً استفادہ ضرور کیا۔ شکیل بھی اسی گروہ میں شامل تھے جگر کے اس تعلق سے انھیں یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ جلد اور آسانی ادبی حلقوں میں متعارف ہو گئے۔ اور باہر کے مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگے۔

فروری ۱۹۴۶ء میں شکیل ایک مشاعرے کے سلسلے میں پہنچ گئے۔ یہاں ان کی مشہور فلم ساز مسٹر کاردار سے ملاقات ہوئی۔ وہ شکیل سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان سے اپنی بعض فلموں کے لیے گیت لکھنے کی فرمائش کی۔ یہ دعوت شکیل کی زندگی کا موڑ ثابت ہوئی۔ ان کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش تھی۔ اس زمانے میں وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ان کا مشاہرہ صرف ساٹھ روپے تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے کاردار کی فرمائش یہ کہہ کر رد کر دی کہ جب تک ملازمت میں ہوں، میں کوئی پرائیوٹ کام نہیں کر سکتا۔ اس پر کاردار کا اصرار بڑھا۔ بالآخر انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا اور کاردار کی چار سو مہینہ کی پیش کش قبول کر لی۔ خوش قسمتی سے انھیں ایک اور طرف سے بھی کمک ملی۔ مشہور موسیقار ڈاکٹر سید نوشاد علی نے اعلان کر دیا کہ آئندہ وہ صرف شکیل کے لکھے ہوئے گیت گائینگے۔ سب سے پہلی فلم 'درد' میں شکیل کے گیتوں اور نوشاد کی موسیقی کی دھوم مچ گئی، جس نے کامیابی اور مزید ترقی کے تمام دروازے کھول دیے۔ شکیل نے اپنی زندگی میں سو سے زیادہ فلموں کے لیے گیت لکھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس میدان میں بہت کامیاب رہے۔ انھوں نے اردو (ہندی) کے علاوہ پوربی زبان میں بھی گیت لکھے۔ لکھنے کو تو فلموں کے لیے گیت بھی لکھے اور اس گروہ میں ہمارے بعض صفِ اول کے شاعر بھی ہیں۔ لیکن ایک بات اعتراض

ضروری ہے کہ بیشتر دوسرے حضرات کی طرح شکیل نے اپنے گیتوں اور نغموں میں ابتذال اور سو قیّت کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ بہت حد تک ان کے گیتوں میں ادبیت اور ہندی شاعری کا رچاؤ ملتا ہے۔ انھوں نے اس سے بہت روپیہ کمایا۔ بھٹی میں ان کے دو دو مکان ذاتی ملکیت کے تھے۔ ادبی دنیا نے بھی ان کی بہت قدر کی۔ ابھی پانچ سال غالب صدی تقریبات کے زمانے میں گورنر یوپی (شری گوپال ریڈی) نے ان کے وطن بدایوں میں شکیل روڈ کا افتتاح کیا تھا۔ تین چار سال ہوئے، بھٹی اور دلی میں خاصے بڑے پیمانے پر جشن شکیل منایا گیا تھا۔ اور اب ایک اور جشن کی بھٹی میں داغ بیل پڑچکی تھی کہ موت کا بلا دا آگیا۔

وہ بھٹی کے ممتاز شہری تھے، وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انھیں شاعر کہنے کا بھی شوق تھا، بالعموم یا تو اس کی صدارت کرتے یا افتتاح۔ غرض عجیب باغ و بہار شخصیت تھی۔

شکیل کو بہت دن سے ذیابیطس کی تکلیف تھی، یہ مرض انھیں ورثے میں ملا تھا، ان کے دل مروی جمیل احمد کا بھی ۳ جولائی ۱۹۳۹ء کو بھٹی میں اسی موذی مرض سے انتقال ہوا تھا۔ بدقسمتی سے شکیل کو ذیابیطس کے ساتھ تپ دق کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا۔ تپ دق عام حالات میں اب ہلک نہیں رہا، لیکن ذیابیطس نے انھیں بہت کمزور کر رکھا تھا، جس سے تپ دق کا بھی ٹھیک سا علاج نہ ہو سکا، بلکہ آخری ایام میں گلے میں بھی کچھ شکایت پیدا ہو گئی تھی اور بعض لوگوں نے اس پر کینسر کا شبہ کیا ہے۔ غرض پوری دوا دوش کے باوجود حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء صبح کے وقت انھیں خون کی قے ہوئی، جس پر بھٹی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن وقت معین آگیا تھا، علاج معالجے کی اب کیا گنجائش تھی! اسی دن وہیں اسپتال میں سہ پہر کو ساڑھے چار بجے انتقال ہو گیا، لاش مکان پر آئی۔ عشاء کے بعد جنازہ اٹھا، اور سینکڑوں دوستوں، مداحوں، ہماروں اور سو گواروں نے

انھیں گیارہ بجے شب باند رہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا، خدا مغفرت کرے۔ کئی دوستوں نے تاریخِ وفات کہی ہے۔ اعجاز صدیقی نے عیسوی تاریخ کہی: خلد میں شاعرِ شبانہ شکیل (۱۹۷۰ء) ہجری میں ۵۳ کے نغمیہ کے ساتھ ہے:

احمدؔ کے نام کا جو سہارا زرا ملا

ہے خلد میں قیامِ جنابِ شکیل کا

منشی ہدایت اللہ سوختہ کے دو بیٹے تھے: ایک مولوی جمیل احمد سوختہ یعنی شکیل کے والد بزرگوار، ان سے بڑے منشی حضور احمد بن کی بیٹی ریاض بٹول، مولوی قیصر حسین قادری کے عقدِ نکاح میں تھیں (ان کا ادراک ہو ہے) انھیں قیصر حسین کی صاحبزادی اسلمہ سے شکیل کی شادی ہوئی تھی (۱۹۳۶ء) اپنے پیچھے پانچ بچے: تین لڑکیاں (رضیہ، صفیہ، نجمہ) اور دو لڑکے (جاوید، طارق) اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

مرحوم کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ رعنائیاں (دئی ۱۹۴۴ء) صنم و حرم (بھٹی ۱۹۴۶ء)، رنگینیاں (لاہور ۱۹۴۹ء) اور شبستان (لاہور ۱۹۵۰ء) نغمہ فردوس (بھٹی ۱۹۴۷ء) نعتوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنی سوانحی بھی مرتب کر لی تھی، جو ہنوز چھپی نہیں۔ خدانہ کرے، اس کا مسودہ کہیں ضائع ہو جائے!

اب چند شعر دیکھیے

حالِ دل، احوالِ غم، شرحِ تمنا، عرضِ شوق بیخودی میں کہہ گئے، افسانہ در افسانہ ہم
پارسائی خندہ زن، وعدہ خلا فی طعنہ زن ہائے کس مشکل سے پہنچے، تادریں بخانہ ہم
آگے، خدا ہی جانے، انجامِ عشق کیا ہو جب اے شکیل! اپنا یہ حال ہے ابھی سے
دراصل آدمی نہ سمجھنا اُسے مشکل! جو آدمی وفانہ کرے، آدمی کے ساتھ
داہر کی نہ فکر منزل کی کہ راہ ہوں میں پیر دی دل کی

مرے دل نے مجھے، غربت میں، تسکین دی یہ کہہ کہہ کر
وہ منزل ہے، وہ گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

تذکرہ معاصرین

ہر ایک عنوانِ دردِ فرقت ہے ابتدا شرحِ مدعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سائیں ان کو کہاں سے پہلے
قسم فریبِ نگاہِ دل کی، ہمیں تو اس جستجو نے کھویا
وہیں تھی دراصل اپنی منزل، قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے
ازل سے شاید، کھٹے ہوئے تھے، تشکیلِ قسمتِ جینِ پیہم

کھلیں جو آنکھیں اس آنجن میں، نظر ملی آسماں سے پہلے
بے تعلق ترے آگے سے گزر جاتا ہے یہ بھی اک حسنِ طلب ہے ترے دیوانے کا

مُحِبِّ احباب و اربابِ وفا مُحِبِّ اغیار ہے ترے بغیر
عنائی بہارِ گل و گلستاں گئی وہ کیا گئے کہ رونقِ بزمِ جہاں گئی
غم ہو کہ ابناط، کسی کو نہیں قرار فصلِ بہار آئی، تو فصلِ خزاں گئی
دل بے نیازِ آرزوئے التفات ہے شاید اسی کا نام سکونِ حیات ہے

و اے حیرت کہ بھری تحفل میں مجھ کو تنہا نظر آتا ہے کوئی
چاہیے خود یہ یقینِ کامل حوصلہ کس کا بڑھاتا ہے کوئی
لمحاتِ یادِ دوست کو صرف دعا نہ کر آتے ہیں زندگی میں یہ عالم کبھی کبھی

فریبِ وفا، وعدہ ہے مسلسل بھی پر یہ مشقِ عنایات کیوں ہو
لب صرفِ کلم ہیں، تو نظریں ہیں کہیں اور ان باتوں سے ہوتا ہے محبت کا یقیں اور
وہ بھی دل گرفتہ ہیں، اپنی کیا کہوں، ناصح! مجھ سے گفتگو کرنا، ان سے گفتگو کر کے

ہزار قیدِ خزاں سے چھٹ کر، بہار کا آسرا کرینگے
بہار بھی ہم نفسِ زدوں کو نہ راس آئی، تو کیا کرینگے

جہاں کی نیرنگیوں سے نیچر بدل گئی آشاں کی صورت
نفس سمجھتی ہیں جن کو نظریں، وہ درحقیقت نفس نہیں ہے

تذکرہ معاصرین

چمن کی آزادیاں مؤخر، تصورِ آشتیاں مقدم
غمِ اسیری ہے نامکمل، اگر غمِ خار و خس نہیں ہے
نہ کر مجھے شرمسار، ناصح! میں دل سے مجبور ہوں کہ جبر کا
ہے یوں تو کون و مکان پہ قابو، مگر محبت پہ بس نہیں ہے
اڑائی و اعظا نے چھپ کے پیہم، چڑھائی رنڈوں نے مل کے باہم
ہیاں تو یہ سوچتے ہی گزری کہ، بادہ نوشی حرام کیوں ہے؟
نہ ذکرِ عنوان نہ حرفِ مطلب، ادھر خوشی، اُس طرف تغافل
تو پھر یہ افسانہ، محبت زباں زدِ خاص و عام کیوں ہے؟

دل نے غم سے شکست پائی ہے عمر رفتہ تری دہائی ہے
میرے معبد نہیں ہیں دیر و حرم احتیاطاً جبین جھکا ئی ہے
وہ ہوا دے رہے ہیں دامن کی ہائے کس وقت نیند آئی ہے
گلِ فسرہ، چمن اداس، شکیل! یوں بھی اکثر بہا ر آئی ہے

کفر و ایماں کی سیار سے، ہے ناکا و وجود
کھل گیا تجزیہ غم سے ہر اک رازِ حیات
تو نے سوچا کبھی، دامن کو بچانے والے!
آدمی کا یم کا ہوتا، اگر انساں ہوتا
زیست مہم بھی، اگر دل نہ پریشاں ہوتا
کچھ سکتا ہاتھ میں ہوتی، تو یہ داماں ہوتا

سچی تشریحِ آرزو کی قسم! محرمِ آرزو، نہ تم، نہ ہم
موجِ انفاسِ نذاہداں، تو بہ! بجھ نہ جائے کہیں چراغِ حرم
دل کو نہ ہو گی تابِ غم بے تو جہتی للہ، داستانِ محبت نہ پوچھیے

”ذکرہ معاصرین

یوں دیکھتے ہیں، جیسے ادھر دیکھتے نہیں اس لطفِ بے طلب کی نزاکت نہ پوچھیے

کیسی بہار، کس کے تارے، کہاں کے پھول
جب تم نہیں، تو دیدہ و دل میں سمائے کون
ذوقِ عمل نہ ذوقِ جنوں؛ ہر طرف سکوں
جنت اگر یہی ہے، تو جنت میں جائے کون!

ذوقِ لطیف و چشمِ حقیقت نگہ کہاں! حسنِ ازل تو عام ہے، حسنِ نظر کہاں!

اے شکیل! ان کی محفل سے جاتے تو ہو اور اگر دل نے پوچھا: کہاں چل دیے؟

منور لکھنوی، منشی بشیر پرشاد

منور صاحب جن کا ۲۴ مئی ۱۹۷۰ء کی صبح دہلی میں انتقال ہو گیا، پشتینی شاعر تھے۔ شجرہ نسب

منشی ادوے راج مطلق لکھنوی ملاحظہ ہو!

منشی ایشور پرشاد شاعری لکھنوی

منشی پورن چندا ذرہ لکھنوی

منشی رام سہائے تمنا لکھنوی	منشی امیتا پرشاد نیلا لکھنوی	منشی ڈاکٹر شادق لکھنوی
(ف ۶۱۹۳۴)	(ف ۶۱۹۳۸)	

منشی بشیر پرشاد منور لکھنوی

یہی نہیں، منشی جگد مہا پرشاد قیصر لکھنوی ان کے ماموں تھے اور مشہور تاریخ نگار اور فارسی گو

منشی لچمن پرشاد صدر لکھنوی ان کے خسر۔ اگر ان حقائق کے پیش نظر منور نے کہا:

شاعری سے نہ منور کو ہو کیونکہ رغبت

یاخ پشتوں سے ہی شوق چلا آتا ہے

تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے مبالغہ کیا، یا غلط لکھا؟

منور سکینہ کا ستھ خاندان کے فرد تھے۔ وہ ۸ جولائی ۱۸۹۷ء کو اپنے آبائی مکان محلہ نوبتہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان سے بڑے ایک اور بھائی تھے؛ بابو رام شنکر پرشاد۔ وہ بھی خاندانی روایات اور ماحول کے زیر اثر صحافت و شعرونی میں دلچسپی لیتے تھے۔ تعلیم کے بعد اودھ اخبار (لکھنؤ) کے شعبہ ادارت میں ملازم ہو گئے تھے، اور ایک اپنا مہفتہ وار اخبار تفریح بھی شائع کرتے تھے۔ بد قسمتی سے وہ یکایک فروری ۱۹۱۳ء میں پلیگ کا شکار ہو گئے۔ ان کے علاوہ دو چھوٹے بھائی اور تھے اور ایک بہن۔

منور کے والد ارق بڑے پرگو شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے ہماری زبان کی جو خدمت کی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بد قسمتی سے انھیں شراب نوشی کی نامرادت تھی۔ اگرچہ ان کی آمدنی ترجے اور صحافت سے، اچلے شریفانہ خرچ کے لیے کافی تھی، لیکن جس بلا کے وہ پینے والے تھے اس کے لیے یہ کسی طرح کفالت نہیں کر سکتی تھی۔ بڑا بیٹا رام شنکر پرشاد ان کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہوا تھا کہ وہ بھی جوانی کا داغ دے گیا۔ اس حادثے کا منور صاحب کی تعلیم پر بہت ناخوشگوار اثر پڑا۔ اس وقت یہ آنکھوں درجے کا امتحان دے چکے تھے۔ لیکن اب گھر کی مالی حالت اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ یہ آگے تعلیم جاری رکھ سکے، لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مصیبت اکیلی نہیں آتی، ابھی خاندان کے جو اس رام شنکر پرشاد کی بیوہ کے صدقے ہی سے ٹھکانے نہیں آئے تھے کہ اس کے ۸ مہینے بعد ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء کو خود ارق بھی بے عمر ۴۹ سال انتقال کر گئے، جس سے وہ رہا سہا آمدنی کا ذریعہ بھی منقطع ہو گیا۔

یوں کم عمری میں پورے خاندان کی دیکھ بھال کی ذمے داری منور صاحب کے کمر درکنڈ چھو پر اٹھ گئی۔ ان کی عمر اس وقت ۱۶ سال کی تھی۔ بہت مڑاں، مرد خدا، یہ اودھ اخبار کے نام تھا تو اپنے بھائی کی وفات کے بعد ہی مقرر ہو گئے تھے، اب انھوں نے کوشش کر کے ریلوے کے حساب کے دفتر میں عارضی ملازمت کرنی (ستمبر ۱۹۱۳ء) مشاہرہ ۱۸ روپے مقرر ہوا۔ خوش قسمتی سے تھوڑے دن بعد یہ ملازمت مستقل ہو گئی۔ اسی ملازمت کے دوران میں انھوں نے ۱۹۱۹ء میں پرائیویٹ

امتحان دے کر دسویں درجے کی سند حاصل کر لی، اس سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔ لیکن انھوں نے ذاتی مطالعے اور محنت سے اپنی استعداد میں بہت اضافہ کیا اور فارسی اور سنسکرت میں بھی اتنی اچھی لیاقت ہتیا کر لی کہ بعد کے زمانے میں وہ ان زبانوں کی کتابیں باسانی ترجمہ کرتے رہے۔

منور صاحب عمر بھر ریلوے کے اسی محکمہ سے وابستہ رہے اور مختلف مقامات (لاہور، لکھنؤ، دلی وغیرہ) تبادلے پر گئے۔ آخری مرتبہ وہ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں دلی آئے اور اس کے بعد انھیں کے پے پیسے۔ یہیں سے جنوری ۱۹۵۷ء میں ملازمت سے نشین پر سبکدوش ہوئے۔

انھیں شعر و سخن سے دلچسپی بہت ابتدائی زمانے میں پیدا ہو گئی تھی اور ہونا بھی چاہیے تھی۔ گھر کی فضا میں اس کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ شروع میں ان کا کلام اپنے بڑے بھائی کے پرچے تفریح اور ادھ اخبار میں چھپتا رہا۔ اس کے بعد ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں بھیجے لگے۔ ان کے چچا منشی رام سہاے تنہا بھی ایک ماہانہ پرچہ دربار اشاعت کرتے تھے، اس میں نظم و نثر دونوں ہوتی تھیں۔ تنہا صاحب کتابوں کے مشہور تاجرانگت میں گرین اینڈ سنز کے ملازم تھے اور اسی باعث بیشتر دورے پردلی سے باہر رہتے تھے۔ پرچے کی دیکھ بھال اور ترتیب و تدوین میں ان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر گواری سہاے اور منور صاحب کے سپرد تھی۔ نثر کا حصہ ڈاکٹر صاحب دیکھتے اور نظم کا منور صاحب۔

ان کے ایک عزیز دوست شیونرائٹ بھٹناگر دلی کے مشہور روزنامہ تیج کے ایڈیٹر تھے۔ منور جب دلی آنے تو ان کے اصرار پر باقاعدگی سے اپنا کلام تیج کو دیتے رہے۔ کئی سال بعد شیونرائٹ نے تیج کی ملازمت ترک کر کے اپنا ہفتہ وار اخبار بھارت جاری کر دیا اور پھر ۱۹۳۰ء میں ایک روزنامہ بھی وطن کے نام سے چھاپنے لگے۔ منور صاحب کا کلام ان دونوں میں بھی چھپتا رہا، بلکہ کئی سال تک وہ وطن کا ذکا ہیہہ کا لم کچھ نہ کچھ کے عنوان سے بھی لکھتے رہے۔

دلی میں پنڈت امر ناتھ ساحر کی شخصیت ایک ادبی ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہمراہ اپنے زیر اہتمام مشاعرہ کرتے تھے جس میں اردو اور فارسی دو مصرع طرح دیے جاتے تھے۔ مقام شعرا کے علاوہ باہر سے بھی اساتذہ کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ جب منور دلی آئے تو وہ ان مشاعروں میں جانے لگے۔ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے اردو کے ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی شروع کی۔ اردو میں اگرچہ شروع میں انھوں نے چندے اپنے والد اور پھر چچا منشی رام سہائے تمتا سے مشورہ کیا، لیکن صحیح معنوں میں وہ ۱۹۱۵ء سے منشی نوبت رائے نظر اف (اپریل ۱۹۲۳ء) سے اصلاح لیتے رہے۔ اب فارسی کا شوق ہوا، تو اس میں رائے سیدھ ناتھ بلی فراقی دریا بادی سے مشورہ کرنے لگے۔ منور کا فارسی کلام (طواف عجم) نقد ایک دیوان کے جمع ہے، لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ کچھ کلام مندی میں بھی ہے۔

منور کو مندی، سنسکرت، فارسی تینوں زبانوں پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی اور اسے انھوں نے اردو ادب کو نذر بیعت تراجم مالا مال کرنے میں استعمال کیا۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس میدان میں کوئی ان کا حریف و ہم نہیں تھا۔ آخر میں ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی فہرست دی جا رہی ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سینگے کہ اس پہلو سے ان کی خدمات کتنی وسیع اور پائیدار ہیں۔

میں انھیں ۱۹۳۷ء سے جانتا تھا۔ چونکہ اس کے بعد میرا کوئی رُبع صدی کا زمانہ ملک سے باہر گزرا، یہاں کہیں برسوں کے بعد آنے کا موقع ملتا تھا۔ اس لیے ہمارے تعلقات میں بے تکلفی کا رنگ تو کبھی نہ پیدا ہوا، لیکن دوستانہ مراسم تھے اور ہم ایک دوسرے سے ملاقات میں مستر محسوس کرتے تھے۔ ان سے جب کبھی ملنا ہوا، مجھے ان کی شرافت نفس اور انسان دوستی اور وضعداری نے متاثر کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب رہنے لگی تھی۔ ہچکیوں (فواق) کا عارضہ تھا۔ ذیابیطس کی شکایت بھی ایک زمانے سے تھی جس نے جسم گھلادیا تھا۔ آخری ایام میں بنیانی بھی بہت

کمزور ہو گئی تھی۔ ان سب عوارض کے باوجود یہ گمان تک نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب گیا ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں کسی مجلس میں نظر آجاتے تھے۔ درحقیقت انھیں کوئی خاص شکایت بھی نہیں تھی۔ بس ۲۴ مئی صبح پونے سات بجے اسی خاموشی سے، جو ان کے مزاج کی افتاد تھی، ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔

۱۸۵۱ء میں ان کی شادی منشی لچھن پرشاد صدر کی صاحبزادی چند رکلا دیوی سے ہوئی تھی۔ انھیں بھی شعر گوئی کا شوق درشے میں ملا تھا۔ شرم تخلص کرتی ہیں۔ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں یکے بعد دیگرے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ پہلی کوئی ہفتہ بھر کے بعد داغ مفارقت سے گئی؛ دوسری سال بھر کے بعد چل بسی۔ کوئی چار برس ہوئے، انھوں نے اپنے برادرِ نسبتی کے خورد سال پوتے کو گودے لیا تھا، غرض ان کے اٹھ جانے سے علم و ادب کی وہ سمیع جو پنج تہ سے روشن تھی، سدا کے لیے گل ہو گئی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

تصانیف

(الف) مطبوعہ: (۱) نذرِ ادب (مجموعہ رباعیات) ۱۹۲۹ء؛ (۲) کائناتِ دل (مجموعہ نظم) ۱۹۳۹ء؛ (۳) کائناتِ دل (انتخابِ نظم) ۱۹۵۵ء؛ (۴) نوے کفر (مجموعہ غزلیات) ۱۹۶۱ء؛ (۵) ادا نے کفر (مجموعہ غزلیات) ۱۹۶۲ء؛ (۶) دادا نہرو (سوانح عمری) ۱۹۶۱ء؛ (ب) غیر مطبوعہ: (۱) سوزِ وطن (قومی نظموں کا مجموعہ) (۲) جگرائے نختِ نخت (نظموں کا مجموعہ) (۳) ریزہ گل (مجموعہ رباعیات) (۴) تاثراتِ منور (نظموں کا مجموعہ) (۵) چراغِ ذرا (۶) صنم خانہ؛ (۷) ہر منور (غزلوں کے تین مجموعے) (۸) زعفرانِ زار (مزاہیہ کلام) (۹) شگفتہ عقیدے؛ (۱۰) شعری خاکے؛ (۱۱) خون کے آنسو (نوحے) (۱۲) دشتِ ویدنا (مندی منظومات)؛ (۱۳) طوافِ عجم (فارسی کلام کا مجموعہ)؛ (۱۴) معروضات (نثری مضامین کا مجموعہ)

۲۔ تراجم:

(الف) مطبوعہ: (۱) رامین دایلیکی (نثر) ۱۹۳۱ء؛ (۲) بھگوت گیتا موسومہ نسیمِ عرفان (منظوم)

(۱۹۳۶ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۶۱ء) (۳) کمار سمبھو - منظوم (۱۹۵۲ء) (۴) دھمپدیا سچی راہ منظوم
(۱۹۵۴ء) (۵) درگا سیت شتی - منظوم (۱۹۵۵ء) (۶) وجدانِ حافظ - منظوم (۱۹۵۶ء) (۷)
گجنیدر مکھش - منظوم (۱۹۵۶ء) (۸) ادوھوت کا ترانہ - منظوم (۱۹۵۶ء) (۹) راراکھش
ڈراما (۱۹۵۸ء) (۱۰) روحانی مکالمہ - منظوم (۱۹۶۰ء) (۱۱) سنکن نے کہا - نثر - (۱۹۶۰ء) (۱۲)
ڈکے سے آفتاب - نثر (۱۹۶۱ء) (۱۳) ایلینرز روز ویلیٹ - نثر (۱۹۶۲ء) (۱۴) ساگر
سنگیت - نثر (۱۹۶۲ء) (۱۵) گیتنا بھلی - نثر (۱۹۶۳ء) (۱۶) شکنتلا - نظم و نثر (۱۹۶۳ء)
(۱۷) گیت گووند - منظوم (۱۹۶۴ء) (۱۸) سمندری جوان اور دوسرے نادرجہ میں افسانے؛
نثر (۱۹۶۸ء) (۱۹) فاؤسٹ - منظوم (۱۹۶۹ء) (۲۰) آریہ ابھو دے منظوم (۱۹۶۹ء) (۲۱)
سوز اقبال - منظوم (۱۹۷۰ء)

(ب) غیر مطبوعہ: (۱) چارودت (سکرت ڈراما) (۲) صہبائے دوام (رباعیات
عمر خیام) (۳) تعبیر منظوم (قرآن کریم کی کچھ سورتوں - کے مطالب منظوم) (۴) گیتنا بھلی
(منظوم) (۵) افکار بلند (مشائیر کے اقوال کا منظوم ترجمہ)؛ (۶) الہامات ایرانی -
(۷) یوگ سار (جین دھرم کے مقدس صحیفے کا منظوم ترجمہ)؛ الہامات مغرب (انجیل
کے کچھ حصوں کا منظوم ترجمہ)؛ (۹) نانہ بیکیس (تلسی داس کی بنے پتر کا نثری ترجمہ)؛
(۱۰) سری روپ کلا (بہار کے ایک بالکال بھگت کی سوانحی کا نثری ترجمہ) (۱۱) مالویکا
گن متر (کالی داس کے ناٹک کا ترجمہ) (۱۲) مالتی مادھو (بھو بھوتی کے ناٹک کا ترجمہ)
(۱۳) میری یادداشتیں - نثر (خود نوشت)

(ج) نامکمل تراجم: (۱) رگھو دت (کالی داس) منظوم؛ (۲) رام کھٹیا یا رامائن منظوم
اب کچھ کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو:-

ہوگا اب اس سے اور سو کیا کرم ترا! ہے خوش نصیب جس کو میسر ہے غم ترا!
ہوتا ہے کچھ عجیب ہما عالم غریب کا کرتے ہیں ذکر جب بھی متور سے ہم ترا

کا ہشیں لے اڑیں فراغ اپنا دل کا دشمن بنا دماغ اپنا
 کیوں کریں دل کسی کا افسردہ! کیا دکھائیں کسی کو داغ اپنا
 ہے کچھ اگر سلیقہ ہے کچھ اگر قرینا مرنے کی طرح مرنا، جینے کی طرح جینا
 بُرا دیکھ لینا، بھلا دیکھ لینا دکھائیں جو ارض و سما، دیکھ لینا
 یہ دنیا سلامت، یہ آنکھیں سلامت جہاں اس کی ہوا انتہا، دیکھ لینا
 نہیں بے صدا، گوا بھی ساز ہستی یہ ہو جائیگا بے صدا، دیکھ لینا
 بلائے جانِ عناد دل ہے برق و باد کا خوف سکوں نہ پھر بھی ملا، آشیاں بنا تو لیا
 گہنگاری کی نیت کو گہنگاری نہیں کہتے سفر کے قصد سے ہوتی ہے کب گردِ سفر پیدا
 ضابطے سے ثواب کیا ہوتا قاعدے سے گناہ بھی نہ ہوا
 دوستی کا تو خیر ذکر ہی کیا دشمنی کا نباہ بھی نہ ہوا
 اب اس سے ضبط کی ناکامیاں سوکھ کیا؟ دل اس کا اہل نہ تھا، دل کو غم نہ دینا تھا
 یہ مجھ کو دیکھ کے آنکھیں چھپک گئیں کس کی! مرے فناء دل پر یہ کس نے صاد کیا؟
 یہ زندگی کا سفر بھی ہے کچھ عجیب سفر قدم قدم پہ مقامات آئے ہیں کیا کیا!
 ٹیکڑوں جلوہ نمائی کے نکالے انداز سامنے آپ سے لیکن کبھی آیا نہ گیا
 روزِ جزا کا ہو جو کوئی منتظر، تو ہو ورنہ کھلی ہیں خلد کی ماہیں ہزار آج
 ہر ایک رسم کی، ملت کی، توڑ دی ہیں قیود انہیں انہیں، کہیں میری نظر نہیں بخود
 نہ ہے نشستِ مصلے، نہ گردِ شربِ تسبیح نہ میں رکوع میں شامل، نہ میں شریکِ سجود
 مری نظر سے بچھا ہے تمام بسترِ خاک مری نظر سے ہے پیدا تمام چرخِ کبود
 منافقوں کا بھی حامی ہوں، دوستوں کا بھی دوست کھلی ہے میرے لیے ہر طرف رہِ بہبود
 مرا مال، متور! نہ جانے کیا ہوگا نہ مہند دام، نہ مسلمان، نہ کافر م، نہ یہود
 تاکجا پاؤں میں زنجیر گراں یہ آخر! تاکجا سلسلہٴ عمر رواں یہ آخر!

تاکجا فکر کم و بیش میں بر بادی عمر!
 تاکجا ہستی بیبود میں یہ طولِ اہل!
 تاکجا یہ چمن آرائی جذباتِ حیں!
 تاکجا تم کو گوارا یہ منور! تو مین
 یہ کہ رہے تھے فرشتوں سے میکدے والے!
 دنیا کی عشرتیں ہوں کہ عقبے کی راحتیں
 خدا پرست بھی ہیں، کچھ خدا نواز بھی ہیں
 یہ حرف و شکل کے قائل ہیں کس قدر بیدار
 لازم ہے کچھ گناہ کی عظمت کا پاس بھی
 ہم نے دریاؤں کو بتیاب ہی دیکھا ہے ہم
 الہی! خیر کیا کوئی مصیبت آنے والی ہے؟
 مری صبح و البتہ شام کیوں ہو؟
 شکایت کی حد تک شکایت بجا ہے
 جو ہو صبحِ حسرت، جو ہو شامِ حرماں
 تم سے ممکن ہو گفتگو نہ اگر
 جس کے سننے سے ہو تمھیں انکار
 ان خوش نوائیوں سے منور حصول کیا
 درد کی نعمت سے محرومی نہیں درمانِ درد
 کیا کر نیلے اے منور! چارہ گر میرا علاج
 نہ آگ دل میں بھرکتی رہے اگر ہر وقت
 نہ دوستی کا مزہ ہے، نہ دشمنی کا مزہ

ہے شرطِ سجدے سے بے نیازی، وگرنہ معلوم ہر فرازی
جبیں سے دھولے جو ہاتھ اُس کو اجازتِ بندگی ملیگی

ہے دل کا رونا غضب کا رونا، اسے چھپانا ہے سخت مشکل

ہزار آنکھیں ہوں خشک پھر بھی پلک پلک میں نمی ملیگی

تاثرات کی رادھا کا عکس پڑنے سے تجلیات کی جہنا حسین ہے کتنی !

جمالِ دلنیش کی شانِ رعنائی نہیں جاتی بجزرت گو ہیں جلوے پھر بھی بکیتی نہیں جاتی

بتاؤں کیا کہ غرض کیا سفر میں رکھتا ہوں یہی بہت ہے کہ منزلِ نظر میں رکھتا ہوں

ذرا سنبھل کے منور! ہے مرحلہ نازک خودی کے جوش میں آکر، خدا نہ ہو جانا

چاند سورج ہیں، یا تارے ہیں یہ خد و خال سب تمہارے ہیں

ان کی تفسیر کیا کرے کوئی کتنے خاموش یہ اشارے ہیں

بسنہ و گل نے کر دیں لے کر نقش کتنے حسیں ابھارے ہیں

رکھ لیا غیرتِ ناموس جنوں کا پردا نہ بیا باں سے پلٹ کر کبھی گھر تک پہنچے

جو شکل چاہتے تھے، منور! نہ بن سکی کچھ دل سے، کچھ نگاہ سے کبھی کام لے لیا

تلخ ہونے پہ بھی غمِ دل کی دوا ہے تو ہی خواہ مر مر کے ہو، جینے کا مزا، ہے تو ہی

پڑھ کے افسانہ، دل کیوں چپ ہو؟ کوئی مطلب تو عبارت کرتے

تم کو تردید سے اُجھن ہوتی ہم جو اظہارِ محبت کرتے

کفر سے دین کی عظمت بڑھتی عشق کو مجرب و عبادت کرتے

اور بھی دل کو اذیت ہوتی تم سے کیا ذکرِ مصیبت کرتے

تم مخاطب ہوا تو کھولی ہے زباں ہم تو اس کی بھی نہ جرأت کرتے

شاعری وحی سے، الہام سے آگے نہ بڑھی اک قدم بھی روشِ عام سے آگے نہ بڑھی

کار فرمائی معمارِ تجلّٰی کیا ہے؟ کوئی تعمیرِ در و بام سے آگے نہ بڑھی

تذکرہ معاصرین

وقت کی روتھی بہر حال حڈوں کی پابند
اک قدم بھی سحر و شام سے آگے نہ بڑھی
صرف مرغانِ گرفتار پہ ڈھانا تھا ستم
ایک بجلی بھی رگِ دِام سے آگے نہ بڑھی
داستانِ جب بھی دلِ زار نے اپنی چھتری
ذکرِ بے ہری ایام سے آگے نہ بڑھی
رہ گیا کعبہ دیں، اس سے منور! محروم
دلبری حلقہء اصنام سے آگے نہ بڑھی



ضیاء القادری بدایونی، مولوی محمد یعقوب

خدا کی شان میں نے ابھی پچھلے شمارے ہی میں شکیل بدایونی کے حالات میں ضمناً مولانا ضیاء القادری بدایونی کا ذکر کیا تھا، اور لکھا تھا کہ معلوم نہیں، وہ کس حال میں ہیں، اور زندہ بھی ہیں یا اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس کے چند ہی دن بعد خبر موصول ہوئی کہ ان کا ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اس میں ذرہ برابر مباغتہ نہیں کہ بلحاظ کمیت ان سے بڑا لغت گو، اور تو دور کنار، کسی اور زبان میں بھی مشکل ہی سے ہوا ہوگا۔

ان کا نام محمد یعقوب تھا۔ ۲۷ رجب ۱۳۰۰ھ (۳ جون ۱۸۸۳ء) کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ محمد فضل الرحمن "تاریخی نام ان کے خالو مولانا علی احمد خان اسیر بدایونی نے رکھا تھا اور "صغیر" ان کے والد نے۔ ان کے والد شیخ یحییٰ بدایوں کے مشہور ملاحانہ ان کے نزدیک ان کے بزرگوں میں اکبری دور کے مشہور ولی اللہ شیخ عبداللہ بدایونی کی ہستی قابل ذکر ہے۔ جن کے شاگردوں میں ملا عبدالقادر بدایونی (ف ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵ء) کی سی نادرہ روزگار ہستی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جیسا کہ خواجہ نظام الدین نے طبقات اکبری میں لکھا ہے،

شیخ عبداللہ دراصل منہ تھے۔ ایک دن گلستان کا سبق پڑھ رہے تھے کہ اس میں رسولِ سلام کا ذکر آگیا۔ استاد سے ان سے متعلق تفصیل پوچھی اور انھوں نے جو مناقب بیان کیے، ان کے سننے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ پھر اپنی ریاضت سے علم و فضل اور ورع و تقویٰ سے وہ مقام حاصل کیا کہ خلقِ خدا نے ان کی برگزیدگی کا اعتراف کیا۔

محمد یعقوب کوئی چار سال کے تھے کہ ان کے والد راہگزرے عالمِ جاودانی ہو گئے (۶ سوال ۱۳۰۴ھ) اس کے بعد ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت اپنے خالو اسیر کے زیر سایہ ہوئی۔ اسیر کی جسمانی اولاد صرف ایک بیٹی تھی؛ انھوں نے محمد یعقوب کو اپنے بیٹے کی طرح پرورش کیا انھوں نے غالباً فارسی بھی آسیر سے پڑھی تھی۔ پھر دارالعلوم شمس، بدایوں میں باقاعدہ تعلیم پائی۔ ۱۸۹۶ء میں اردو مڈل پاس کیا۔ اس کے بعد چچا کے ساتھ برما گئے اور وہاں چار سال تک محکمہ سروے میں رہے۔ واپسی پر محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ اسی سلسلے میں مدتوں گنور میں مقیم رہے۔ سبک آخر ۱۹۱۳ء میں بدایوں تحصیل میں بطور رجسٹرار مقرر اور قانوں کو تعینات ہو گئے تھے۔ اگرچہ مشاہیر کچھ زیادہ نہیں تھا؛ لیکن طبیعت قانع اور سادہ پائی تھی، اس میں صبر و شکر سے بسر کرتے رہے اور یہیں سے بالآخر ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء کو سکندرش بھی ہوئے۔ اسیر نے انھیں ۱۰-۱۲ سال کی عمر میں حضرت مولانا عبدالقادر بدایونی کا مرید کرادیا تھا۔ جب ان کا وصال ہو گیا، تو انھیں کے فرزند رشید مولانا عبدالقادر قادری سے تجدیدِ بیعت کی شعر میں مشورہ بھی اسیر ہی سے رہا۔ اسیر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے اور نعت پر خاص توجہ تھی۔ ضیاء صاحب نے بھی ان کے تتبع میں عمر بھر نعت نبی یا پھر منقبتِ ائمہ و صحابہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔

یہاں ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض اصحاب نے اسیر کو غالب کا شاگرد دکھایا ہے؛ ٹھیک نہیں۔ وہ مجددِ حسین امجد (تلمیذِ لدیٰ علی مذاق بدایونی) کے شاگرد تھے۔ علی احمد خان اسیر کے والدِ جنگ باز خان بریلی کے رہنے والے تھے۔ یہیں اسیر ۱۸۵۲ء (۱۲۶۸ھ) میں پیدا ہوئے اور

ابتدائی تعلیم بھی بریلی میں پائی۔ ان کے والد ٹھیکہ داری کا کام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے کام کے سلسلے میں انھیں کچھلا گھاٹ پر قیام کرنا پڑا، جو بدایوں سے ۱۸۰۱ میل دور ایک قصبہ ہے۔ اس دوران میں ان کی بدایوں کی آمدورفت بہت ہو گئی اور بالآخر انھوں نے بدایوں میں مستقل سکونت اختیار کرنی۔ اسیر کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی۔ سب کے آخر میں مدرسہ عالیہ رامپور میں مولانا عبدالحق خیر آبادی (ف ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء) سے منطق و فلسفہ کی تکمیل کی۔ تعلیم کے بعد انھوں نے اولاً ایک صاحب کی شرکت میں بدایوں میں "مطبع نسیم سر" قائم کیا، اور یہاں سے اسی نام کا اخبار بھی نکالنے لگے۔ جب ۱۸۸۱ء میں محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی، تو مطبع اور اخبار اپنے شریک کار کے حوالے کر کے الگ ہو گئے۔ اسیر اپنی ملازمت کے پورے زمانے میں بدایوں سے باہر نہیں گئے، اور یہیں سے ۱۹۱۳ء میں پنشن پائی۔ پھر اسی سال آگرے کے سینٹ جونس کالج میں عربی پڑھانے پر مقرر ہو گئے، یہاں وہ ۱۹۲۵ء تک رہے۔

۱۹۲۷ء میں حج کے لیے گئے۔ انھیں ایک زمانے سے روضہ بنوی کی زیارت کی تمنا تھی۔ چنانچہ حج کے بعد مدینہ منورہ پہنچے اور دل کی مراد پائی۔ آٹھ دن بعد پچھنبہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۷ء (۲۰ محرم ۱۳۴۶ھ) کو عین نماز میں اپنے خالق کے حضور پہنچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جناب ضیاء القادری ہی نے تاریخ کہی۔

کہیے ضیاء! سال وصال جناب
خاتمہ بالخیر ہوا بے حجاب

(۱۹۲۷ء)

بہت سا کلام نظم و نثر، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اپنی یادگار چھوڑا۔ ان میں ایک کتاب مشہور مورخ عبد القادر بدایونی کی سوانح عمری بھی تھی۔ ضیاء صاحب کو جب کی ولادت ہونے کے باعث رجبی شریف منانے کا خاص شوق تھا۔ اپنے میلان طبع کی تسکین کے لیے وہ ہندستان میں

جہاں جہاں بھی اولیاء اللہ کے مزار ہیں وہاں عرس کے موقع پر حاضری دیتے رہتے تھے بلکہ اسی دھن میں دہ عراق بھی گئے اور یہاں نجف، کاظمین اور کربلا میں عتبات عالیہ کی زیارت سے شرفیاب ہوئے، حج بھی کیا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے، اور کراچی میں مستقل طرح اقامت ڈال دی یہاں انھوں نے ایک انجمن "مجلس شیدائیان نبی" کے نام سے قائم کی تھی۔ اس کا مقصد میلاد النبی، معراج النبی، یوم خلفائے راشدین، یوم شہید کربلا اور زبرگان دین کے عرس کے موقع پر جلسے کرنا تھا۔ ان اجتماعوں کے ساتھ نعتیہ اور منقبتی شاعری بھی منعقد کرتے رہتے تھے۔ اس سے لوگوں میں شعروشاعری سے دلچسپی کے علاوہ دینی شعف و شعور بھی پیدا ہوا کرکچر میں ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے تلامذہ نے ایک "زمین" کی تشکیل کی تھی، غالباً کچھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔

ان کے نعتیہ کلام کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی نظم و نثر میں ہیں مثلاً دیار نبی منظوم یعنی سفرنامہ حج؛ مرقع شہادت (منظوم واقعات کربلا)؛ جوار غوث الوری (منظوم سفرنامہ عراق) نغمہ ربانی (منظوم میلاد شریف)؛ تاج مضامین (منظوم مناقب اولیاء)؛ قادریہ بدایوں؛ ستارہ حشمت وغیرہ۔

لیکن میری نظر میں ان کی سب سے اہم تالیف اکمل التواریخ ہے۔ اس کے دو حصے ہیں پہلے میں بدایوں کے عثمانی خاندان کے علما اور زبرگوں کے حالات ہیں؛ اس طرح بہت سا مواد جو منتشر حالت میں تھا، یکجا ہو گیا اور ضائع ہونے سے بچ گیا۔ دوسرے حصے میں حضرت مولانا فضل رسول کی مفصل سوانح عمری ہے جو کتاب لکھنے کی علت غائی تھی۔ ان کی ایک اور کتاب مجموعہ ہفت احمد (بدایوں ۱۹۶۴ء) بھی قابل قدر ہے۔ اس میں بدایوں کے ساتھ اولیاء اللہ

سہ لطفیہ ہے کہ ضیائے عثمانیوں کی مدح جو کہ تو اس پر ایک صدیقی کی رگ جیت بھڑک اٹھی۔ چنانچہ

قاضی فدا حسین (ف ۱۹۴۵ء) کے نام سے سیرۃ الحمید فی احوال سعید شائع ہوئی (۱۳۳۳ھ)

کا ذکر ہے جن کے نام کا جزو احمد ہے۔

یادگارِ جہانی ایک بیٹی اور ایک بیٹا یوسف حسن تودر ایم اے ہیں، یہ پاکستان حکومت میں ملازم ہیں۔ قطعہ تاریخ وفات ان کے شاگرد صابر براری نے لکھا ہے جس کا آخری شعر ہے:

سالِ رحلت کو ہے، صابر بسز گنبد کی صدا

"فی امان اللہ ضیاء القادری جنتِ مکاں"
(۶۱۹۷۰)

بحری تاریخ میں بھی انھیں کا مصرع ہے: آہ ولی زماں ضیاء القادری بدایونی (۱۳۹۰ھ)
ابان کی مختلف رنگوں کی نظموں کا نمونہ ملاحظہ ہو!

مناجات

اے خدایا، اے مالکِ کل کائنات	اے کریم و اے رحیم و حق صفات
خالقِ دنیوم، بتری ذات ہے	بروشنی ہر جا تری دن رات ہے
تو نے ہی پیدا کیے ہیں ہر دماہ	تیرے ہی انوار ہیں شام و گاہ
تو نے ہی پیدا کیے جن و بشر	تو نے ہی پیدا کیے ہیں بحر و بر
تو نے مخلوقات کو پیدا کیا	بزمِ موجودات کو پیدا کیا
اور میں تا آسمان ہے تیرا نور	تیرے جلوؤں کا ہے عالم میں فلور
تو ہے خلاقِ ملائک، اے کریم!	ہے ترا انساں پہ احسانِ عظیم
تو نے ہی پیدا کیے لوح و قلم	عرش و کرسی ہیں ترے زیرِ قدم
حور و غلمان ہیں ترے تسبیحِ خواں	محو طاعت ہیں ترے تسبیحِ حیاں
تو نے آدم کو بنایا خاک سے	روحِ ڈالی اپنے نورِ پاک سے
حضرتِ آدم کو یہ رتبہ دیا	سجدہ ان کو سب فرشتوں نے کیا
منحرف ابلیس سجدے سے ہوا	راندہ درگاہ فوراً ہو گیا

آدم و حوا کو جنت کی عطا
نعمتیں ان کو عطا کیں بے بہا
ہو گئے حوا سے آدم پھر جدا
دونوں صدیوں تک رہے محو بکا
آخر ان کی ہو گئی تو بہ فتول
پھر ہوئے شاداب یہ جنت کے پھول
سلسلہ اولاد کا جاری ہوا
ان پہ لطفِ ایزدِ باری ہوا
ان سے پیدا انبیاء لاکھوں ہوئے
خلق کے جو ہادی موزوں ہوئے
سب سے آخر رحمتہ للعالمین
آئے بن کر عرش کے مندر نشین
ملتِ برحق کا چمکا آفتاب
خلق میں آئے مشرِ عالیجناب
عرش سے چمکا یہ کعبے کا سراج
حق پرستی کا ہوا ہر جا رواج
دور دورہ علم و عرفاں کا ہوا
ملتِ حق کی ہوئی تعلیم عام
اے خدا! جب تک رہے قائم جہاں
بول بالا ملتِ حق کا رہے
ہر زبان پر یثرائیام آتا رہے
پرچمِ اسلام لہراتا رہے
یثرائی طاعت اور عبادت عام ہو
کام ہو دنیا کا یثرائی نام ہو

نیکوں کا ہو خدائی میں رواج

ہو فقط تیری حکومت، یثرائی راج

نعت

امین کعبہ رب آپ پر ہزاروں سلام
امین کعبہ رب آپ پر ہزاروں سلام
ہوں آپ پر شبہ والا حسب ہزاروں سلام
ہوں آپ پر شبہ والا حسب ہزاروں سلام
سلام آپ پر خضر رہ شبِ اسری
سلام آپ پر شاہنشاہ شبِ اسری

تذکرہ معاصرین

وہ آئے کبے سے دم بھر میں جانبِ اقصیٰ بنے امامِ رسل اور پڑھا یہاں خطبہ
سب انبیاء سے ملاقات کی یہاں خبر یہاں بلند یہ نعرہ ہوا سلاموں کا

سلام آپ پہ خضر رہِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئ

یہاں سے لے کے براقِ آپ کو روانہ ہوا سیرِ حضور پہ رحمت کا شامیانہ ہوا
بساطِ عرش پہ اک جشنِ خسروا نہ ہوا ادا فرشتوں کے لب سے یہی ترانہ ہوا

سلام آپ پہ خضر رہِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ شاہنشاہِ شبِ اُسرئ

کھلے حضور پہ ساتوں فلک کے دروازے سلامِ شوق کے ہر آسماں پہ تھے نعرے
ادب سے اہلِ فلک اور رسول ملتے تھے سلام کہتے تھے سب مرسلین خوش ہو کے

سلام آپ پہ، خضر رہِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ، شاہنشاہِ شبِ اُسرئ

حضورِ وادِی ہفت آسمان کیوں گزرے کہ جیسے نور گزرتا ہے پلوشیشے سے
ہر اک فلک پہ تھے سامانِ خیر مقدم کے سب انبیاءِ گرامی سلام کرتے تھے

سلام آپ پہ، خضر رہِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ، شاہنشاہِ شبِ اُسرئ

خدا کا نور، خدا کے حضور آ پہنچا حبیبِ پیشِ خداے غفور آ پہنچا
قریبِ رب، شبِ اُسرئ کا نور آ پہنچا حدِ نظر سے وہ ماہِ پارہ دور آ پہنچا

سلام آپ پہ خضر رہِ شبِ اُسرئ

سلام آپ پہ، خضر رہِ شبِ اُسرئ

حجاب اٹھ گئے، وہ بے حجاب حق سے ملے حبیبِ حق، شہِ عالی جناب حق سے ملے
 نقاب دور ہوئی، بے نقاب حق سے ملے ہو اسلام، مبارک خطاب حق سے ملے
 سلام آپ پہ خضر رہِ شبِ "اسری"
 سلام آپ پہ شامِ ہنشتہ شبِ "اسری"
 لطافتِ شبِ "اسری" کا واسطہ یارب! جمالِ نورِ سراپا کا واسطہ یارب!
 وقارِ گنبدِ خضریٰ کا واسطہ یارب! مدینہ، کعبہ و اقصیٰ کا واسطہ یارب!
 سلام آپ پہ خضر رہِ شبِ "اسری"
 سلام آپ پہ شامِ ہنشتہ شبِ "اسری"
 حضورِ شاہ میں مقبول ہو سلامِ نیاز سنو سلام، غلاموں کا اپنے بندہ نوازا
 غلام کیوں شبِ "اسری" کرین آپ ناز سین سلام، بلا لیں حضورِ تاجِ حجاز
 سلام آپ پہ خضر رہِ شبِ "اسری"
 سلام آپ پہ شامِ ہنشتہ شبِ "اسری"

نعت

السلام اے چراغِ عرش بریں! فخرِ کون و مکان، رسولِ اُمیں!
 السلام اے بنائے ارض و سما! باعثِ خلقِ آسمان و زمیں
 السلام اے مرادِ قدرتِ حق! ہمہ تن پیکرِ جمیل و حسین!
 السلام اے نگارِ محفلِ کون! جانِ ہر علم و روحِ حسنِ یقین
 السلام اے امامِ بزمِ رسل! خاتمِ الانبیاء یا تمکین
 السلام اے تجلی و الشمس! "والضحیٰ" تیرا عکس لوحِ جبیں
 السلام اے محمدِ عربی! ادا زلِ تا ابد حقیقتِ دین

السلام، اے فردغ بخشِ حیات! تاجِ عرفان و معرفت کے نیکیں
السلام، اے رفیقِ غمزدگان! خستہ جانوں کے محن اور معین

آپ سرمایہ ہدایت ہیں آپ عنوانِ لطف و رحمت ہیں
آپ ہیں تاجدارِ مخلوقات آپ بنیادِ آدمیت ہیں
آپ کے مقتدری تمام رسول آپ سرچشمہ رسالت ہیں
آپ پیغمبرِ خلیق و شفیق قاسمِ دولتِ شرافت ہیں
آپ پر ہے مدارِ حسن و جمال عشق کی جاوداں حقیقت ہیں

در پہ آئے ہیں دادرِ غم پانے آپ کے رونے پاک کے شیدا
تلخ ہے جن کی داستانِ حیات ہو چکے ہیں الم سے چکنا چور
روز آتی ہے گم و دشِ آیام جن کو اپنا خیال کرتے تھے
زخم خوردہ ہے پیکرِ ہستی خاواروں میں ہو گئے تبدیل
مَنْزِلِ معرفت کے سرزدانے گیسوے عنبریں کے دیوانے
عبرت آگئیں ہیں جن کے افسانے راحتِ زندگی کے پیمانے
رہردانِ وفا کو بہکانے بنتے جاتے ہیں سب وہ بیگانے
داغ اتنے دیے ہیں دنیا نے روح کے لالہ زار کا شانے
گوشہ گوشہ میں بن گئے دل کے کفر و باطل کے لاکھ بست خانے

المدد، المدد، رسولِ انام
مٹ نہ جائیں حضور کے یہ غلام

منقبت امیر خسرو

صد در سر پر عرفاں، حضرت امیر خسروؒ
دلدادہ نظام و قطب و فرید و خواجہ
لذت کش وصال پیر مغانِ سحر
تم ہو بہشت مسکن، تم خلد آستان ہو
خیر البشر کی امت، خیر البشر کے شیدا
صہبائے سنجری کا اک دور ہو ادھر بھی
شیدائے حسن ذات، محبوب پاک، یعنی
کیخسرو جہان شعر و ادب، مسلم
عالم، ولی، مشائخ، عارف، ادیب، شاعر
احسانِ سلطنت کے مانے ہوئے معلم
بد و سپہرا یاں، حضرت امیر خسروؒ
قل جیب رحماں، حضرت امیر خسروؒ
مست شراب عرفاں، حضرت امیر خسروؒ
تم ہو جہاں بداماں، حضرت امیر خسروؒ
قدسی صفات انساں، حضرت امیر خسروؒ
اے پیرِ بزمِ رنداں، حضرت امیر خسروؒ
نوشاہِ جنیشِ خوباں، حضرت امیر خسروؒ
میرِ صفِ سخنداں، حضرت امیر خسروؒ
سب آپ کے ثنا خواں، حضرت امیر خسروؒ
فطرت شناسِ شاماں، حضرت امیر خسروؒ
مدحت نگارِ خواجہؒ، یعنی ضیائے بکیں
غربت میں ہے پریشاں، حضرت امیر خسروؒ



ماچس لکھنوی، میرزا محمد اقبال

گذشتہ ۲۶ اگست کو مشہور مزاح نویس ماچس لکھنوی کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا، اور یوں ہماری بزم شعر و ادب سے ایک باغ و بہار شخصیت اٹھ گئی۔
مروجہ کا پورا نام میرزا محمد اقبال تھا۔ اسی لیے لوگ عرفاً عام میں انھیں ایم ایم اقبال بھی کہتے تھے۔ اپنے آبائی مکان محلہ کاٹھین گیٹ میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب اودھ کے شاہی خاندان سے ملتا ہے۔

سلطنت اودھ کے تیسرے فرمانروا محمد علی شاہ تھے۔ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے امجد علی شاہ تخت پر بیٹھے، اور ان کے بعد واجد علی شاہ، جنھیں انگریزوں نے ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا اور اودھ کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسی پر سلطنت اودھ کا خاتمہ ہو گیا۔
رہے نام اللہ کا۔

محمد علی شاہ کے امجد علی شاہ کے علاوہ بھی متعدد اولادیں تھیں۔ ان میں دو بیٹے میرزا رفیع الشان اور میرزا فرخندہ بخت بھی تھے۔ میرزا فرخندہ بخت کے پوتے میرزا احمدی حسین (ابن میرزا رضا علی) ماچس کے والد تھے۔ دوسرے شاہزادے میرزا رفیع الشان کے بیٹے میرزا ابراہیم علی

عیش تخلص کی بیٹی (سلطان جہان بیگم) میرزا ابراہیم حسین کے عقد نکاح میں تھیں۔ یہی ماہرین کی والدہ تھیں، گویا ابراہیم علی عیش ان کے نانا تھے

ایک تو شاہی خاندان میں اولاد کی کمزرت تھی ہی، اس پر زلمے کا رواج بھی کچھ ایسا ہی تھا، غرض شاہزادوں کی تعلیم کی طرف سے بہت غفلت برتی جاتی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم تو سرے سے تھی ہی نہیں۔ اگر کسی کو اردو میں شہر بد ہو گئی، یا قرآن کا ایک ادھر پارہ ناظرہ پڑھ لیا، تو گویا تعلیم کی معراج حاصل کر لی۔ لڑکوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ انھیں کہیں لڑکری یا کوئی پیشہ تو اختیار کرنا نہیں تھا، اس لیے شاہی خاندان کے بچے عام طور پر جاہل رہتے تھے۔ اس ماحول کے برخلاف عیش کو پڑھنے لکھنے سے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مختلف اساتذہ سے عربی اور فارسی کی معقول تعلیم حاصل کی۔ خیر، یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے طب پڑھنے پر توجہ کی جب اس کی خبر ان کے والد میرزا رفیع الشان کو ملی، تو وہ بہت خفا ہوئے کہ ہمارا بیٹا ہو کر طب پڑھنا کیا معنی! یہ تو ہماری شان ریاست کے منافی ہے۔ میرزا ابراہیم علی نے اس کے باوجود چوری چھپے اپنی تعلیم جاری رکھی اور رفتہ رفتہ اسے مکمل کر لیا۔ جب رفیع الشان کو معلوم ہوا کہ صاحبزادے نے میرے کہنے کی پروا نہیں کی اور حکیم بن گیا ہے تو حکم دیا کہ آج سے ابراہیم کبھی ہمارے سامنے نہ آئے، ہم اس مردود کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتے، اس نے طبابت کا پیشہ اختیار کر کے ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے نام کو پٹہ لگایا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد عمر بھر باپ بیٹوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور بیٹے نے صرف ان کی مٹی میں شرکت کی۔

لیکن نام بڑا اور درشن چھوٹے۔ نام کو تو یہ شاہی خاندان تھا، لیکن درشنوں کا یہ حال تھا کہ سب رفیع الشان کا انتقال ہوا ہے تو ابراہیم علی کو تائیس روپے اور کچھ آنے و شیعے کے ملے اور تیس روپے کی پولیٹیکل نیشن باپ کے ترکے میں سے ملی، بڑے کے کل ستادین روپے۔ ان کا ذریعہ معاش طبابت کا پیشہ تھا۔ اگر یہ نہیں ہوتا، تو خیال کیا جاسکتا ہے کہ کیا گزرتی۔

میش اپنے زمانے میں خاصے مشہور ہوئے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں رحلت کی۔ اچھی لمبی عمر پائی۔ وفات کے وقت ۹۰-۹۵ برس سے کم کے نہیں ہونگے۔

ماچس کے والد میرزا اہری حسین نے عین جوانی میں ۱۹۲۹ء میں انتقال کیا۔ محدود ذرائع معاش کے باعث فراغت کا تو کیا ذکر، گزراوقات بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کے بچوں کی معقول طریقے پر تعلیم بھی نہ ہو سکی۔ ماچس بھی مدرسے میں ٹل سے آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ محلہ ذوبستہ کے اسکول میں پڑھتے رہے، جو ان کے مکان کے بالکل قریب تھا۔ اس کے بعد کچھ انگریزی کی شب بد گھر پڑا اور عربی فارسی اپنے نانا میرزا ابراہیم علی عیش سے پڑھی لیکن دونوں سے واقفیت اور پوری رہی۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک عیش کبرنی کے باعث ضحیل ہو چکے تھے اور زیادہ محنت کے قابل نہیں رہے تھے۔

۱۳۱۳ھ میں کاسن تھا، جب ماچس کو شاعری کی چٹیک لگی، اور اس میں وہ انور حسین آرزو لکھنوی مرحوم (ف ۱۹۵۱ء) کے فارغ الاصلاح شاگرداغن صاحب وقار سے مشورہ کرنے لگے، جو انھیں کے محلے میں رہتے تھے۔ وہ اب انہیں اقبال تخلص کرتے تھے، اور سنجیدہ غزلیہ کلام کہتے اور مشاعروں میں شائے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں وقار کا انتقال ہو گیا۔ اس کے کچھ دن بعد آرزو صاحب کلکتے سے وارد لکھنؤ ہوئے، تو ماچس ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، وقار سے اپنے تلمذ کا ذکر کیا اور ان سے اصلاح کی درخواست کی۔ آرزو نے کلام پر اصلاح دینا منظور کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جتنے دن لکھنؤ میں ہوں، شوق سے آؤ، لیکن میری عدم موجودگی میں سید آل رضا ایڈووکیٹ (تلمیذ آرزو، حال مقیم کراچی) سے مشورہ کرو کیونکہ خط و کتابت کے ذریعے سے نہ مکمل استفادہ ممکن ہے، نہ کلام پر اصلاح ہی نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

سید آل رضا سے یہ تعارف ماچس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ ان کی وساطت سے یہ انجمن بہار ادب لکھنؤ کے رکن بن گئے، جس سے ادبی حلقوں سے ان کی شناسائی کا دائرہ وسیع تر

ہو گیا۔ اسی زمانے میں آل رضا صاحب یتیم خانے کے سکتر مقرر ہو گئے، تو انھوں نے ماچس کو یتیم خانے کے لیے کمیشن پر چندہ جمع کرنے کا کام سپرد کر دیا۔ جب تک آل رضا سکتر رہے، یہ کام ان کے پاس رہا؛ بلکہ شاید ان کے الگ ہونے کے بعد بھی کوئی سال بھر یہ کام کرتے رہے۔ غالباً ۱۹۴۴ء میں ماچس کا پنور کی مشہور رہائش فیکٹری میں ملازم ہو کر وہاں چلے گئے۔ یہاں کی نوکری دو سال رہی۔ اس کے بعد راشن کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ جب یہ محکمہ تخفیف میں آگیا، تو اپریل ۱۹۴۸ء میں سلیس کس کا محکمہ قائم ہوا، اور راشن والے بیشتر ملازموں کو اس میں جگہ دی گئی۔ چنانچہ ماچس بھی جون ۱۹۴۸ء میں اس دفتر میں عارضی ملازم ہو گئے۔ مشکل یہ تھی کہ مستقلی اس وقت تک ممکن نہیں تھی، جب تک ان کے پاس ہائی اسکول کا سرٹیفکیٹ نہ ہو۔ ماچس (اور ان کے بعض اور ساتھیوں نے بھی) خاص طور پر انگریزی سیکھنے کا انتظام کیا اور بورڈ کے امتحان میں بیٹھے اور یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا۔ یوں ۱۹۵۶ء میں وہ ملازمت میں مستقل ہو گئے۔ وہ کا پنور میں ۱۹۶۱ء تک رہے اور اس سال والدہ کے اصرار پر بھٹنڈہ تبادلو کر لیا۔ والدہ کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔

آرزو اور ان کے تلامذہ کی فنی بہارت مسئلہ ہے اور اس کا سب سے اعتراف کیا ہے۔ وقار اور آل رضا کے علم و فضل سے ماچس نے بھی استفادہ کیا اور فن عروض و شعر میں خاصی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ لیکن بہت جلد اپنی طبیعت کے اقتضا سے وہ اقبال سے ماچس ہو گئے۔ اور مزاحیہ رنگ میں کہنے لگے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ کسی مشاعرے میں طرح ہوئی؛ دل ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟ جب کسی نے یہ مصرع اقبال صاحب کے سامنے پڑھا، تو انھوں نے گرہ لگا کر اسے یوں پورا کیا:

دل ناداں! تجھے ہوا کیا ہے

حلق تک آ کے جھانکتا کیا ہے!

اس پر ان کے برادر بزرگ میرزا محمد عزیز معزز لکھنوی نے کہا کہ تم اپنی غزل اسی مزاحیہ رنگ

میں مکمل کرو اور شاعرے میں پڑھو۔ اس کامیابی پر وہ مستقلاً مزاحیہ شاعر ہو گئے۔ انھوں نے کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں کیا، غالباً باقاعدہ بیاض بھی نہیں رکھی۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو کچھ کہا، از بر تھا۔ دوست احباب کی مجلسوں میں گھنٹوں اپنا کلام سناتے اور کہیں غلطی نہیں کرتے تھے۔ تذکروں ان کی نظمیں اودھ پنچ (دورثانی) اور شوکت تھانی کے سرچ میں چھپی رہیں۔ شوکت مرحوم ہمیشہ ان کے نام کے ساتھ ظریف الملک کا خطاب لکھا کرتے تھے۔

انھوں نے بعض مشہور نظموں کی کامیاب پیروڈی اکھی ہے مثلاً ان کی اقبال کے شکوہ کی پیروڈی ”شکوہ شکر“ معر کے کی چیز ہے، اس میں راشن کے زمانے میں شکر کی قلت کی شکایت کی ہے۔ چاند کا ریڈیو اسٹیشن، ہنکائی، خاندانی منصوبہ بندی بھی ان کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ ان کا کچھ سنجیدہ کلام بھی ہے، خاص طور پر نوحے اور سلام۔ ان میں وہ بہت مستین رہے ہیں۔ موضوع کی سنجیدگی کے پیش نظر ان میں مزاح سمجھ بھی ہوتا۔ اس کلام میں تخلص سوختہ کیا ہے۔

ان کے احباب کو فوراً توجہ کرنا چاہیے؛ منتشر کلام کیا کر کے چھاپ دیا جائے۔ طنزیہ مزاحیہ شاعری میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ جاری زندگی کی جو افتاد ہے اور کشمکش حیات جس فضا سے تیز و تند ہوتی جا رہی ہے، اس کے پیش نظر اب کسی اچھے مزاح نگار کے پیدا ہونے کی امید کم ہے۔ اس لیے یہ ادب کی خدمت ہوگی کہ جلد ان کا کلام محفوظ ہو جائے۔ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے لیے بڑے سلیقے اور فطری اور جذباتی ضبط کی ضرورت ہے۔ بد قسمتی سے اسی کا شمار ہاں فقدان ہے۔ اگر شاعر کو اپنے اوپر قابو نہیں ہے، تو اس کا استدلال کی طرف مائل ہو جانا لابد ہے۔ ماچس مرحوم کے مزاح میں بڑی سنجیدگی اور شگفتگی اور نچنگی ہے اور ان کا کلام بہت پر وقار ہے۔ اردو ادب کی یہ نہایت بد قسمتی ہوگی، اگر یہ ضائع ہو گیا۔

پچھلے جون میں انھیں کینسر ہو گیا۔ دو تین ہفتے بہت تکلیف میں گزرے۔ آخر وقت موغلو

آگیا اور وہ ۷۷ سال کی عمر میں ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء شام آٹھ بجے راہی ملک بقا ہو گئے۔ انھوں نے شادی اچھی بڑی عمر میں ۱۹۶۴ء میں کی تھی اپنے پیچھے بیوی کے علاوہ تین بالکل نوجوان سال بچے (دو لڑکے اور ایک لڑکی) جسمانی یادگار چھوڑے۔ اگلے دن کربلائے امین لدولہ (لکھنؤ) میں آخری خواجگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے کھینچے فرخ نواب سگار لکھنوی نے تاریخ کھی ہے!

مصرع تاریخ ہجری میں یہ لکھ دو اے سگار!

یسکنہ خلد بریں اقبال ماچس لکھنوی

نمونہ کلام میں سب سے پہلے شکوہ شکر ہی دیکھیے، جو اقبال کی مشہور نظم "شکوہ کی پیڑ پڑی ہے" کیوں نمک خوار بنوں، زود فراموش رہوں فکر زدہ نہ کروں، محو غم دوش رہوں گڑا کے طعنے بھی سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں ہمنشیں میں کوئی مردہ ہوں کہ خاموش رہوں نفع اندوزوں سے الفت کی جلن ہے مجھ کو

شکوہ شکر سے یہ خاتم بدہن ہے مجھ کو

خاص درجے کے مٹھاسوں میں تو مشہور ہیں ہم اب کہ چپٹی سے مرتبے سے بھی مجبور ہیں ہم مرتباں کہتے ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے شکر! شکوہ ارباب غذا بھی سن لے

تلخ کاموں سے ذرا اپنا گلہ بھی سن لے

تجھ سے بیگانہ تھے سلجوق بھی، تورانی بھی اہل چیں چین میں، ایران میں ایرانی بھی تجھ بڑے شہرہ آفاق تو یونانی بھی ایک سے ایک یہودی بھی تھے، نصرانی بھی

کی ہے بل بیل سے کھیتوں پہ چڑھانی کس نے؟

بوکے گئے کو، تری بات بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں ناؤ پر لاد کے بھیجا تجھے دریاؤں میں لیک میں ڈھال کے پہنچا یا کلیساؤں میں گاڑے جھنڈے ترے ہر شہر میں اور گاؤں میں

ہیں فہرست میں ہوتے جو بھانڈاؤں کی
تیرا دم بھرتے یونہی چھاؤں میں تلواروں کی

اب بھی ہے دل میں ہمارے وہی سوز اور ہی ساز جھولے ہاتھوں میں لیے صبح پہر، بعدِ ناز
"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نوا
"بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے"

آ کے دوکان پہ راشن کی سبھی ایک ہوئے

اور دوکان سے راشن کی جو ناکام پھرے حسرت و صل میں ننگے ہی لیے دام پھرے
بڑی دوکانوں پہ لے لے کے ترانام پھرے مضطرب ہجر میں تیرے سحر و شام پھرے
چھوٹے چھوٹے کھلی دوکاندار نہ چھوٹے ہم نے
چوہ بازار میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

آ کے دوکانوں پہ گیہوں کے مقابل تو نے اک اشارے پہ سزاؤں کے لیے دل تو نے
سر پٹول کو کیا عشق کا حاصل تو نے پھونک دی گرجی دیدار سے محفل تو نے
کیا کہا سینے ہمارے شکر آباد نہیں

تیرے بوڑوں پہ لدے پڑتے تھے، کیا یاد نہیں؟

یادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے سنتے ہیں جام بکف نغمہ کو کو بیٹھے
ہیں جو دوکان پہ راشن کی ہر اک سو بیٹھے تیرے دیوانے ہیں سب منتظر ہو بیٹھے

کلاک منشی کو پیامِ رقم افروزی ہے

تولنے والے کو فرمانِ نظر سوزی ہے

صنفِ نازک نے کیا فاش جو تھلا بھر کارا لے اڑا بلبل بے پر کو مذاق پر داز
میز اور کرسیاں ہیں مرکزِ صدنا و دنیا ہٹلوں میں ہے وہ چھڑنے کو ترے نام کا سا

چائے بیتاب ہے، بندل سے نکلنے کے لیے
کشتی رکھی ہے بھٹی پہ ابلنے کے لیے

تذکرہ معاصرین

شکلیں ہم سے شریفوں کی تو آساں کر دے یہ نہیں کہتے کہ سہدوش سلیمان کر دے
جنس لذت کو باس حال اب انداز کر دے بسکہ ہر ذائقہ دشمن کو مسلمان کر دے

پھر لبہ جدت یا ورچی دیر سینہ ما

میں رسد در شکم ما ز رہ سینہ ما

میری بیگم کبھی جو بزرگ بھی جیسے ان بھی ہوئیں جائے پی پی کے نمک کی وہ پریشاں بھی ہوئیں
”بھارت میں جائے شکر“ کچھ کے گزراں بھی ہوئیں کشتی ٹوٹ گئی، پیالیاں دیراں بھی ہوئیں

غم ہے شوہر کو کہ دولت ہوئی برباد اس کی

خوش ہیں بیگم کہ سنی کوئی نہ فریاد اس کی

چاک پھر شاہر بیگیں کی نوا سے دل ہوں جاگنے والے اسی بانگِ در سے دل ہوں
پُریوں بیوی کے، تو شوہر کی وفا سے دل ہوں بدلے غصے کے محبت ہی کے پیاسے دل ہوں

ماچھی اس واسطے گلِ شعلہ طرازی ہے مری

لاکھ غصہ ہے، پہ بیوی تو نمازی ہے مری

مندرجہ ذیل نظم خمار بادہ بکوی کی ایک نظم کی سپرد ڈالی ہے:

بیوتانی پہ تلو گئے، مجھے معلوم نہ تھا (۱) نام سے میرے چڑو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

گالیاں، کو سنے دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا یوں مری قدر کر دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

کیا کہوں، میں نے محبت کی جہالت کیوں کی (۲) کیا کہوں، طرزِ تغافل کی شکایت کیوں کی

کیا کہوں، عرضِ تمنا کی حماقت کیوں کی یہ سوالات کر دو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

بات ہے کل کی، کہ پہنے ہوئے چھوٹی سی فراک (۳) پونچھ دیتی تھی کھلائی، جو ٹپک پڑتی تھی ناک

آج یہ ڈیل، یہ ڈول، اور یہ لمبی پوشاک مثل کمرہ می کے بڑھو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

یاد ہے یاد ہے، بچپن کا وہ عالم کہ نہیں؟ (۴) منت نئے کھیل ہوا کرتے تھے باہم کہ نہیں؟

چوکیوں، تختوں پر رہتی تھی دھما دھم کہ نہیں؟ بڑھ کے اس طرح کھلو گئے، مجھے معلوم نہ تھا

ایک ہی مولوی صاحب سے پڑھا کرتے تھے (۵) ایک سے ایک شرارتیں بڑھا کرتے تھے کھیلتے کودتے کوٹھے پہ چڑھا کرتے تھے بات بھی اب نہ کرو گے، مجھے معلوم نہ تھا گھر سے پیسے بھی چرا کر نکھیں دے جاتا تھا (۶) بے شمارے نہ کوئی چیز کبھی کھاتا تھا تم جو روتے تھے، تو بس ساتھ میں لوٹا تھا میرے رونے پہ منہ نہ لگے، مجھے معلوم نہ تھا حسن اور عشق میں رہتے ہیں ازل سے جھگڑے (۷) ہاں مگر تم سے سیانے کبھی دیکھے نہ سنے داغی بھی دیے، ہاتھ بھی کچھ جھاڑ دیے اس طرح جم کے لڑاؤ گے، مجھے معلوم نہ تھا جس طرح باپ کا ڈر ہے نکھیں بھائی کا خیال (۸) جس سے ہے خلق کی انگشت نمائی کا خیال کاش آجائے یونہی وعدہ وفائی کا خیال عہد سے اپنے پھر و گے، مجھے معلوم نہ تھا ایسے بھڑکے کہ بالکل ہی بدل جاؤ گے (۹) آکے آغوش تمنائیں اچھل جاؤ گے اس طرح دام محبت سے نکل جاؤ گے پھر دوبارہ نہ پھینو گے، مجھے معلوم نہ تھا فقی خوشی اس کی کہ تم میرے بنو گے محسن (۱۰) بیٹھ کے ہاتھ سے خود اپنے سیو گے اک دن اسی امید پہ پھاڑا تھا گریباں، لیکن سوئی تا کا بھی نہ دو گے، مجھے معلوم نہ تھا طب پڑھی میں نے کہ تم کو جو شکایت ہوگی (۱۱) میرے ہی ذریعہ علاج آنے کی حاجت ہوگی ایکس رے غیر کرے، اف، یہ ضرورت ہوگی ایسا بیمار پڑو گے، مجھے معلوم نہ تھا مختصر یہ ہے کہ جس کی کوئی امید نہ تھی (۱۲) وہی آنکھوں سے، مقد نے دکھائی ہے گھڑی آخری وقت بھی تم بیٹھ کے بائیں پہ مری لکھیاں تک نہ جھلے گے، مجھے معلوم نہ تھا تم کہاں ہو، یہ میں کیا کرتا ہوں تم سے شکوہ (۱۳) ہاں، مجھ کو تو جدائی نے مڑی کر ڈالا یہ خبر ہوتی، تو واللہ میں پہلے مرتا مجھ سے تم پہلے مرو گے، مجھے معلوم نہ تھا راہ پر لگ کے بھی ستھ سے اکھڑا جاؤ گے (۱۴) گرمی عشق کے موسم میں اکرا جاؤ گے اس طرح منزل انکار پہ اڑ جاؤ گے اک قدم بھی نہ بڑھو گے، مجھے معلوم نہ تھا آخر میں ایک غول کے چند شعرا حلقہ ہوں!

تذکرہ معاصرین

شیخ آئے جو حشر میں تو اعمال ندارد جس مال کے تاجر تھے، وہی مال ندارد
مال باپ بھائی ان کے سبھی ساتھ ہیں میرے اب گھر اس سال ہے، اس سال ندارد
معلوم کیا ان کا جو شجرہ، تو یہ پایا کچھ یونیسی خفیال ہے، دودھیال ندارد
ماچس! نہ ہمیں آتش سوزاں سے لگے آگ
ہو جلے نہ پنڈال کا پنڈال ندارد



سیلمان اریب حیدر آبادی

پچھلے سال بھر میں حیدر آبادی ادیبوں پر یہ موت کا تیسرا حملہ ہوا ہے۔ ہنوز محذوم محی الدین اور خورشید احمد جامی کی دائمی مفارقت ہی سے ہمارے اوسان بجا نہیں ہوئے تھے کہ، ستمبر کو سیلمان اریب کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اریب نے نسبتاً بہت کم عمر پائی۔ ان کا صحیح نام محمد تھا اور وہ سیلمان بن عبدالرزاق کے بیٹے تھے۔ ۵ اپریل ۱۹۲۲ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد یافعی قبیلے کے عرب تھے۔ بزرگوں میں کوئی صاحبِ حضر موت سے ہجرت کر کے حیدر آباد آگئے تھے۔ سیلمان بھی بیشتر دوسرے عربوں کی طرح حیدر آباد کی فوج (اے سی گارڈ) میں رسالہ دار تھے۔ اگلی پانچ چھ برس ہوئے انتقال کیا۔ اریب کی والدہ اکوڑی پٹھان خاندان سے تھیں۔

گھر کے حالات تو جیسے تھے، وہ ظاہر ہی ہے، لیکن اریب کو کم عمری ہی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا اور ۱۹۴۲ء سے تو انھوں نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا ہی بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی تعلیم سے بے توجہی برتی اور دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ رہی سہی کسر سیاست نے پوری کر دی۔ وہ ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس میں قید و بند

تک کی نویت آئی۔ اسی سال جب حکومت ہند نے حیدر آباد کے خلاف اقدام کیا، تو اریب نے 'مجاہد تلنگانہ' کے عنوان سے ایک نظم جلسہ عام میں سنائی۔ اصحاب اقتدار کی نظریں یہ نظم قابل اعتراض ٹھہری اور وہ گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور دو برس قید کی سزا ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء میں رہا ہوئے، تو اب مقامی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے، اور امن کمیٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری بن گئے۔ ۱۹۵۲ء میں حیدر آباد کے طلبہ نے زبردست ہڑتال کی تھی، اریب نے بھی اس میں جوش و خروش سے شرکت کی۔ چونکہ نقص امن کا خدشہ تھا، اس لیے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ بارے، اب کے دو پہنچے بعد پائی نصیب ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے مزاج میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہو گیا، اور ۱۹۵۴ء میں وہ کیونسٹ پارٹی سے بھی الگ ہو گئے۔

اریب بہت دن تک ادب اور صحافت سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۸ء میں اپنی گرفتاری سے پہلے وہ سہفتہ وار جمہور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور رہائی کے بعد ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ 'جراغ' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ جون ۱۹۵۱ء میں نکلا تھا۔ اس کے کل ۱۲ شمارے شائع ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۵۳ء میں وہ ادارہ ادبیات اردو کے ماہنامہ 'سب رس' کی ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے ماہنامہ 'صبا' جاری کیا۔ دراصل یہ پرچہ انجمن ترقی اردو حیدر آباد کے تعاون سے شروع ہوا تھا، لیکن بعد کو انھوں نے اسے اپنا ذاتی پرچہ بنالیا۔ مالی مشکلات کے باعث اس کی اشاعت میں بھی بیقاعدگی ہوتی رہی، لیکن لستم پشتم انھوں نے اسے جاری رکھا، چنانچہ یہ ان کی موت تک شائع ہوتا رہا۔

انھیں پچھلے دو سال سے کنسر کا جھلکا رخصتہ لاحق تھا۔ لیکن ان کے تختل اور قوت برداشت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس سے ان کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں پارسال (مارچ ۱۹۶۹ء) کے اوائل میں غالب صد سالہ یادگار کی تقاریب میں شرکت کے لیے حیدر آباد

گیا، تو وہاں کے جلسوں میں انھیں موجود پایا۔ ابھی تین چار مہینے ہوئے، یہیں دلی میں ایک ادبی اجتماع میں پھر ان سے ملاقات ہوئی؛ وہ آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر کسی سرکاری مشاعرے میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔

اگرچہ علاج میں کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن کیسر منور لا علاج ہے۔ حالت روز بروز نازک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ بالآخر انھیں حیدرآباد کے کینسر اسپتال میں داخل کر دیا گیا ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء کی شام تک وہ بظاہر بالکل ٹھیک تھے اور شب کی دوائی لے کر حسب معمول سو گئے۔ آدھی رات کے قریب طبیعت کا ایک خراب ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد ساڑھے تین بجے (علی الصباح) جان بحق ہو گئے۔ جنازہ ۷ ستمبر کی شام کو اٹھا اور انھیں خیرت آباد (حیدرآباد) کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اریب نے شروع میں نثر میں بھی بہت کچھ لکھا؛ اس میں افسانے اور ڈرامے تک شامل ہیں لیکن بعد کو وہ کاملاً شعر گوئی کے لیے وقف ہو گئے۔ شعر میں ان کا صرف ایک مجموعہ ”پاس گریباں“ کے عنوان سے شائع ہو سکا (حیدرآباد ۱۹۶۱ء) ”حیدرآباد کے شاعر“ کا دوسرا حصہ بھی انھیں نے مرتب کیا تھا، یہ بھی ۱۹۶۱ء میں چھپا۔ بہت سا کلام غیر مرتب صورت میں منتشر پڑا ہے۔ وہ نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ حال آنکہ وہ جدید دور کے شاعر تھے اور ان کے خیالات و افکار کبھی ردایتی نہیں تھے، لیکن زبان کے معاملے میں وہ بہت سخت ردایت پسند تھے؛ اور اس میں کسی آزادی اور سیراہروی کے روادار نہیں تھے۔

پس ماندگان میں ان کا اکلوتا بیٹا حسین اور بیوہ صفیہ اریب ہیں۔ اریب کی پہلی شادی واحد خاتون سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ایک لڑکی ہوئی۔ لیکن دونوں ماں بیٹا ایک کے بعد دیگرے چل بسے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی والدہ کے اصرار کے باوجود سات آٹھ سال تک دوسری شادی نہیں کی۔ اب وہ مشاعروں کے ہر عزیز شاعر کی حیثیت سے روشناس عالم تھے۔ صفیہ نے انھیں مشاعروں میں دیکھا اور سنا؛ اور اس کے بعد اپنے والد (جناب محمد ستر

ایڈوکیٹ کی مخالفت کے باوجود ان سے شادی کر لی، حال آنکہ ان کی اپنی تعلیم ایم اے تک تھی اور ارب بیا کہ بکھ چکا ہوں، انٹرنس سے زیادہ نہیں تھے۔
عشق ازیں بسیار کردہ است و کند

اب ان کے چند شعر دیکھیے!

بے دامن و بادیدہ تر زندہ ہوں	آئینہ بکف، خاک بسر زندہ ہوں
مجھ زندہ خراب کو دیکھ، اے دنیا!	ہر سانس پہ مرتا ہوں، مگر زندہ ہوں
گزر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے	حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا
بیزنگی اوقات ابھی باقی ہے	بیمہری حالات ابھی باقی ہے
اے ماہِ بے جا چھوڑ کے ایسے میں مجھے	میخانے میں کچھ رات ابھی باقی ہے
سوچتا ہوں دنیا کو چھوڑ کر کہاں جاؤں	تیری بے پیراں ہر نفس سے آتی ہے
ہر مرحلہ دہر کو آساں کر لوں	مرنے کے لیے جینے کا سا ماں کر لوں
چلتا ہوں، مگر چلنے سے پہلے، اے موت!	پیمانے کے ہر خط کو رگ جاں کر لوں
مٹ گئے جس کے لیے نام تک اس کا نہ دیا	کاش اس بات کی اس کو بھی خبر ہو جاتی!
تھی تو مرہم کی ضرورت، پر تری یاد کے ساتھ	ایک نشتر سامنے دل کے قریب کج بھی ہے
وہی میں ہوں، وہی دل ہے، وہی سحر، وہی نوا	کہ یہ خاکستر دل آج بھی آتش بدماں ہے
جیسے اک لمحے کو رک جاتی ہے نبضِ عالم	جب مے پاس سے وہ ہو کے نکل جاتے ہیں
رد زاک دامن تو کوئی کہاں سے لائے!	شیوہ دیدہ خونبار وہی ہے کہ جو تھکا
تیری خوشی سے بھد نہ سکی اس کا غم نہیں	غم سے ترے نباہ کی خواہش ضرور ہے
انجامِ رسم و راہ اگر چہ ہے سامنے	پر تجھ سے رسم و راہ کی خواہش ضرور ہے
پیہم نوازہ شیں بھی محبت نہیں، مگر	الطافِ گاہ گاہ کی خواہش ضرور ہے
غضب تو یہ ہے کہ تجھ کو بھی کچھ خبر نہ ہوئی	ہوس کا سلسلہ کب پترے پیار تک پہنچا

حادثہ یہ ہے، پلٹ کر بھی نہ دیکھا تو نے
دشتِ پُر ہول کا اندھیرا کیا!
عشق میں شام کیا، سویرا کیا!
زمین بھی اپنی نہیں ہے یہ راز آج کھلا
سمجھ رہے تھے دو آنے، ہے آسمان پنا
بھیس کیا کیا نہ زمانے میں بنائے ہم نے
تیرے پہلو سے بھی پہنچے نہ ترے پہلو تک
وہ دن گئے کہ کرتی قیامت بھی انتظار
یہ بھی شاید تر اندازِ دل آرائی ہے
تو مرے چاک گریباں سے تو مجھ بے ہو
کیا تر حال بھی اے انجمنِ آداب ہے یہی
تمام عمر میاں اکون ساتھ دیتا ہے!
پیار کا درد کا مذہب نہیں ہوتا کوئی
سچ تو یہ ہے کہ میں ہر زم میں تنہا ہی رہا
چاندنی، پھول، ہوا، جام، ترے خوشبو
مجھ کو خود مجھ سے بھی ملنے نہیں دتی دنیا
نہیں نشہ نہ سہی، بخود ہی تو دے مجھ کو
پھرتے ہیں کب سے سر کو متھیلی پہ رکھ کے ہم
آج بھی ہاتھ پہ ہے تیرے پسینے کی تری
دل کی بستی سے کبھی یوں نہ گزرتی تھی صبا
ہم نے بھی چھوڑ دیا، مسلکِ آدابِ وفا
دہ بھی اب بھول گئے شیوہ بیداد گوی

کرطوی خوشبو

ایک شہکارہ بیباک ہے ہر سو

ان گنت صدیوں سے یہ ہنگامہ
یوہنی بپا ہے ہر سو
جس میں
میں بھی تو بھی
اس طرح جکڑے ہوئے وسعتِ زنجیر تک آزاد بھی ہیں
جس طرح مکڑی کے جانے کے اسیر

پاس سے ہو کے مرے کوئی جوانِ رعنا
جب بھی گزرا ہے مرا جی چاہا
اس کو لپٹا کے کئی پیار کروں

ہاے وہ پیکرِ ناظورہ صد عشوہ طراز
جب بھی آیا ہے تصور میں مرے -
میں نے جینے کی تمنا کی ہے

رات چپکے سے مرے کمرے میں
چاند کی ایک کرن در آئی۔
اس نے سرگوشی میں مجھ سے یہ کہا:
”اؤ ہم چاند تک ہو آئیں نہ را“
چاند کی سیر سے جب میں لڑا
گھر کی دہلیز پہ سورج تھا کھڑا

تذکرہ معاصرین

اُف یہ برسات، یہ ہنگام گل وُمل، یارب!
عام کر دے کہ یہاں کوئی بھی
تشنہ لب رہنے کا شکوہ نہ کرے
ساقی کوثر سے وہاں

اب بھی ہنگامہ بپا ہے ہر گھو
شام سے صبح مگر کیسے ہو
رات کی صبح نہیں ہوتی ہے
زہر کی لہر ہے، یا موت کی کڑا دی خوشبو
لمحہ لمحہ مرے حبی جاں سے گزر جاتی ہے
پیتھڑن لینے سے کچھ دیر کو نیند آتی ہے
زندگی

آج یہ معلوم ہوا
کچھ بھی نہیں
چھپکلی بھی نہیں

ہاں، اسکی کٹی دُم ہوگی
فرسٹریشن نمبر دس

ہم نے دو کتے پالے ہیں
ایک کو مامالے آنی تھی
جب وہ اتنا سا پلا تھا
دوسرا کتا بھی بن مانگے اک صاحب نے بھیج دیا تھا

میری بیوی دودھ دے دے کہتے (ان کے بچس ہونے کی وجہ سے)

_____ رکھنے پر تیار نہیں تھی

لیکن میرے بچے کی ضد کی بالآخر جیت ہوئی تھی

اب یہ کہتے مامی ٹوٹی گھر کی رکھوالی کرتے ہیں

ساتھ ہمارے ہی رہتے ہیں

ان کتوں سے میری بیوی پہلے بھی نفرت کرتی تھی

اور اب بھی نفرت کرتی ہے

میرا بچہ جو تنہا ہے _____ ان کتوں سے

اب بھی پیار کیا کرتا ہے

گھنٹوں ان کو ساتھ لیے گھوما کرتا ہے

میرا ان کتوں سے رشتہ، خونی یا روحانی

کیا ہو سکتا ہے؟

کتے بھی واقف ہیں اس سے

میں کہ نہیں اصحاب کھف سے

لیکن اب یہ حال ہے میرا _____ روزانہ

جب تک کتوں کے رات کا بند و بست نہیں ہوتا ہے

مجھ کو اپنا کھانا پینا جرم انسانی لگتا ہے

یہی نہیں بلکہ مجھ کو تو اکثر یہ احساس ہوا ہے

کچھ بھی نہیں اب زلیست کا مقصد

کتوں کی خاطر جیتا ہوں

حقی حزیں، توفیق الحق میرٹھی

حزیں تخلص، توفیق الحق نام، حقی خاندانی نسبت، وطن میرٹھ۔ حقی نسبت خاندان کے مؤثر اعلیٰ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ف جون ۱۶۴۲ء) کی طرف ہے، جن کا نام اس ملک میں حدیث کی ترویج کے سلسلے میں رتی دنیا تک یاد رہیگا جیسا کہ ظاہر ہے، یہ خاندان دہلی دلی کا رہنے والا تھا۔ یہاں سے نقل مکان ان کے والد وحید الحق حقی نے کیا: وہ ۱۹۰۲ء میں سلسلہ درگاہ میرٹھ چلے گئے اور وہیں بس گئے، وہ وہاں پوری میں ملازم تھے۔

جناب وحید الحق نے میرٹھ میں ایک بیوہ خاتون سے شادی کر لی تھی۔ حزیں تقریباً ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی یہ کم سن تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ بچپن بہت تنگی ترشی سے بسر ہوا۔ ان کے اخیانی بھائی قاضی نعمان احمد نے جو جی میں پیشکار تھے، دیکھ بھال نہ کی ہوتی تو خدا معلوم کیا حشر ہوتا! بارے انھوں نے دستگیری کی۔ توفیق الحق اور ان کی ڈو پھوٹی بہنوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت انھیں کی نگرانی میں ہوئی۔ ابتدا میں تعلیم مذہبی علوم تک محدود رہی قرآن حفظ کیا اور مدرسہ اسلامیہ (گذری بازار)، میرٹھ میں عربی اور فارسی پڑھی، گویا اچھے خاصے نیم لائن گئے۔ لیکن قدرت کو بہتر منظور تھا۔ مدرسہ اسلامیہ کے زمانہ تعلیم ہی میں انھیں

شعری معنوی اور دیوان حافظ نے بہت متاثر کیا اور یہ خود بھی کچھ غوں غاں کرنے لگے ۱۹۲۲ء میں ایک مقامی دفتر میں معمولی ملازمت بھی مل گئی، جس سے لمبر اوقات کا کچھ سہارا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ یہی نہیں، بلکہ ذاتی کاوش سے انگریزی میں بھی خاصی استعداد پیدا کر کے فیض عام انٹر کالج سے دسویں درجے کی سند حاصل کر لی۔ اور رفتہ رفتہ ۱۹۲۷ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد وہ باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ شعر میں کسی سے اصلاح و مشورہ کی نوبت نہیں آئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جگر مراد آبادی کے شاگرد تھے، لیکن غالباً یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ ملازمت معمولی کلر کی سے شروع کی تھی۔ ایم اے کی سند سے بھی کچھ مادی منفعت نہ ہوئی۔ ادھر ۱۹۲۸ء میں (بیمار ۲۷ سال) شادی ہو گئی اور اپنی ذمہ داریاں بڑھنے لگیں۔ چھ تھے تھے (جا) لڑکے اور دو لڑکیاں) یہ گرانی کا زمانہ اور اتنا کم مشاہرہ پریشان رہنے لگے اور آہستہ آہستہ دماغ کا توازن جگڑنے لگا۔ بات بات پر الجھنا اور زود رنجی ان کا شیوہ ہو گیا۔

بدھ کے دن ۳۰ ستمبر ۱۹۷۰ء دوپہر کے وقت گھر آئے۔ یہاں کوئی خلاف پسند بات پیش آئی، تو جھنجھلا کر باہر چلے گئے۔ پہلے تو کسی نے خیال نہیں کیا، لیکن جب دیر تک واپس نہیں لوٹے، تو سب کو تشویش ہوئی۔ بہت تلاش کے بعد ان کی لاش جامع مسجد (میرٹھ) کے صحن کے کنوئیں سے برآمد ہوئی۔

اگلے دن (یکم اکتوبر کو) چشتیہ قبرستان (نزد عید گاہ) میں دفن ہوئے۔ ۲۹ برس کی عمر پائی۔ بالعموم غزل ہی کہتے تھے۔ کوئی مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ ذیل میں کچھ کلام خلف رسائل سے جمع کر کے دیا جا رہا ہے:-

عشق کا ہو گا یہ چرچا، مجھے معلوم نہ تھا تم بھی ہو جاؤ گے رسوا، مجھے معلوم نہ تھا
مجھ سے پھر جائیگی وہ چشم تو جہ بھی جزاں! یوں بدل جائیگی دنیا، مجھے معلوم نہ تھا
ذوق طلب مرا جزاں کام عجب یہ کر گیا ان کا ہی سامنا ہوا، آج تو میں جدھر گیا

آج بھی بہرِ عرضِ غم میری زباں نہ کھل سکی
 جیسے کہ تیری ذات سے دور کا واسطہ نہ ہو
 آج بھی آکے وہ مرے حال سے بیخبر گیا
 یوں بھی کبھی کبھی ترے پاس سے میں گزر گیا
 اُن رے ترا خیال جو دل سے نہ عمر بھر گیا
 مٹھے بٹھائے آگیا اُن کو مرا خیال کیا
 عشق کو اس سے کیا غرض، ہجر سے کیا صایا
 لمحہ یک نفس بہت، عرصہ ماہ و سال کیا
 جان بھی دی اگر حوس تو نے کیا کمال کیا
 مگر قدم ہیں کہ خود اٹھ رہے ہیں سے حبیب
 نہ جلنے کوں سا عالم ہے ردِ برے حبیب
 کہاں ہم اور کہاں در نہ آرزوے حبیب
 بسی ہوئی ہے مرے پرہیز میں لے حبیب
 پردہ در ا بھی اٹھا تو نہیں
 آپ سے ہم نے، کچھ کہا تو نہیں
 اب کوئی درد آشنا تو نہیں
 زندگی ہے اکوئی سزا تو نہیں
 ہمیں اے زندگی! تجھ پر گماں کچھ اور موتا ہے
 حوس بلفظِ حجاب درمیاں کچھ اور موتا ہے
 اس نے دیکھا تو باندہ کریمانہ مجھے
 لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں کہ فرزانہ مجھے
 یاد جب آئی تری بے اختیار ان مجھے
 اب تو اک دنیا نظر آتی ہے بیگانہ مجھے
 آج بھی بہرِ عرضِ غم میری زباں نہ کھل سکی
 جیسے کہ تیری ذات سے دور کا واسطہ نہ ہو
 آج بھی آکے وہ مرے حال سے بیخبر گیا
 یوں بھی کبھی کبھی ترے پاس سے میں گزر گیا
 اُن رے ترا خیال جو دل سے نہ عمر بھر گیا
 مٹھے بٹھائے آگیا اُن کو مرا خیال کیا
 عشق کو اس سے کیا غرض، ہجر سے کیا صایا
 لمحہ یک نفس بہت، عرصہ ماہ و سال کیا
 جان بھی دی اگر حوس تو نے کیا کمال کیا
 مگر قدم ہیں کہ خود اٹھ رہے ہیں سے حبیب
 نہ جلنے کوں سا عالم ہے ردِ برے حبیب
 کہاں ہم اور کہاں در نہ آرزوے حبیب
 بسی ہوئی ہے مرے پرہیز میں لے حبیب
 پردہ در ا بھی اٹھا تو نہیں
 آپ سے ہم نے، کچھ کہا تو نہیں
 اب کوئی درد آشنا تو نہیں
 زندگی ہے اکوئی سزا تو نہیں
 ہمیں اے زندگی! تجھ پر گماں کچھ اور موتا ہے
 حوس بلفظِ حجاب درمیاں کچھ اور موتا ہے
 اس نے دیکھا تو باندہ کریمانہ مجھے
 لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں کہ فرزانہ مجھے
 یاد جب آئی تری بے اختیار ان مجھے
 اب تو اک دنیا نظر آتی ہے بیگانہ مجھے

ہو گئے دل پہ منکشف، تھے جو رموزِ زندگی
اُتے ہی باخبر ہوئے، بڑھ گئی جتنی بنجودی
عشق تمام گم رہی، حسن تمام سرکشی
سائے جہاں سے ستمی، اُف رہے جنوں آگہی
حسنِ منسودہ میں بھی کچھ پائی نہ حسن کی کمی
اُس رُخ پر طال کی، بڑھ گئی اور دکھی
اپنا ہی سوزِ باطنی، کام نہ جب تک سکا
کم نہ ہوئی کسی طرح دیدہ و دل کی تیرگی
گاہ وہ بیرخی میں بھی ایک اداسے التفات
گاہ وہ بیرخی میں بھی ایک اداسے التفات
اور بھی ہو گئی فزوں، عشق کی بیقراریاں
آج تو اُن کی یاد کا دل پہ اثر نہ پوچھیے
کچھ یہ جبرِ عشق کا کتنا عجیب حکم ہے!
جس کا خیال بھی حزیں! نشترِ جاں سے گم نہیں
یوں پر مہرِ خاشی، لگی ہے عشق میں گر
ہزار شکر ہے کہ ہم نثارِ عشق ہو گئے
نظر اٹھی نہ لبِ بلے بالآخر اُن کی نرم سے
ترے لیے دلِ حزیں! کہیں مگر سکون نہیں
یہ کس منزل پہ آخر آگئی وارفٹ کی اپنی
بتائیں کیا محبت کا اثر! بس یہ سمجھ لیجے
زہے جذبِ کشش دوری بھی اب عینِ حضوری
وہ جب سے واقفِ غم ہو گیا ہے
خوشی سے خوش نہ غم سے ہو یہ غمگین
وہی ہر ایک سے بیگانگی سی
ہمراہ اپنے گردشِ شام و سحر تو ہے
کیسے کہیں کہ عشق کی دولت نہیں رہی
دل میں وہی خلش، وہی دردِ جگر تو ہے

ڈر ہے، گراں نہ ہو کہیں اُس طبعِ ناز پر
 ویسے مرا فسانہ غم مختصر تو ہے
 سراپا درد و غم جب زندگی تھی
 عجب اُس زندگی میں دلکشی تھی
 وہ اُن کا لطف تھا، یا برہمی تھی
 بہر صورت اداے دلبری تھی
 بیاطن گفتگو ہوتی تھی اُن سے
 بظاہر لب پہ مہرِ خاموشی تھی
 جو سچ پوچھو، تو اس جہلِ خود سے
 حزیں! اچھی مری دیوانگی تھی
 یا انھیں بامِ دور پہ تھیں حسن کی ضوفاں
 یا یہی بامِ دور ہیں، جو تیرہ و تار ہو گئے
 یوں تو جہاں میں ہے کسے موت پرانی بس مگر
 آہ وہ خوش نصیب جو ان پر نثار ہو گئے
 بتاؤں تم کو کہ روٹھ جانے پہ مجھ سے تم کیا کرو گے
 کسی کا کیا ذکر خود سے بھی کچھ خفا خفا سے ہا کرو گے
 سائیکاجب غمِ جدائی، کر گیا کوئی نہ ہمنوائی
 مجھے یقین ہے نہ ہو سیکمکا، جو پاس بٹبر ضا کرو گے
 ہزار ہو جائے مجھ سے دوری، رہیگی دل میں تو نا صبوی
 یہ بعد ظاہر ہے قربِ باطن، کھلیکا تم پر بھی کہ ان
 مجھے خیالات کے تم اپنے، بتاؤ کیوں کر جدا کرو گے
 مری نظر سے بھی دور وہ کمری نظر میں پھر کرو گے
 حزیں کو آساں نہیں بھلانا، کرو گے تم ضبطِ یہ تو مانا
 چھینکے دل میں وہ خاہن کر، جو اشکِ غم تم پیا کرو گے

بیدل بیکانیری، شیخ محمد عبداللہ

شیخ مولابخش کے فرزند ارجمند، شیخ محمد عبداللہ جن کا راجستھان کے سربراہ اور وہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا، ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اپنے مولا سے حقیقی سے جا ملے شاعر تو وہ تھے ہی، اور شاعر بھی بزرگ ویدہ، لیکن وہ اس سے بھی زیادہ بحیثیت انسان بہت بلند تھے۔ ان کے تمام ملنے والے ان کی شرافت، نفس دیا امتداری، انسان دوستی، جذبہ خدمتِ خلق کے مداح و معترف ہیں۔ اگر زبانِ خلق، نقارہ خدا کا مقولہ درست ہے، تو یقین ہے کہ خدا اپنے فضل و کرم سے ان کی مغفرت فرمائے گا۔

شیخ محمد عبداللہ جنوری ۱۸۸۸ء میں بیکانیر میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان جیپور اور بیکانیر کی صنعتی روایات کا وارث تھا! یہ لوگ مصوری اور پھول پتی بنانے کا کام کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کام کی مانگ میں انحطاط پیدا ہوا اور ان کی اپنی مالی حالت بھی سقیم سے سقیم تر ہوتی چلی گئی۔ گھر کا محول مرا سر نہ رہی تھا، اس لیے ابتدا میں دینی تعلیم اور عربی فارسی کی پڑھائی نجی طور پر ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں (یکم جنوری ۱۹۰۰ء) باقاعدہ تعلیم کے لیے دوبارہ ہائی اسکول (بیکانیر) میں داخلہ لیا۔ ذہن کی بڑا ترقی کا یہ کرشمہ تھا کہ انھوں نے د

دو درجے ایک ایک سال میں پورے کیے اور ۸-۱۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، تو اسکول بھر میں اول آئے۔ مختلف مضامین میں اول آنے پر انعامات تو ملنا ہی تھے، والی ریاست ہمارا جہ گنگا سنگھ نے اپنی طرف سے سونے کا تمغہ عطا فرمایا۔

گھر کے حالات مزید تعلیم جاری رکھنے کے موافق نہیں تھے اور یہ مجبور تھے کہ کہیں ملازمت کر لیں۔ ان کے ہیڈ ماسٹر جناب کرشن سنگھ تیواری نے جو ان کی ذہانت اور سہولتوں کے قائل تھے، مشورہ دیا کہ تم یہیں اسکول میں پڑھ کر لڑا اور پرائیوٹ طور پر تعلیم بھی جاری رکھو۔ اس پر یہ اپنے اسکول ہی میں پڑھانے پر مقرر ہو گئے اور ساتھ ساتھ امتحانوں کی تیاری کرنے لگے۔ بالآخر ۱۹۱۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی سند ملی۔ وہ ریاست بیکانیر میں پہلے مسلمان گریجویٹ تھے (بلکہ اس زمانے میں یہاں غیر مسلم گریجویٹ بھی صرف دو ہی شخص تھے) ہمارا جہ گنگا سنگھ مرحوم تک خبر پہنچی، تو بہت خوش ہوئے اور اس کا عملی اظہار یوں کیا کہ انھیں ریاست کے چیف کورٹ کا جسٹس مقرر کر دیا۔ آدمی تھے محنتی اور دیانت دار، آقا قادر دان علماء، تو انھیں نے اور بھی تندرہ اور اخلاص سے اپنے فرائض کو سرانجام کیا جیسا کہ چیف جج راے بہادر نہال سنگھ انھیں اپنا دست راست سمجھتے تھے۔

ہمارا جہ نے ان کی کارگزاری دیکھ کر ۱۹۲۳ء میں انھیں اپنی وزارت کا سکریٹری بنا دیا۔ یہاں وہ تقریباً دو سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد یہ جلد جلد ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ اس دوران میں ریاست کا امتحان قانون بھی پاس کر لیا۔ ادھر وزارت میں رد و بدل ہوا، تو جون ۱۹۲۴ء میں یہ منصف مقرر ہو گئے۔ ان کے عدل و انصاف اور سہار دی کی تعریف میں کہ دہ سب رطب اللسان تھے۔ ترقی کر کے ۱۹۳۳ء میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ رپڑی ریاست میں صرف تین اضلاع تھے، جو اس زمانے میں ریاست کے عدلیہ میں بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہیں سے ۲۳ سال بعد ۱۹۵۶ء میں نیشنل پرسکڈوش ہوئے۔

چونکہ خدا نے فراغت نصیب کی تھی اور درود دل کی دولت سے نوازا تھا، اس لیے فاعلاً

کے کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ درگاہ نوگزاپر کا مدرسہ اسلامیہ انھیں کا قائم کردہ ہے، بلکہ اس درگاہ کی عمارت بھی اپنے خرچ پر تعمیر کروائی تھی۔

فارسی کے منتہی تھے۔ اس کے علاوہ اردو انگریزی پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کی قابلیت کے جوہر خاص طور پر ترجمے میں کھلتے تھے۔ ریاست کے متعدد تاریخی مقدمات کے فیصلوں کے اردو اور انگریزی ترجمے ان کی مہارت زبان اور اصطلاحات قانون سے اقیقت کے مہول منت ہیں۔ بنگالہ کے راسنی دفتر خانے کی بعض اہم فارسی دستاویزوں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ شاہجہانی عہد کی مشہور تاریخ بادشاہ نامہ (عبدالحمد لاہوری) کے اس حصے کا ترجمہ جو راجستھان سے متعلق ہے انھیں کے قلم سے ہے۔

ابھی انٹر کا امتحان بھی نہیں دیا تھا کہ ۱۹۱۵ء میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ بیدل تخلص اختیار کیا اور داغ کے شاگرد دریش منشی وحید الدین احمد بنجد دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) سے اصلاح لینے لگے۔ راجستھان کے رہنے والے تھے، لیکن زبان اسی صاف اور شستہ و رفتہ لکھتے تھے کہ استاد کو ان پر فخر تھا۔ جن اصحاب نے بنجد کو دکھا ہے یا ان سے بات چیت کی ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور کسی کو اپنی برابر کا شاعر نہیں سمجھتے تھے ان کا یہ طیفہ مشہور ہوگا۔

ایک دن اپنے استاد بھائی نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی (ف ۱۹۴۵ء) سے جو داغ کے داماد بھی تھے، باتیں کر رہے تھے، کہنے لگے بھائی سائل! اب دلی میں شاعری کا خاتمہ ہی سمجھو۔

اے دے کے ایک تم اور ایک میں، ددی شخص اس کے نام لیوا رہ گئے ہیں؛ ہمارے بعد بس اللہ کا نام ہے۔ اور بھئی، سچ پوچھو، تو تم بھی کیا ہو!

تو خیر، بنجد نے جو سند اپنے اس شاگرد کی زبان اور بیان اور تخیل سے متعلق دی ہے، وہ بیدل کے دیوان "باغ فردوس" کے شروع میں موجود ہے۔ بنجد لکھتے ہیں کہ بیدل نے میری زبان پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ میرے پاس مال دنیا سے اور کچھ تو تھا نہیں، ایک زبان رکھتا تھا، وہ حضرت بیدل کی نذر ہوئی، ان کے بہت سے شعر میرے ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ بھی اپنے استاد کے مداح اور عاشق تھے۔ لکھتے ہیں:

شاعر نہیں ہے حضرت بنخود ساہت میں شہرہ ہے آج جن کا جہاں میں بجائے داغ
 حضرت بنخود کا ہر شاگرد ہے ساغر بکف بنخودی طاری ہوئی بیدل کا دیوان دیکھ کر
 دیوان کا نام "باغ فردوس" تاریخی ہے جس سے ۱۳۵۳ برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اس سے ایک
 سال بعد شائع ہوا تھا (لاہور ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء) اس سے مختلف اصنافِ سخن پر قدرت کا ثبوت
 ملتا ہے۔ ایک ایک صفحے سے حبِ رسول اور اولیائے امت سے عقیدت نمایاں ہے۔ عام
 غزل لکھتے ہوئے بھی اس میں نعت یا منقبت کے شعر بکھنے لگتے ہیں۔ سلامتِ طبع اور نغزِ کلام
 کا خاص جوہر ہیں۔ باغِ فردوس کے علاوہ اور کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ بہت سا کلام
 غیر مطبوعہ رہ گیا۔

وفات سے پہلے پانچ چھ دن تک ملیں یا سہ بیمار رہے۔ اس سے شفایاب تو ہو گئے، لیکن نقا
 بہت بڑھ گئی تھی، جو کبریتی کا تقاضا تھا۔ اسی حالت میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو فجر کے وقت عالم
 جاودانی کا سفر اختیار کیا؛ ۸۲ برس کی عمر پائی۔ جو سرگٹ (بیکانیر) کے قریب کے پرانے
 قبرستان میں دفن ہوئے۔ اولاد میں سات بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ راجیہ سبھا کے رکن جناب
 محمد عثمان عارف ان کے صاحبزادے ہیں۔ وفات کے وقت ستر پوتے پوتیاں، نو اے نوایا
 اور ان کے بچے ان کے سوگواروں میں تھے۔

مختصر انتخابِ کلام ملاحظہ ہو:

لب پر مرے جو نام ہے اس کا رساز کا	موقع ملا ہے خود مجھے دیواں پہ ناز کا
کیا عشق نے بڑھایا ہے رتبہ ایاذ کا	کس منہ سے شکر ہو سکے بندہ نواذ کا
جلوہ بھی پردہ بن گیا موسیٰ کے واسطے	پردہ اٹھا دیا کہیں رائد و نیاذ کا
دم تو وہی ہے دم، جو تری یاد میں کٹے	غم ہے فضول عمرِ قلیل و دراز کا
کعبہ دیکھا نہ کبھی قبلہ ایماں دیکھا	جھک پڑے ہم تو جدھر ابرے جاناں دیکھا
تیر دیکھا نہ ترے تیر کا پیر کاں دیکھا	در پر تیرے کوئی لبیل، کوئی بیجاں دیکھا

جان مضطرب، جگر سوختہ، آنکھیں پر غم
منہر شانِ جمالی و حلالی ہم ہیں
غمِ الفت کا مزہ، اے دلِ ناداں دیکھا
اینا رتبہ بھی کبھی حضرتِ انساں دیکھا
دل بچھ گیا، وہ جوشِ تمنا نہیں رہا
اٹھ کر تمھارے در سے جو کوئی چلا گیا
اک بار اور کہیے، تجھے اختیار ہے
دل ہے مشتاق، کہیں وصل کا ساماں ہوتا
مدہوش ہی ہیں واقفِ اسرارِ معرفت
آبروِ اشکِ ندامت نے بڑھا دی میری
اچھا کبھی ہوتا نہیں بیمارِ محبت
خاکِ لطفِ زندگی ہے جربِ تمنا مٹ گئی
دلِ بتیاب افشا کرنے دے رازِ محبت کو
تھکائے عشق نے دونوں جہاں سے کھویا
ارمان اب کہاں ہیں، تمنا وہ اب کہاں
تھی رگِ زرنہ شرم نے چنے دیے قدم
دلِ مضطرب پہ تو الزام ہے رسوائی کا
دل نہ بیدار کو دینا تھا غمیں، اے بیدار
وہ دیکھا ہے، جو کچھ دکھایا خدا نے
دل دے چکا جب اس بتِ بیدار کو میں
وہ دیکھا ہے، جو کچھ دکھایا خدا نے
دل دے چکا جب اس بتِ بیدار کو میں
اپنی غود کے لیے پیدا کیا مجھے
جب تک نہ آہِ دل سے ہو، اس میں تڑپاں
وہ آنکھ کیا ہے، جس میں تری جستجو نہ ہو
وہ دل ہی کیا ہے، جس میں تری آرزو نہ ہو

یہ رمز حسن و الفت کچھ سمجھ سہا میں نہیں آتی

جو ہے بیگانہ مجھ سے، ہے اسی کی آرزو مجھ کو

بیدل! بتوں سے دل کے بچانے کا حوصلہ ہم بھی سلام کر لیں گے اچھا، جناب کو

دیر و حرم میں شیخ و برہمن لڑا کیے فتنہ گری ہے سادی یہ تیرے حجاب کی

عجب دید تماشہ ہے کہ نظروں میں بیال سب ہو

دم نظارہ حیرت سے بنیں آنکھیں، زباں میری

دل لگی سمجھے تھے، بیدل! ہم کسی کی چاہ کو چھڑیہ تو جان کا آزار ہو کر رہ گئی

مصطفیٰ زیدی (تیغ الہ آبادی)

الہ آباد میں ایک خاصے معروف شیعہ خاندان کے فرد سید نخت حسین سی آئی ڈی انسپکٹر ہوئے ہیں۔ ان کا نام ہماری جنگ آزادی میں یادگار رہیگا۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں تاریخی مقدمہ بغاوت علی برادران، مولانا حسین احمد مدنی، جلالت گوردشنگر آچاریہ (سوامی کرشن تیرتھ) پیر غلام مجتہد سندھی، ڈاکٹر سیف الدین کچلواو مولانا ثناء اللہ کاپنوری پر کراچی میں چلا تھا۔ اس کی فرد جرم یہ تھی کہ ان حضرات نے آل انڈیا خلافت کانفرنس، کراچی (۲۷ تا ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء) میں اپنی تقریروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو فوج کی ملازمت سے الگ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اس مقدمے میں مولانا محمد علی کی تقریروں کی جو اردو تحفہ رپورٹ عدالت میں پیش ہوئی تھی، وہ انھیں سید نخت حسین صاحب نے سرکار میں بھیجی تھی۔ وہ خود بھی پہلے ہی دن عدالت میں بطور گواہ استغاثہ پیش ہوئے تھے (اس مقدمے کے علاوہ اسکی موافق پر مولانا محمد علی کے خلاف کچھ اور مقدمے بھی دائر ہوئے تھے، ان سب میں بھی سرکاری رپورٹ سید نخت حسین ہی تھے) مولانا محمد علی کی بذلہ سخی مشہور ہے۔ ان کا نام سننے پر ان کی رگِ طراقت پھر تک اٹھی۔ انھوں نے نخت حسین صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے

یہ شعر فی البدیہہ اسی دن کہا تھا:-

محمدؐ کا دشمن، علی کا عدد
نہ کہ اپنے کو تختِ حسین تو
سیدِ تختِ حسین شاعر نہیں تھے، لیکن اس کے جواب میں انھوں نے کہا:
علی اور محمدؐ سے کیا تجھ کو کام
تو کمر اپنے گاندھی کی حجت تمام

اس کے سواے ان کا اور ایک مصرع بھی نہیں ملتا۔ ان کا ۱۹۵۰ء میں انتقال ہوا۔

سیدِ تختِ حسین نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے پانچ بیٹے ہوئے: احمد رضا، حمید رضا،
امیر رضا، عابد رضا اور ناصر رضا؛ اور دوسری بیوی سے تین: محبتی حسین، مصطفیٰ حسین
اور ارتضیٰ حسین۔ یہی مصطفیٰ حسین ہمارے شاعر مصطفیٰ زیدی (سابق تیغ الہ آبادی)
ہیں، جن کا انتقال افسوسناک حالات میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء پر کی شب کراچی میں ہوا۔
سید مصطفیٰ حسین ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے تعلیم معقول طریقے پر ہوئی تھی۔
۱۹۴۷ء میں مقامی ماڈرن اسکول سے دسویں درجے کی سند لی۔ شعر گوئی کا شوق اسکول کے
زمانے ہی میں پیدا ہو گیا۔ چنانچہ تیغ تخلص اختیار کیا اور تیغ الہ آبادی کے نام سے مشہور
ہوئے۔ بہت ذہین اور اپنی عمر کی بہ نسبت کہیں زیادہ غور و فکر کے عادی تھے۔ میں نے
ان کے بعض احباب کے پاس ان کی ۱۸-۱۹ برس کی عمر کے کچھ خطوط دیکھے ہیں؛ ان سے
ان کی مختلف مسائلِ حیات سے متعلق آرا کے سیکھے پن اور جدت اور بڑی حد تک نچلگی پر
واقعی حیرت ہوتی ہے۔ وہ جوش ملیح آبادی سے بہت متاثر تھے اور فراق کے دوستوں اور
ہمنشینوں میں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام 'زنجیریں' کے عنوان سے ۱۹۴۷ء میں یعنی اسکول چھوڑنے
کے ایک سال بعد الہ آباد سے شائع ہوا، جب کہ وہ محض ۱۶-۱۷ برس کے تھے۔ یہ قطعاً
پرستش ہے اور اس کے شروع میں فراق کا طویل مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے اس نوخیز

ادیب کی بجد تعریف کی ہے۔ اس میں نوجوان شاعر کی تصویر بھی ہے؛ اس کے نیچے یہ شعر ہے:
 قد فرما تیغ کی اے دختر گنگ و جن
 تیغ، جو اس وقت ہے پیغمبر شعر و سخن

۱۹۴۸ء میں وہ ایک ادبی ماہانہ رسالے اکرن کے ایڈیٹر بن گئے، حال آنکہ ابھی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں انھوں نے ایوننگ کریمین کالج سے انٹر اور ۱۹۵۰ء میں لکڑا یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔

۱۹۵۱ء میں وہ پاکستان چلے گئے، جہاں ان کے دونوں حقیقی بھائی پہلے سے مقیم تھے۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں سندھستان میں ایم اے (انگریزی) کے پہلے سال کا امتحان پاس کر لیا تھا، اب دوسرے سال (آخری) کا گورنمنٹ کالج (پنجاب یونیورسٹی) لاہور سے دیا، اور کامیابی کے بعد چندے اسلامیہ کالج، کراچی اور شاہ ولی محمد سٹی میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان سول سروس کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوئے اور منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مختلف اضلاع میں اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہے۔ ۱۹۶۵ء کی سندھستان اور پاکستان کی فوجی جھڑپ کے بعد وہ لاہور میں ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے تھے۔

دورِ اویابی میں وہ خاصے کامیاب رہے۔ اور اسی زمانے میں اپنی نمایاں خدمات کے لیے متعدد قائد اعظم کے اعزاز سے مفتخر ہوئے۔ لیکن صدر ایوب کے زوال اور دستبرداری کے بعد ان کے متعدد دوسرے دوستوں کی طرح یہ بھی معتبوب ہوئے اور ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ یہ اسی سال ۱۹۷۰ء کے شروع کی بات ہے۔

مصطفیٰ بڑے صحت مند اور وجیہ تشکیل آدمی تھے۔ ان کی طابعی کے زائے کے بھی بعض دہائی افسانے سننے میں آئے ہیں۔ بالآخر انھوں نے ۴ اکتوبر ایک جرم خاتون (دیرانان ہل) سے ریا کوٹ میں شادی کر لی۔ ان سے دو بچے (بیٹا: مجتبیٰ، ولادت ۲۴ اگست ۱۹۵۸ء اور

۵ ان کی وفات کے سال بھر بعد ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو حکومت پاکستان نے ان کا یہ اعزاز ہیتمہ واپس لے لیا۔

بیٹی، عصمت، ولادت جنوری ۱۹۶۰ء ہے۔ جب ملازمت سے الگ ہو گئے، تو اپریل ۱۹۷۰ء میں انھوں نے بیوی بچوں کو برلن بھیج دیا۔ وہ خود بھی وہاں جانے کے لیے پرتول رہے تھے کہ جب تک فضا صاف نہیں ہو جاتی، کہیں ملک کے باہر سکون سے دن گزار لیں۔ اسی سلسلے میں تھوڑے دن سے ایک دوست کے ہاں کراچی میں مقیم تھے، جہاں پر اسرار حالات میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء صبح ان کی لاش ملی۔ ہنزہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ انھوں نے خودکشی کی یا قتل کیے گئے، مقدمہ عدالت میں زیر سماعت۔ انھوں نے ۱۹۵۵ء میں پہلا تخلص تیغ ترک کر دیا اور اس کی جگہ مصطفیٰ لکھنے لگے تھے؛ اب تیغ الہ آبادی کی بجائے ان کی مصطفیٰ زیدی کے نام سے شہرت تھی۔ زنجیریں (۱۹۶۴ء) کے بعد انھوں نے اپنی زندگی میں چار اور محبوبے شائع کیے؛ روشنی (نظمیں) الہ آباد ۱۹۶۹ء؛ شہر آذر (کراچی جنوری ۱۹۵۹ء)؛ موج میری صدف صدف (لاہور اپریل ۱۹۶۰ء)؛ قبائے ساز (لاہور ۱۹۶۷ء)؛ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا دور جدید کے مقبول شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ ابھی عمر ہی کیا تھی؛ مشکل سے ۴۰ سال پورے کیے تھے۔ کوئی دن اور جینا ملتا، تو ترقی کے بہت امکانات تھے؛ لیکن وقت مقررہ کو کون ٹال سکتا ہے، بخیر کلام ملاحظہ ہو!۔

کر بلا

کر بلا! اس تو گہنگار ہوں، لیکن وہ لوگ
جن کو حاصل ہے سعادت تری فرزند کی
جسم سے، روح سے، احساس سے، عاری کیوں ہیں؟
ان کی منما جیہیں، ان کے شکستہ تیور
گردش حسن شب و روز پہ بھاری کیوں ہیں؟
تیری قبروں کے مجاور، ترے منبر کے خطیب
فلس و دنیا و توجہ کے بھکاری کیوں ہیں؟

۱۔ ایک محبوبہ کو کہنے والے کے عنوان سے پہلی برسی پر اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔

روضہ شاہ شہیداں پہ اک انبوہ عظیم
بل ایبر اور کر سلسلہ کے نئے ماڈل کو
اسی خاموش عقیدت سے تکا کرتا ہے
جس کو کہہ دوں، تو کئی لوگ برا مانینگے
غیر تو رمزِ عجم کون و مکاں تک پہنچے
کر بلا! تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے
دل کو تہذیبِ تمنا میں خدا ملتا ہے
سو زنا قوس و نظارہ میں خدا ملتا ہے
بترے دیوانوں کو اے شاہِ دریاے فرات
اپنی بیگانگی ذہن میں کیا ملتا ہے؟

لوگوں کی سلامت بھی ہے، خود دوسری بھی کس کام کی یہ اپنی وسیع النظری بھی
کس طرح خود اپنے کو یقین آئے کہ اسے ہم خاک نشینوں کی ملاقات رہی ہے
کسی تو کام زمانے کے سو گوار آئے تجھے جو پانہ سکے، زلیست کو سنوار کئے
یہ اور بات کہ ساتی سے قرض مل نہ سکی حضورِ حضرتِ پرداں تو باوقار کئے
آخر تمام عمر کی وسعت سما گئی اک لمحہ گزشتہ کی چھوٹی سی بات میں
انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو، تو آؤ مرے گھر کے راستے میں کہیں ہلکشان نہیں ہے
ہونٹوں کے مانتا ہی، آنکھوں کے بام ہیں سر پھوڑنے کو ایک نہیں، سو مقام ہیں
تمہے تو ایک دل کی کلی بھی نہ کھل سکی یہ کلی ہلاکشانِ محبت کے کام ہیں
وہ کیا کرے جو تیری بدولت نہ نہیں سکا اور جس پہ اتفاق سے آنسو حرام ہیں
منعم کا تو خدا بھی امین بت بھی پاسیاں مفلس کے صرف تیغِ علیہ السلام ہیں

Belair اور Chrysler موٹر کاروں کی دو مشہور کمپنیاں (ماڈل)

باقدرو! دیدہ و رو! کفر کا الزام نہ دو
 میرے احاد میں اک پر تو! الہام بھی ہے
 عشقِ خوددار! یہ پندار جنوں چھوڑ بھی دے
 اب تو ان آنکھوں میں کس شے بھی ہیں! پیغام بھی ہے
 برف کے غم اداس سینے پر
 رقص کرتی ہے شعلگی میری
 موت کا راگ چھیڑ کر اے تیغ!
 مسکراتی ہے زندگی میری
 تھپکیاں دیتی ہوئی، منستی ہوئی، گاتی ہوئی
 ہر غم دوراں کو میٹھی نیند میں لاتی ہوئی
 دفعۂ گزریں یہ کس کی انگلیاں، اے ہم نشین!
 میرے ان الجھے ہوئے بالوں کو سلجھاتی ہوئی
 حسنِ خود ہیں کی عشوہ کاری دیکھ
 اپنے دیدار کے عوض اس سے
 ساند و بربط، صراحی و ساغر
 دے کے بہلا دیا کھلونوں سے
 سرود و نغمہ وئے ساز و جام، رہنے دے
 کہ ہر نشاط پہ غم کی نگاہ ہے ساقی!
 یہ بزم وہ ہے، جہاں بے صدا ہے سازِ حیات
 یہاں تو آہ بھی کرنا گناہ ہے ساقی!
 میں عشقِ مکمل کا ہوں پیرو، اے دوست!
 صیدِ مونس اندک و بسیار نہیں
 بس جامِ شراب، اور ان کا دیدار
 میں اور کسی شے کا طلب گار نہیں

اسرار احمد آزاد

اسرار احمد آزاد صاحب رامپور منٹھاراں (ضلع سہارنپور) کے رہنے والے تھے، جہاں وہ اگست
 یا ستمبر ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نور احمد صاحب چوڑے کا کاروبار کرتے تھے، ان کا
 مئی ۱۹۷۶ء ویرہ دونوں میں انتقال ہوا۔ آزاد صاحب نے دسویں درجے تک تعلیم اسلام آباد
 سہارنپور میں پائی تھی۔ چونکہ گھر کے مالی حالات زیادہ سازگار نہیں تھے، اس لیے وہ تعلیم مکمل
 نہ کر سکے۔ لیکن تھے بلا کے محنتی اور ذہین۔ اس لیے ذاتی جدوجہد سے اتنی اچھی استعداد
 پیدا کر لی کہ مشکل سے مشکل انگریزی عبارت کا ترجمہ آسانی سے کر لیتے تھے۔
 آزاد صاحب کی نا اخیال کرناں میں تھی۔ یہ تلاش معاش میں وہاں گئے، تو نا اکی و سالت
 سے پاکستان کے سابق وزیر اعظم صاحبزادہ لیاقت علی خان (ف اکٹوبر ۱۹۵۷ء) کے بچوں کے
 اتالیق مقرر ہو گئے۔ یہاں یہ تین برس رہے۔ یہ واقعہ ہے کہ لیاقت علی خان مرحوم انھیں
 کے صلاح و مشورے کے نتیجے میں سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ آزاد خود مولانا ابوالکلام
 آزاد سے بہت متاثر تھے، اور نظریاتی لحاظ سے کانگریس کے بائیں بازو سے متفق تھے، بعد
 کچھ عرصہ کمیونسٹ پارٹی میں بھی شامل رہے۔

کرنال کے زمانہ قیام ہی میں انھوں نے ایک پرچہ "العزم" شروع کیا تھا، لیکن تین سال بعد مالی مشکلات کے باعث اسے بند کرنا پڑا۔

کرنال سے واپس آئے، تو سہارنپور میں ایک بنک میں ملازمت کر لی۔ لیکن اس میں ان کا دل نہیں لگا۔ چنانچہ وہاں سے دلی چلے آئے۔ یہاں انھیں مختلف اخباروں میں ترجمے کا کام مل گیا۔ ریڈیو نے بھی کچھ سرپرستی کی۔ اس کے بعد مولوی حنظلہ الرحمن مرحوم کی سفارش پر روزنامہ "الحقیقہ" کے سنڈے ایڈیشن کی ترتیب ان کے سپرد ہوئی۔ کوئی تین برس تک وہ اس جگہ کام کرتے رہے (۱۹۴۷ - ۱۹۵۰)۔ اس کے بعد ماہانہ "برہان"، اور "دین و دنیا" میں کام کرنے لگے۔ ان کے لیے وہ اجرت پر ترجمے اور طبع و اضافہ مضامین لکھتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک نیا ذاتی پرچہ "جدوجہد" کے نام سے بھی نکالا تھا، لیکن یہ بھی تین چار سال بعد مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے میکینٹ پارٹی کے پرچے "عوامی دور" (پیلاز ایج) کا اردو حصہ کے ادارہ تحریر میں بھی شاید دو برس تک (۱۹۵۸ - ۱۹۵۹) کام کیا۔

بین الاقوامی سیاسیات اور تعلقات پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ چنانچہ انھوں نے مکتبہ برہان کے لیے جدید سیاسی معلومات کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔ اردو میں اس نوعیت کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی، لہذا انھوں ہاتھ نکل گئی۔ حالات بھی تیزی سے بدل رہے تھے، اس لیے انھیں اس کا نیا ایڈیشن تیار کرنا پڑا۔ انھوں نے اسے از سر نو "جدید بین الاقوامی سیاسیات" کے نام سے مرتب کیا اور یہ تین حصوں میں شائع ہوئی (۱۹۵۶ - ۱۹۵۸)۔ مکتبہ برہان ہی نے ان کی ایک اور کتاب "مارشل ٹیوٹ اور جمہوریہ یوگوسلاویہ"، بھی شائع کی تھی (۱۹۴۶)۔ ان کی ایک کتاب "کشمیر اور اس سے متعلق ہندوستانی موقف کی وضاحت میں" "مسئلہ کشمیر" کے عنوان سے بھی چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی مسلم حکومتیں، سرخ چین کے ہمارے ریڈ سٹار اور چائنا کا ترجمہ، بھی ان کی تصانیف ہیں۔ بچوں کے لیے بھی کچھ کتابیں لکھی

تھیں مثلاً گاندھی جی اور نیتاجی سبھاش بوس کی سوانحیں ہاں مسات تارے، سچ چھوٹا،
دو موٹی، سرخ بچے وغیرہ۔

سیاسیات کے بعد ان کی دلچسپی کا دوسرا موضوع اسلامیات تھا۔ وہ دلی کے قدیم ماسنامے
ادین دنیا میں نہایت باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ ان کی ایک کتاب 'سیرۃ صحابہ' چھپ چکی
ہے؛ یہ ان کی وسعت مطالعہ اور نکتہ آفرینی پر دال ہے۔

۱۹۶۵ء میں وہ کشمیر حکومت کے پرچے اخبار کے مدیر ہو کر سر نیگر چلے گئے۔ وہاں تقریباً تین
بیس کے قیام کے بعد ۱۹۶۸ء میں ڈیرہ دون آئے یہاں انھوں نے اپنا ذاتی مکان تعمیر
کر لیا تھا۔

۲۰ نومبر ۱۹۷۰ء (۱۹ رمضان ۱۳۹۰ھ) بروز جمعہ سحری کے بعد دماغ کی رگ پھٹ جانے
سے انتقال ہوا۔ راجپور روڈ (ڈیرہ دون) کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ساری عمر شادی
نہیں کی۔ اپنے بھتیجے اعجاز احمد (خلف پر فیسرافتخار احمد) کو گودے لیا تھا؛ وہی ان کے
دارت ہوئے۔



ناشاد کا پنوری، سری دھڑ پر شاد نگم

غالب نے ایک مرتبہ کہا تھا:

سو پشت سے ہے پیشہء آبا پہ سگری
کچھ شاعری ذریعہء عزت نہیں مجھے
کم و بیش ہی صورت ناشاد کا پنوری کے ساتھ پیش آئی جن کا پھیلے دنوں انتقال ہو گیا۔ ان
کا خاندان (نگم کا ستھ) دراصل قنوج کا رہنے والا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں
ان کے جدِ اعلیٰ نقل مکان کر کے کا پنور آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہاں انھوں نے
خاصی عیادت پیدا کر لی تھی۔ خاندان میں سب سے پہلے ۱۸۴۶ء میں منشی درگا پر شاد فوج کی
ملازمت میں داخل ہوئے؛ یہ ناشاد کے پردادا منشی کا لکا پر شاد کے والد تھے (دادا کا نام
تلجا پر شاد تھا) اس کے بعد فوجی ملازمت کو یا خاندانی پیشہ بن گئی۔ خود ان کے والد را
صاحب گو کر ن پر شاد رسالدار (کمیشن افسر) تھے (۱۹۲۱ء) دونوں چچا بھی فوج
میں تھے۔ ناشاد کے بڑے بھائی منشی گجادر شاد بھی فوج میں ملازم تھے۔ ناشاد ۸ اپریل
۱۹۰۸ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان دنوں ان کے والد تعینات تھے۔ ابتدائی

تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اس کے بعد محبوب کالج، سکندر آباد دکن، میں داخلہ لیا جہاں
انہوں نے ان کے والد کا تبادلہ ہو گیا تھا؛ دسویں درجے تک یہاں پڑھتے رہے۔ انٹر کا
امتحان نظام کالج، حیدرآباد سے دیا۔ اب یہ کانپور چلے آئے، بی اے کی تعلیم یہیں حاصل
کی۔ اخیر ۱۹۳۱ء میں ایم اے (انگریزی) کی سند آگرہ یونیورسٹی سے لی اور اسی سال
نومبر میں سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ سب سے پہلے گھانم پور تحصیل (ضلع کانپور)
میں نائب تحصیلدار کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ بتدریج ڈپٹی کلکٹری تک ترقی پائی۔
۱۹۶۴ء میں پینشن پر سکدوش ہوئے۔

خاندان کی روایت فوج کی تھی، لیکن فارسی (اور اردو) سے کاسٹھ خاندانوں کا شغف
بھی روایتی ہے۔ ناشاد کے دادا فارسی کے شاعر بھی تھے۔ ناشاد نے گویا شاعری ورثے میں
پائی۔ شروع میں جناب گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری سے مشورہ رہا۔ اپنے وطن کے مشہور
ماہانہ رسالے 'زمانہ' (کانپور) میں نثری مضامین لکھتے رہے؛ اسی دور میں چند فکاہیہ مضامین
بھی قلمبند کیے تھے۔ کلام بھی 'زمانہ' کے علاوہ 'ساقی'، 'آجکل' وغیرہ میں چھپتا رہا۔ اسی زمانے
کا ایک مقطع ہے جس میں جناب فرحت کی استاد کی اعتراف کیا ہے:

فکرِ نشاط آج ہے سحر آفرین

فیضِ فرحت کا یہی اعجاز ہے

مدتوں بعد ملازمت کے دوران میں جناب شام موہن لال جگر بریلوی سے ملاقات ہوئی، تو
ان سے اصلاح لینے لگے۔ اب بہت دن سے فارغ الاصلاح ہو چکے تھے، لیکن آخر تک
استاد کے عاشق زار اور جاں نثار رہے۔

غزل اور رباعی پر زیادہ توجہ رہی۔ پہلا مجموعہ (کیفِ سردی) ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں چھپا
تھا۔ ایک زمانے بعد مزید اضافوں سے اسے 'سردِ سردی' کے عنوان سے شائع کیا۔
(لکھنؤ ۱۹۶۸ء) اس میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ سب کچھ موجود ہے۔ یہ نچتہ ادب بلند تر

مرتبہ کلام ہے! کہیں ابتذال یا عریانی کا شائبہ تک نہیں۔ چھوٹی تحریریں سہل ممتنع شعر کہنا ان کا طرہ امتیاز ہے۔

۴ نومبر کو دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کی ہدایت کی۔ ۳ دسمبر کو معرے میں درگی شکایت کی، تو اسپتال بھیج دیے گئے۔ یہیں ہفتے کے دن ۵ دسمبر ۱۹۷۰ء رات کے ساڑھے گیارہ بجے دل کی حرکت بند ہو جانے سے رحلت کی۔ آخر تک بقائے ہوش و حواس خاندان کے افراد سے باتیں کرتے رہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں:

دل میں اک موجِ رنگِ دبو اٹھی	اور شرحِ عالم ایجاد کیا
ہر نفس پیامِ محبت ہے، ہمنشیں!	آج یہ کس کی یاد آئی ہے
نظر آتے ہیں وہ کچھ مہرباں سے	یہ زندگی نہیں ہے عبادت ہے، ہمیشیں!
دیکھتے ہیں تری نگاہوں کو	گل کس کو ہے اب غمِ رواں سے
بدگمانی کو بھی خدا سمجھے	غم کے ماروں کی زندگی کیا ہے!
بدگمانی سی بدگمانی ہے	کیا کہا میں نے، آپ کیا سمجھے
ہوں، تو میں ہوں بُرا زمانے میں	تم محبت کو مدعا سمجھے
زندگی کٹ گئی خوش و ناخوش	آپ اچھے ہیں؛ خیر! کیا کہیے
حالِ ناشاد پوچھتے کیا ہو	اس کے آگے اب اور کیا کہیے
عشق کی عظمتوں سے ناواقف	دل بھر آتا ہے؛ آہ، کیا کہیے!
میں تو کہتا ہوں، روگ ہے دل کا	کر رہے ہیں ابھی جبین سانی
جانے، کیا آج ہونے والا ہے	اب محقق کہہ دو، ہے محبت کیا؟
جس پہ لاکھوں ستریں صدقے	دل دھڑکنا ہے کیوں خدا جانے
	ایک ایسی بھی غم کی رات ہوئی

کاٹتا ہو جو عمر رو رو کے اس کو کیا دن ہوا کہ رات ہوئی
 چاند تارے بھی اب تو سونے لگے لے غم بھر! کتنی رات ہوئی
 ترے در سے اٹھ تو جاؤں، تو ہی منصفی سے کہ دے
 ہے مری جبین کے قابل، کوئی اور آستانہ
 ایک دل کی کلی نہ کھل پانی پھول لاکھوں کھلے، بہار آئی
 ناشاد کے سوا بھی بہت جاں نثار ہیں کیوں یاد آئی آپ کو، اس خاکسار کی
 جب بات بات پر وہ رہا کے یاد آئیں ناصح! تو ہی بتا دے، کیونکر انھیں بھلاؤں
 ہاں چھوڑ دیں وہ الفت، لیکن یہ ہو سکیگا وہ ہم کو بھول جائیں، ہم یاد بھی نہ آئیں
 ناشاد کیا کہا یہ، کس نے کہا یہ تم سے وہ یاد کر رہے ہیں، کیا خود مان جائیں
 اپنی خبر جو چاہے کوئی کچھ بھی کرے، دل نہ لگائے
 لطف و کرم کی تاب کسے ہے رہنے بھی دوا اب دجھوئی
 سجدے کرتے ہیں رات دن، لیکن بندگی عمر بھر نہیں ہوتی
 تم کسی کے نہیں زمانے میں اک زمانہ مگر تھا راہ ہے
 سب ہے دل آئے کی بات عشق نہ جانے جات گات
 تم سچے، بویں، ہی جھوٹا کون بڑھائے تم سے بات
 عشق کا بھی کیا کھیل ہے پیارے! پیچھے بازی، پہلے مات
 حال نہیں ناشاد کا اچھا اب ہے اس پر بھاری رات
 یہ مانا، ناشاد برا ہے تم نے کوئی ایسا دیکھا؟
 تذکرہ تھا گھر و شہر، ایام کا آپ کیوں تیور بدل کر رہ گئے
 جان کر کون آگ سے کھیلے! جان دے کون عاشقی کر کے!
 دل سے کب تک بات بنائیں ان کا کیا! وہ آئیں، نہ آئیں

ترکِ محبت کر دیں، لیکن اس پر بھی جب وہ یاد آئیں
 ہے بھی کچھ، یا کچھ بھی نہیں ہے یوں ہی کب تک دھوکا کھائیں
 سن کے ناشاد! پیار کی باتیں یاد کیا آ یا، آنکھ بھر آئی
 کہنے کی بات اور ہے، کہنے کو کوئی کچھ کہے سچ تو یہ ہے محسوس بھی رسمِ وفا بھی نہیں
 وہ گئی دل کی دل میں بات یوں ہی گزری جیسا بات کچھ ایسی تھی نہیں، تم نے مگر سستی نہیں
 دین پر اس کی شک نہ کر، ہاتھ ذرا دراز کر دیکھ لو اس سے مانگ کر اس کے یہاں کی نہیں
 وفا پر بھی مری کیا کیا گماں تھے عجب وہ دن تھے، جب تم ہر باں تھے
 یہ تجھ سے کس نے کہا، کچھ بتا تو جس نے کہا پیامبر! وہ یہاں آئینگے، یہاں کب تک؟
 حالِ ناشادان سے کیا کہیے منہ سے نکلی، ہوئی پرانی بات
 حالِ ناشاد سن کے فرمایا یوں بھی ہوتا ہے، کوئی بات نہیں
 یہ مانا حالِ دل اچھا نہیں ہے پشماں آپ ہوں، ایسا نہیں ہے
 انھیں ہر بار ہم یوں دیکھتے ہیں کہ جیسے آج تک دیکھا نہیں ہے
 بہت حیران چاہتا ہے، دیکھنے کو بہت دن سے تمھیں دیکھا نہیں ہے
 نگہِ نازِ سحر گئی سب کچھ اور کہنے کو کچھ کہا بھی نہیں
 لبِ تک آ کر جو رہ گئی ہر بار کہہ نہ پائے ہم ان سے بات وہی
 ناشاد! بترے چہرے کا کیوں رنگ اڑ گیا اے خانماں خراب! کہاں کی ہوا لگی؟



آغا خلس کا شمیری، طفیل احمد

آغا خلس امرتسر کے رہنے والے تھے۔ وہ مدرسی پیشہ تھے۔ سعادت حسن منٹو (فی جنوری ۱۹۵۵ء) نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان سے کچھ پڑھا تھا۔ جب افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کی شہرت ہوئی، تو بمبئی کے مشہور فلمی رسالے "مصور" کے مالک محمد نذیر صاحب نے انہیں اس کی ادارت کی پیشکش کی۔ منٹو نے اس شرط پر اسے قبول کرنے کی اجازت بھی کر دی کہ میرے استاد آغا خلس کو بھی ادارہ تحریر میں شامل کیا جائے۔ اس میں منٹو کی استاد سرتی اور سعادت مندی کا جذبہ ضرور تھا۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ بڑی وجہ یہ تھی کہ منٹو کو اپنی زبان اور بیان پر پورا بھروسہ نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ آغا خلس اگر ادارہ تحریر میں آگئے، تو اس پہلو سے اطمینان رہے گا۔ یہ آزادی سے پہلے کا قصہ ہے۔

تو یہ تھے آغا خلس، زبان و بیان کے ماہر، شاعر اور شعر فہم، صحافی اور ادیب۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا جو مزاج تھا کہ "نہ تالیش کی تمنا، نہ صلے کی پردا" وہ شاید عمر بھر کبھی امرتسر سے باہر قدم نہ رکھتے، لیکن لکھے کو کون مٹا سکتا ہے، یوں وہ امرتسر سے بھٹی پہنچ گئے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس کے بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ منٹو پاکستان سدھارے اور ملک محمد

وہاں جو نبی آدم کی آخری منزل مقصود ہے۔

اب مصوٰر، خلش کی زندگی کی گویا واحد دھچی بن گیا۔ اردو کے پرچوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ نذیر صاحب کے انتقال کے بعد مصوٰر بھی رُوباخطا ہو گیا۔ شہار لمانا بند ہو گئے، چونکہ خلش صاحب دنیا، فلم کے خداؤں کے سامنے سر بسجود نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے پرچہ ان کی سرپرستی سے محروم ہو گیا۔ اس کے باوجود حوصلہ نہیں ہارے۔ کیا کیا مصیبت نہیں اٹھائی انھوں نے اس کے لیے۔ بیوی کے تن پر ڈھنگ کا کپڑا نہیں؛ گھر میں پیٹ بھر کھانے کو آنا نہیں، مالک مکان کے دینے کو کرایے کے دام نہیں؛ لیکن یہ مرد قلندر مصوٰر کے لیے مانگے مانگے سے انتظام کر لیتا اور اسے چھاپ کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا۔

آخر تائیکے پریشان رہنے لگے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پریشانی اب ناقابل برداشت ہو گئی؛ ورنہ پریشان تو وہ سدا کے تھے۔ اس پر انھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ سحری کے بغیر رمضان کے پورے روزے رکھے، کمزوری ہونا ہی چاہیے تھی۔ عید کے دن بیمار ہو گئے۔ صبح اٹھے اور بخار کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے غسل کر لیا۔ یہ گویا سر سام کو دے تھی۔ دوستوں نے بیہوشی کی حالت میں جے جے اسپتال کے خیراتی وارڈ میں پہنچا دیا۔ وہیں ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء رات کے ساڑھے آٹھ بجے جان بحق ہو گئے۔

جس دن مرے ہیں، ان کی بیوی کے پاس ساری جمع جتھالے دے کے ۳۹ روپے تھے۔ دوستوں نے تجنیز تکفین کا انتظام کیا اور اگلے دن ۱۶ دسمبر پہر کو انھیں ناریل باڑی (دہلی) کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

لاولدفوت ہوئے۔ ۷۰ برس کے قریب غریبی۔ جناب نور اللہ زوری (تلمیذ جلیس مانچور) نے تاریخ وفات کہی:

نہ کسی میں آئگی یہ ادا نہ کسی کی ہو گئی یہ ریش
تزی یاد ہم کو ستائگی، نہ شکی دل سے خلش خلش
کوئی پوچھے تجھ سے جو سال غم، تو یہ کہنا اس سچیم
یہ سو سال مرگ دل جوئی! نہ عیسوی میں غم خلش
۱۹۷۰ء

اردو زبان ان کا اور ٹھکانا بچھونا تھی۔ لغات اور محاورات کے مصادر و مآخذ میں مبصرانہ ہمارے تھے۔ زبان میں وہ کوئی بدعت بلکہ جدت تک بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے اور اس معاملے میں ہر کسی سے الجھنے کو تیار رہتے تھے۔ معلومات اتنی وسیع اور معتبر تھیں کہ وہ کسی پر اعتراض کرنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ اسی لیے شاید ان کے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع نہیں تھا۔ جنازے کے ساتھ مٹھی بھر آدمی تھے، ۲۵-۳۰ سے زیادہ کسی صورت میں نہیں ہونگے۔

نمونہ کلام میں چند شعر ملاحظہ ہوں:

ان کو کیا نہ وعدہ فردا نے شرمسار	رکھا کہیں کا بھی نہ ہیں اعتبار نے
ہم کو منانا پڑ گئی اب میکدے کی خیر	چپکے سے شیخ حی جو لگے ہیں پدھارنے
کافر دل ہے سلمان، بڑی مشکل ہے	تنگری میں بھی ہے ایمان، بڑی مشکل ہے
ڈر فقط یہ ہے کہ مر جائے نہ اپنا پانی	راہ میں پڑتی ہے ڈھلوان، بڑی مشکل ہے
سو گئی سایہ دلوار میں قسمت میری	دہرہ بیدار ہے دربان، بڑی مشکل ہے
جان نثار دل کا بدلہ گروہ ہے، تو جان نجان	جان سے جانا مری جان، بڑی مشکل ہے
شوقِ برباد ہے، فریاد و تمنا مردہ	بزمِ دل ہو گئی ویران، بڑی مشکل ہے
موت ہے لذتِ ابدا طلبی پر طاری	مشکلیں ہو گئیں آسان، بڑی مشکل ہے
سخت جانی کی بندھی وعدہ فردا سے ہوا	پر خطا ہو گئے اوسان، بڑی مشکل ہے
ہم نے مانا ہے پریشانی خاطر کا سبب	دلف خود بھی ہے پریشان، بڑی مشکل ہے

آدمیت کی علامت ہے خلش البتہ

آدمی کون ہے، پہچان، بڑی مشکل ہے

پسند آیا ہے دل میرا، تو اپنے پاس رہنے دو
مجھے ساری خدائی گڑبڑا کہتی ہے کہنے دو
جگر کا سوز، دل کا داغ، دو متھے ہیں نفی کے
محبت کی سجاوٹ کو مجھے کافی ہیں کہنے دو

خدا رکھے، اکیلے ہو، اکیلے تم ہزاروں میں ہزاروں دکھ اکیلی جان پر مجھ کو بھی پہنچے
مجھے اجر ہے ہوئے دل کی زمیں سیر کرنا ہے گھڑی بھر کے لیے آنکھوں کے دیباؤں کو پہنچے

اس شرم ہے بیشک مضافِ جامعہ ہستی
خلش کی آدمیت نے بھی کپڑے ہیں یہ پہنچے



دیبا بریلوی: نارائن داس ٹنڈن

۱۹۰۱ء میں بریلی (محلہ بہاری پور) پیدا ہوئے۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کا خاندان تجارت پیشہ تھا، کپڑے کی آرٹھت کا کاروبار تھا، گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ جب ۱۹۲۴ء میں ان کے والد لالہ بہاری سرن ٹنڈن (کھتری) کا انتقال ہوا، تو نہ صرف کاروبار کا بلکہ پورے خاندان کی دیکھ بھال کا بار بھی ان کے کندھوں پر آ پڑا۔ انھوں نے اسے مردانہ وار اٹھایا، کام کو ترقی دی اور اس میں بہت کامیاب رہے۔ خوب دولت پیدا کی، جس سے ان کا شہر کے معزز اور باثر لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔

انھوں نے پرانے طرز کی اردو فارسی کی تعلیم پائی تھی۔ ہنوز بڈل کے درجوں میں پڑھتے تھے کہ اپنے استاد منشی رگھبیر دیال کے اردو فارسی کے دلاویز طریقہ تعلیم اور شعر خوانی سے متاثر ہو کر ۱۹۱۵ء میں شعر کہنے لگے۔ بہت دن تک کسی کو اس کا علم نہیں ہوا۔ دو سال بعد جب منشی رگھبیر دیال کو اس کا پتہ چل گیا، تو انھوں نے مشورہ دیا کہ اپنے کلام پر پاسٹر بلدیو شاد سوزن سے اصلاح لیا کرو۔ سوزن مرحوم قوم کے کاٹھ، بڑے پختہ منق اور زرد گو شاعر تھے۔ عین محفلِ مشاعرہ میں بیٹھے بیٹھے پوری غزل کہہ لیتے تھے۔ ابتدا میں مولانا حسن رضا خان

حسن بریلوی تلمیذ داغ (ف اکتوبر ۱۹۰۸ء) سے کچھ استفادہ کیا تھا، لیکن باقاعدہ اصلاح منشی رام بہادر لال جو یا آنولی (ف ۱۹۲۸ء) سے ملی۔ بریلی کے بیشتر سبند و شاعر سوزن کے شاگرد ہیں۔ عمر کے آخری ایام میں داغ کا تو اذن بگومگانے سے یونہی بازاروں میں گھوما پھرا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ دیانے سوزن سے استفادے کا اعتراف ایک قطعے میں بھی کیا ہے:

کچھ تو عرفانِ نغزل، کچھ شعورِ فن کا فیض
طبع کی کچھ جدتیں، کچھ دانشِ روشن کا فیض
اب حدِ احساس میں ہے منزلِ شعر و سخن
دہرِ فکر دیا ہے حضرت سوزن کا فیض

استاد نے ۱۹۳۵ء میں فارغ الاصلاح کر دیا تھا، بلکہ اس کے بعد اپنے مبتدی تلامذہ کو بھی اس سے مشورہ کرنے کی ہدایت فرماتے۔ دیا مرحوم عام طور پر مشاعروں میں نہیں جاتے تھے ایک تو گروہِ ہندی سے نفرت تھی، اسی پر ہر کہ و مہ کو جو داد دی جاتی ہے، اس سے بہت منغص ہوتے تھے۔ ہاں، خاص حساب کی محفل میں خوب چمکتے تھے۔ طوعاً و کرہاً کبھی مشاعرے میں جاتے، تو بڑے وقار سے ہلکے ترنم میں پڑھتے، یوں معلوم ہوتا تھا، گویا خود اپنے کلام کی کیفیت میں محو ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی کہتے تھے۔ دیا تخلص ایسا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں جگہ آسانی سے استعمال ہو سکتا ہے۔

پرانی وضع کی تعلیم اور سادہ کی تربیت کے زیر اثر غزل سے مزا دلانا ہی چاہیے تھی، اس کے علاوہ انھوں نے آزاد نظمیں بھی کہیں اور مشاعروں میں سنائیں۔ انتخابِ کلام ”شام بہاراں“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (نکھنڈ ۱۹۶۷ء)، اس میں غزلیات، نظمیں، قطعات سبھی کچھ ہے۔ ہندی کلام غالباً شائع نہیں ہوا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۷ء کو بریلی میں انتقال ہوا۔ فشار دم (بلڈ پریشر) کے پرانے مریض تھے، لیکن موت کا

غوری سبب فالج ہوا ۔

ان کے دم قدم سے بریلی میں اردو اور شعر گوئی کا چرچا تھا۔ زیادہ شاگرد بنانے کے قابل نہیں تھے، اس میں اہلیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ جناب گو پیشو زرائے ہمدان وکیل بریلی، ہمدان تخلص ان کے خاص شاگردوں میں سے ہیں ۔

اب نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں، جو ان کے مجموعہ "شام بہاراں" سے ماخوذ ہیں؛
 اک تماشا بن گیا میرا سکون مجھ پہ جب رازِ دل مضطر کھلا
 زندہ میخانہ ہو، یا شیخِ حرم ہے درِ رحمت، دیا سب پر کھلا
 وعظ کعبے میں، گھر میں مینوشی جس کو دیکھو، وہ پارِ سنا نکلا
 اپنے شکووں پہ ہے دیا، نام درو بھی دل کا آسرا نکلا
 دلیلِ زندگی سہمت، دیا! ہے نہیں دنیا میں کوئی ناتواں کا
 جن کی پرداز میں پنہاں ہے فریضہ ایسے گستاخ غباروں سے مجھے کیا
 کیف بہار کیا ہے، مذاق بہار کیا ہر اک ادا پسند سہی، اعتبار کیا
 یہ ہے آج کل اہل دنیا کا ایساں، زباں بیچ ڈالی، دہن بیچ ڈالے

بہاروں نے بیچا ہے ناز بہاراں گلوں نے حسیں پر ہن بیچ ڈالے
 ترا شکر یہ، انقلابِ زمانہ! نئی بندگی ہے، نیا آستانہ
 نہ پہلی سی باتیں، نہ پہلا زمانہ سنائیں، تو کس کو سنائیں فسانہ
 ترکِ نئے کی بات بجا ترکِ مے آسان نہیں
 اس کو غم، اس کو تسکین جلوؤں کا ایساں نہیں
 دل میں ہیں ان کے جلوے ہوتا اطمینان نہیں
 اب نہ وعدہ ہے، نہ کچھ پیمان ہے شامِ غم بھی بے سرو سامان ہے
 عشق نے کیا کیا عطا کی نعمتیں درد ہے غم ہے، ترا ارمان ہے

سوچ کر کہیے کہ مشکل ہے عمل بات کہہ دینا بہت آسان ہے
 کعبہ ہے، تہکدہ ہے، نقشِ قدم کسی کا معراجِ زندگی ہے سجدوں کی انجمن میں
 میں تو دیوانہ ہوں، ویرانہ ہے میری حُبّت جن میں رہتی ہیں بہاریں وہ جہاں کیسے
 دنیا کی آرزو، کبھی عقبنے کی جستجو بزمِ غمِ حیات بھی تہنہ نہ رہیگی
 وعدہ کی بات چھوڑیے، وعدہ سکون نہیں وہ دن زہے نصیب، تمنا نہ رہیگی
 غم نے عطا کیا، دیا! احساں زندگی اک دردِ لادوا کی دوا آج ہوئی ہے
 تمہارے درد سے کیفِ دوام ملتا ہے ہر ایک درد نہیں دردِ جاوداں کی طرح
 کبھی گلوں کا فسانہ، کبھی بہاؤ کی بات نفس میں زندگی گزری ہے اُتار کی طرح
 رہ حیات میں تیرا کرم، غمِ منزل! ہمیشہ ساتھ رہا میرے پاس کی طرح
 بہت اکتا گیا دیر و حرم سے کسی کا شگِ در ہے، اور میں ہوں
 عزیزوں نے دیا کچھ اور کا ندھا بہت لمبا سفر ہے، اور میں ہوں
 مسکرا کر یہ کہا: آپ کو دیکھا ہے کبھی نامِ حبس میں نے بتایا، تو بُرا مان گئے
 فخرِ صدنا ز تھقی خاموش تمنا میری حالِ دل ان کو سنایا، تو بُرا مان گئے
 کتنے دیوانے ہیں ہم، سید اکہاں کا سر ہے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں اس کو، جو ہمارے گھر ہے

روا ہے ادھر شمع سوزاں، بذامِ ادھر پروانے ہیں
 یہ محفل ہے دیوانوں کی، اس راز کو کوئی کیا جانے
 چشمِ نمناک! کہاں ہیں وہ لہو کے آئینے؟ رنگ بھرتے تھے جو برسات کے آئینے میں
 کچھ پتا چل نہ سکا، حدِ نظر تک جس کا اس کو دیکھا ہے خیالات کے آئینے میں
 بہارِ گل میں نہ رنگ و بو ہے بہاریں ہے شعورِ زندگی جتنا خلوص خاویں ہے
 یہی ہے دادِ بخشش! زرا سنی مجبوری زباں کی بات ابھی دل کے اختیاس ہے

یہ بہاریں بھلی تھیں سے ہیں خزاں بھلی تجھ سے

ہم بہر عیش، بہر غم تیرے داماں میں رہے

فکر بہارِ خونِ نشین، وطن کا غم
دہ زنگیں تبسم، وہ حسنِ تغافل
دنیا کی ہر بہار ہمارے چین میں ہے
مرے غم کو تو نے کہاں سے صدی
مری زندگی ہے، مری نامرادی
کسی نے کسی کو کہا فی سادی
وہ ہونگے جنہیں جستوے سکوں ہے
ہے اتنی سی تعبیرِ خوابِ دیا کی



باسط او حبینی، نیاز محمد خان

اوجین کے ایک جاگیردار خاندان کے چشم و چراغ تھے، ۲۲ فروری ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ گھر میں خدا کا دیامسب کچھ تھا، لیکن ان کے والد غلام محمد خان (دف ۱۹۶۸ء نے، نہ معلوم کس تریگ میں اپنی ساری جاداد و عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں میں تقسیم کر دی، حد یہ کہ اپنے پاس بسراوقات تک کے لیے کچھ بھی نہیں رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ باسط صاحب کی ابتدائی عمر بڑی تنگی ترشی میں گزری، اور اسی باعث تعلیم بھی نامکمل رہ گئی، مشکل آٹھویں درجے تک پڑھ سکے۔ یہ کمی کسی حد تک انھوں نے بعد کو ذاتی مطالعے سے پورا کرنے کی کوشش کی، اور یوں اردو اور ہندی دونوں پر پوری طرح حاوی ہو گئے تھے۔

چونکہ ان کے والد غلام محمد خان صاحب نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تحریک میں ہمیشہ قوم پر دور رویہ اختیار کیا تھا، باسط بھی نوجوانی سے سیاست میں حصہ لینے لگے۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے اچھوتوں کو برابر کے حقوق دلانے کی ہم چلائی، تو باسط نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس میں انھیں خود اپنے خاندان کے اکثر افراد، اور خاص کر مسلم لیگ کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے کسی کی پر دانہ کی اور جواب میں کچھ دیا:

وہ ہو کعبہ یا کہ مندر، تو غرض نہ رکھ کسی سے
تھے آدمی بنادے، وہ حرم قبول کر لے

کانگریسی خیالات کا ٹوٹید ہونے کی وجہ سے، نہ صرف مخالفت کسی طرح کم نہ ہوئی، بلکہ اس میں تدریج اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر انھیں ترک وطن کرنا پڑا۔ اب انھوں نے بمبئی کی راہ لی۔ یہاں انھوں نے ۱۹۲۵ء میں 'ناخدا' نام کا ایک مہفتہ وار پرچہ جاری کیا۔ تین برس بعد ۱۹۲۸ء میں بعض احباب کی دعوت پر بھوپال پہنچے۔ وہ مختلف اوقات میں بھوپال کے کئی رسائل و جرائد مثلاً مہفتہ وار پکار، روزنامہ ندیم، مہفتہ وار اُجالا (ہندی) نیا قدم (ہندی) سے بحیثیت نائب مدیر اور مترجم وابستہ رہے۔ اپنے دورانِ قیام میں وہ بھوپال کے سماجی اور تعلیمی حلقوں میں بہت سرگرم تھے۔ خاصیتِ نکتہ مدھیہ پر دیش کانگریس کمیٹی کے مرکزی دفتر میں بھی ملازم رہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انھیں سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حالات بدستور ناموافق تھے؛ ہر نیا دن اپنے ساتھ نئی مشکلات لاتا۔ لیکن اس سے ان کی پیشانی پر کبھی بل نہیں آیا۔ انھوں نے اول روز جو راہ اختیار کر لی تھی، استقلال اور انجام سے بے پروا ہو کر اس پر گامزن رہے۔ ان کا آخری زمانے کا ایک شعر ہے:

یہ بات دوسری ہے کہ کچھ تھک گئے ہیں ہم
لیکن ہمارے جو صلے منزل کے پاس ہیں

ان کی مستعدی اور جذبہ خدمتِ خلق کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ایک محنت مدھیہ پر دیش کی حکومت دفاتر کی زبان ہندی کر دی، اور اردو دان ملازم اس سے بہت کرا ہوئے کہ اب کیا ہوگا، تو باسطِ صاحب ان کے آڑے آئے۔ انھوں نے ہندی پڑھانے کو ایک شبینہ اسکول جاری کر دیا، نصاب کے لیے خود ایک کتاب آسان ہندی "لکھ کر چھاپا۔ اور یوں دن رات کی محنت سے مختصر مدت میں سرکاری ملازموں کو (اور غیر ملازموں کو بھی)

اتنی ہندی سکھا دی، جس سے وہ اپنا منصبی کام منہدی میں سر انجام دینے کے قابل ہو گئے۔
اردو کے فروغ کے لیے انھوں نے بھوپال میں بعض احباب کے تعاون سے ایک "بزم سخن"
بھی قائم کی تھی۔ چین اور پاکستان کے ساتھ لڑائی کے زمانے میں اس بزم نے کل ہند مشاعر
منعقد کیے، اور ان سے جو آمدنی ہوئی، وہ ملک کے دفاعی چنڈے کی نذر کر دی۔

لبے عرصے تک مسلسل کثرت کا راور کافی آمدنی کے فقدان اور پریشان حالی نے رفتہ رفتہ ان
کی تندرستی کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں اور تپتق نے آدب و چارہ۔ اب یہ مرض لا علاج نہیں رہا۔
لیکن ڈھنگ کے علاج کے لیے بھی تو روپیہ درکار ہے؛ اور یہی ان کے پاس تھا نہیں سب
سے پہلے اس کا ہلکا سا حملہ ان کے قیام بمبئی کے زمانے میں ہوا تھا۔ اس پر دوستوں نے انھیں
"ٹائما میموریل" اسپتال میں داخل کر دیا۔ یہاں سے وہ لظاہر اچھے ہو کر گھر آ گئے؛ لیکن واقع
میں روگ جڑ سے نہیں گیا تھا۔ بھوپال میں دن رات کی جفا کشانہ زندگی سے وہ دبے ہوئے
اثبات پھر اُبھر آئے۔ پہلے بھوپال کے اسپتال میں علاج ہوتا رہا۔ جب کچھ افاقہ ہوا، تو
یہاں سے اپنے وطن اور صہین کے اسپتال میں منتقل ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی حالت روز بروز
بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اسی میں ۱۴ دسمبر ۱۹۷۷ء صبح نو بجے اپنے مکان پر انتقال ہو گیا۔
اسی دن عصر کے بعد عید گاہ قبرستان میں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے قریب دفن
ہوئے۔ اولاد جسمانی میں ایک لڑکا (اعجاز شمس) اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔

سیاست کی طرح شعر گوئی کا شوق بھی کم عمری میں پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں عبد الرحیم
حسرت قریشی (ف ۱۹۶۰) کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے۔ اور پھر خود بذور بازو وہ مقام پیدا
کر لیا کہ آج بھوپال اور مالوے میں ان کے بیسیوں صاحب دیوان شاگرد موجود ہیں۔ افسوس
ان کا اپنا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ مدت ہوئی، ان کے شاگرد صہبا قریشی صاحب نے
ان کے سوشل ایک کتابچے میں شائع کیے تھے (بھوپال ۱۹۶۸ء) دیوان "نقشِ آرزو" کے
عنوان سے مرتب موجود ہے۔ منہدی میں بھی ایک کتاب "جیون رنجھا" (اپنے حالات ہیں)

غیر مطبوعہ رہ گئی۔ اس کے علاوہ بہت کلام مختلف رسائل میں بھی منشر حالات میں پڑا ہے۔
موت کے طور پر چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

محبت کو زمانہ عین راحت جب سمجھتا ہے	محبت میں مری حالت اکیلی ابدی کیوں ہوا
کاشانہ حیات کی تار کیوں کا حل	تاروں سے پوچھتے ہیں، کبھی چاندنی سے ہم
زندہ دلی کسی کی جفاؤں نے چھین لی	اب اہتمام عرض تمنا نہیں رہا
میری بدبختی کے باعث غرق کشتی ہو گئی	کچھ نہیں طغیانی امواج سے شکوہ مجھے
دارنگی شوق نے بنجو و بنا دیا	ہم اتنی از منزل جاناں نہ کر سکے
ذوق سحر و عشق کا اللہ دے احترام!	سر کو اٹھا سکے نہ ترے آتاں سے ہم
عشق کے سوز و ساز سے قلب کو آشنا تو کر	اب بھی وہی ہیں شوخیاں حسن کے التفات میں
اکتاب مال غنم کے لیے	زندگی ہے، مگر بہت کم ہے
انتہائے وفا شعاری بھی	اک دلیل فریب پیہم ہے
یہ سجدہ عارفانہ بڑے کام کے ہیں، لیکن	وہی سجدہ بیخفا ہے، جو صنم قبول کر لے
محفل سے لاکھ دور بھی دل کے پاس ہیں	طوفاں بدوش ہیں بھی تو ساحل کے پاس ہیں
یہ بات دوسری ہے کہ کچھ تھک گئے ہیں ہم	لیکن ہمارے حوصلے، منزل کے پاس ہیں
بیمارِ غم کو جامِ خوشی بھی عطا کیا	ایسے کمال بھی مرے قاتل کے پاس ہیں
شعروادب کی شمع جلائی ہے اس لیے	پروانہ ادب تری محفل کے پاس ہیں

غم بھی مجھے ملا ہے، خوشی بھی ملی مجھے
باسطایہ دوخزانے مرے دل کے پاس ہیں



شاعل جیپوری احترام الدین احمد عثمانی

ان کا سلسلہ نسب ۳۵ واسطوں سے حضرت عثمان غلیفہ سوم سے ملتا ہے۔ خاندان کا مسقط الرأس گازرون من مضافات شیراز تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ مولوی درویش محمد مفتی بدایوں تھے، جہاں سے ان کے ایک بیٹے مولوی امین الدین ۱۱۶۴ھ میں قاضی مقرر ہو کر نازول (پنجاب) چلے آئے۔ اس طرح خاندان کی ایک شاخ نازول میں بس گئی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دنیا دگرگوں ہو گئی تھی۔ کئی اور شرفا کی طرح شاعل کے تایا مولوی محمد عثمان تسلیم (خلف قاضی حبیب الدین) کو بھی تلاش روزگار میں وطن سے کلنا پڑا۔ تسلیم اچھے عالم اور اردو فارسی کے بلند پایہ شاعر اور شاعر نگار تھے۔ ان کا کلام مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ بہت ہے۔ منجملہ ان کے مشہور حدیقۃ المذہب بھی ہے، جو انھوں نے مدرسہ حلی کے جواب میں لکھی تھی؛ یہ چھپ چکی ہے (الوردہ ۳۰۵ھ) انھوں نے کلام پر اصلاح اپنے ماں مولانا رشید الدین فاروقی المتخلص بہ منظر و فائز (ف ۱۸۸۶ء) سے لی تھی۔ فائز پہلے سے اور شل کالج جیپور میں مدرسہ اول ہو کر چلے گئے تھے۔ تسلیم بھی ۱۸۵۸ء میں یہاں کے مدرسہ تعظیمیہ میں مدرسہ اول ہو کر آئے اور پھر مدت العمر گویا جیپور کے ہو کر رہ گئے۔

کچھ دن اس مدرسے میں کام کیا تھا کہ ریاست کے مفتی ہو گئے۔ ان کا انتقال اپنے وطن مارنول میں ۱۲۲ اپریل ۱۸۸۴ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۳۰۱ھ) کو ۲۵ سال کی عمر میں ہوا۔ وہ اپنے خاندانی قبرستان میں آسودہ خواب ابدی ہیں۔

شہید کے ایک چھوٹے بھائی محمد احتشام الدین تھے۔ یہ بھی شاعر تھے، شوکت تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے ریاست جیپور کے محکمہ پولیس میں ملازمت کی اور ترقی کے مدارج طے کر کے کورٹ انسپٹر مقرر ہو گئے؛ اس زمانے میں پوری ریاست میں صرف ایک ہی کورٹ انسپٹر ہوتا تھا۔ ان کا ۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو جیپور میں انتقال ہوا؛ وہیں گھاٹ دروازہ کے باہر کے قبرستان میں دفن ہیں۔ ان کی ایک کتاب سلسلۃ المذہب طبع ہو چکی ہے۔

شاغل صاحب انھیں مولوی محمد احتشام الدین کے صاحبزادے تھے۔ مفتی کے دن ۴ دسمبر ۱۸۶۹ء (۲۸ جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ) کو جیپور میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں مہنتی تھے اور یہ اپنے خاندان کے مختلف بزرگوں سے پڑھی تھی؛ کچھ عربی بھی جانتے تھے۔ والد کی حیات میں انھیں کبھی کوئی کام کرنے کی فکر نہیں ہوئی جب ان کا سایہ سر سے اٹھ گیا (۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء) تو اب یہ چونکے۔ خوش قسمتی سے والد کی ملازمت آڑے آئی اور یہ کو تو ال مقرر ہو گئے۔

۱ جنوری ۱۹۱۷ء ملازمت کا پورا دور پولیس کے محکمے ہی میں گزرا، اور یہیں سے آخری مرتبہ ۱۹۵۱ء میں نیشنل پریسیکوشن ہوئے۔ اس کے بعد کوئی دو برس تک مسلم ہائی اسکول میں اردو فارسی کے مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ شدید اور طویل علالت کے باعث یہاں سے فارغ ہوئے تو پھر کوئی کام نہیں کیا۔ خدا کے فضل سے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ایک زمانے سے قبض کی شکایت تھی۔ جاڑوں میں نزلہ بھی دائمی فریق تھا۔ اب کے ان دنوں امراض نے شدت اختیار کر لی اور اسی میں ۸ جنوری ۱۹۷۱ء صبح سات بجے دارفانی کو خیر باد کہا۔ بیڑن گھاٹ دروازہ (جیپور) کے قبرستان میں آخری خواب گاہ نصیب ہوئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

اولادِ جسمانی میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار ہیں۔ بڑے ابو الفضل محمود الدین عثمانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (شعبہ سیاسیات) میں ملازم ہیں اور چھوٹے ڈاکٹر ابو فیض اسلام آباد عثمانی گورنمنٹ کالج، ٹونک میں اردو کے مدرس۔

گھر بھر کا ماحول علم و فضل اور شعر و شاعری کا تھا، چنانچہ یہ کبھی چھوٹی سی عمر میں شعر کہنے لگے۔ اس میں اولاً چند دن اپنے رشتے کے بڑے بھائی اسد الدین احمد نسیم (ف ۱۳۲۳ھ) سے اصلاح لی اور پھر انھیں کے کہنے پر میرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی (ف اکتوبر ۱۹۳۳ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ مائل خود امراؤ میرزا انور کی وفات (۱۳۰۲ھ) کے بعد شاغلِ صاحب کے تالیفات تسلیم سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ شاغل تخلص رکھنے کا باعث یہ ہوا کہ ایک تو یہ استاد کے تخلص مائل کا محققانہ تھا، دوسرے اس سے ان کے آغازِ شاعری کا سال بڑا ہوتا ہے یعنی ۱۳۳۱ھ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ شاغل نے شاعری پر کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں کی۔ محض تغنِ طبع سے کبھی کبھار لیتے تھے اور اسے کبھی محفوظ رکھنے کا التزام نہیں تھا۔ وہ شرب بھی پیتے تھے۔ ان کی متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں بعض محکمہ پوسٹ کے انتظام اور قاعدے قانون سے متعلق ہیں۔ زیادہ اہم دو علمی کتابیں تذکرہ شعرائے جیپور (دلی ۱۹۵۸ء) اور صحیفہ خوشنویسیاں ہیں (دلی ۱۹۶۳ء)؛ یہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ وہ خود بھی بہت اچھے خوش نویس تھے، اگلی پانچ سال (۱۹۵۰ء) اپنے دیوان کا پہلا حصہ شائع کیا تھا۔ اس کی کتابت بھی انھوں نے خود کی تھی۔ ان کی تحریر ایسی عمدہ اور روشن اور خوشخط ہوتی تھی، جیسے موتی پروئے ہوں۔ بہت کچھ غیر مطلوبہ بھی رہ گیا۔ ان کے مرنے سے ایک شریف انسان اور اردو کا ایک شیدائی ہم سے جدا ہو گیا۔

نمونہ کلام میں کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

دل اختیار کا نہ جگر اختیار کا
اب دیکھیں حشر کیا ہو شب انتظار کا
دونوں ہی وقت سخت ہیں میخوار کے لیے
آنا بہار کا ہو کہ جانا بہار کا
شاغل ہے، اور شغل ہے خوشگوار ہے
اللہ رے، فیض ساقی فضل بہار کا
کیوں ڈریں، اس کے بعد کیا ہو گا
اب ہی کیا کم ہے، جو سوا ہو گا
پوچھتے کیا ہو، حال شاغل کا
میکدے میں کہیں پڑا ہو گا
نہ وہ آئے نہ موت آئی، نہ صبر آیا نہ دل ٹھہرا
شبِ فرقت نہ کام آیا مرے آہ و کا کرنا
بہی آسان تھا، زاہد اکہ شیخ وقت بن بیٹھے
مگر انسان بنا پیر و مرشد سخت مشکل ہے
ہم پر بھی کبھی ساقی کوثر کا حرم تھا
اپنا بھی کبھی شیشہء دل سانغِ حرم تھا
اب کون ہے، دیران ہے دنیا کے محبت
پر دانے کی اک ذات تھی، یا شمع کا دم تھا
اس کی نیکی ناز کا، اللہ رے تصرف!
پڑتے ہی سراخانہء دل رشکِ حرم تھا
ہاتھ میں جامِ سب و دوش پہ آنکھیں مخمور
کھبہ ہو، کلیسا ہو کہ بتخانہ ہو، شاغل! یا
دینا دیں سے دور، صواب خطا سے دور
کعبہ میں، کلیا میں، اے ڈھونڈ کے آخر
کعبہ بھی ہے کیا چیز، شکایت کی کوئی بات
وہ اگلا سا، ہمدانہ کہاں
خونکوں قفس سے، ٹھکانہ کہاں
آہیں اثر کریں، نہ دغائیں اثر کریں
یہاں کے سوا آب و دانہ کہاں
کیا کہا اپنے، پھر تو کہو اک بار نہیں
یارب! جہانِ عشق میں کیوں نکر اثر کریں!
تاعش بریں حسن بشر دیکھ رہے ہیں
ہم وفا دار نہیں، تم تو جفا کار نہیں؟
پیر مغال کے ساتھ، نہ شیخ زماں کے ساتھ
ہم وسعتِ دامن نظر دیکھ رہے ہیں
اپنا تو کارواں ہے، غم کارواں کے ساتھ

قدر ہوتی نہیں ہے ناموں کی بلکہ ہوتی ہے نیک کاموں کی
عاشقی ہو کہ شعر گوئی ہو کس کو فرصت ہے ایسے کاموں کی
قوم کا کام کر نہیں سکتے فکر جن کو ہے اپنے ناموں کی
سر جھکائے رہے، جو ساری عمر ان کو خواہش ہے اب سلاموں کی
اب تو ساقی بھی کہ اٹھا، شاغل!
"فکر کیجئے، حضور! ناموں کی!"

یہ بھی کم بات نہیں ہے ہرگز ظلم پر اس کو ندامت ہی تھی
آئیے، شیخ حرم سے مل لیں نہ سہی فیض، زیارت ہی تھی
دل کس کو دے دیا ہے، بتاؤ تو کیا ہوا؟ شاغل! نظر جو آتے ہو تم بیکار سے
اسی کا نام محبت ہے شاید، لے شاغل! کہ کھینچتی ہے کوئی چیز دل کے اندر سے
عشق صادق ہو تو خود راہنا ہوتا ہے خضر بھی در نہ جو مل جائیں تو کیا ہوتا ہے!
دیکھ کر رنگ حریفانِ زمانہ شاغل! شکوہ ہوتا ہے، مگر شکوہ سے کیا ہوتا ہے
جو ہو تیز، تو سب کچھ ہے بزمِ عالم میں یہی بہشتِ بریں ہے، یہی جہنم ہے
حرم میں دیر میں، دل میں، کہاں نہیں پھر بھی تری تلاش میں مصروف ایک عالم ہے
مزید لطف و عنایت کی فکر کیوں کیجے تمھاری ایک نگاہِ محرم ہی کیا کم ہے
جو ہو قبول، تو کافی ہے ایک سی سجدہ نہ ہو قبول، تو بیکارِ شکر پیہم ہے
فصل بہار آتے ہی کیا رنگ ہو گیا دامن کا ہوش ہے، نہ خبر آستین کی ہے
دنیا سے واسطہ بھی نہیں، شیخ وقت کو اور فکر بھی جناب کو روئے زمیں کی ہے

عابد لاہوری، سید عابد علی

پچھلی صدی میں شیعہ فرقے کے ایک مشہور فرد ارسطو جاہ سید رجب علی شاہ ہوئے ہیں۔
ہماری زبان کے بمثل انشا پر داند محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے شاگرد تھے
یہی وجہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کے فوجی شہگامے کے بعد آزاد بسیر و سامانی کے عالم میں دلی
سے نکلے، تو انھوں نے استاد زادے کی دلہن کی اور انھیں اپنے پاس رکھا۔

ارسطو جاہ، غالب کے مکتوب الیہم میں بھی ہیں۔ وہ ۱۸۰۶ء میں تلونڈی (ضلع جگڑاؤں،
پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ تلونڈی کا علاقہ ان کے بزرگوں کو حکومت مغلیہ کی طرف سے
بطور جاگیر ملا تھا۔ لیکن سکھ حکومت نے انھیں یہاں سے بریدل کر دیا۔ اس کے بعد
لوگ جگڑاؤں میں آکر بس گئے۔ سید رجب علی شاہ نے وطن کے علاوہ دلی کالج میں بھی
تعلیم پائی، اور چندے یہاں ریاضی کے مدرس بھی رہے۔ ۱۸۵۷ء کے شہگامے کے دوران
میں وہ دلی ہی میں تھے، اور اس زمانے میں شہر سے پہاڑی دھیرج پر مقیم انگریز افسروں
کو اطلاعات پہنچاتے رہے تھے۔ ان شاندار خدمات کے صلے میں انھیں بعد کو دس ہزار نقد
انعام اور خان بہادر اور ارسطو جاہ کے خطاب ملے۔ اور جگڑاؤں میں تین ہزار سالانہ کی

جاگیر بھی۔ نیز انھیں لفٹننٹ گورنر پنجاب کا میئر مقرر کیا گیا۔ ان کا ۹ ستمبر ۱۸۶۹ء
(۲ جمادی ثانی ۱۲۸۶ھ) کو انتقال ہوا۔

اسطو جہاں کے بیٹے سید حسن شاہ تھے۔ یہ مدتوں پنجاب کے محکمہ پولیس میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔
ان کے بیٹے سید غلام عباس نے فوج کی ملازمت کو ترجیح دی۔ اپنی ملازمت کے دوران میں
وہ ملک کے مختلف مقامات میں مقیم رہے۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، صغیر تخلص تھا۔ خدا نے
اولاد جسمانی میں انھیں یکے بعد دیگرے پانچ بیٹے عطا فرمائے، لیکن سب صغریٰ میں داغ
جدلی دے گئے جس زمانے میں وہ ڈیرہ اسماعیل خان میں تعینات تھے، ان کے ہاں ۲۱ ستمبر
۱۹۰۶ء کو اللہ آمین سے بھر (چھٹا) بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام انھوں نے عابد علی رکھا۔
خدا نے اسے زندہ رکھا اور وہ فخر خاندان ثابت ہوا۔ یہی اردو زبان کے مشہور شاعر اور
ادیب، مصنف اور مترجم سید عابد علی ہیں، جن کا پچھلے دنوں لاہور میں انتقال ہو گیا۔ اس
کے بعد خدا نے سید غلام عباس کو اور تین بیٹے اور چار بیٹیاں دیں، اور مجاہد یہ سب آج تک
حیات ہیں۔

عابد صاحب کی ابتدائی تعلیم ڈیرہ اسماعیل خان ہی میں ہوئی اور وہ چھٹے درجے کا امتحان
پاس کرنے کے بعد رنگ محل (لاہور) کے مشن ہائی اسکول میں آگئے، دسویں درجے کی سند
یہاں سے پائی، ۱۹۲۳ء میں بی اے پاس کیا اور ۱۹۲۵ء میں وکالت کا امتحان۔
اب انھوں نے گجرات (پنجاب) میں وکالت شروع کی۔ میں نے ۱۹۲۴ء میں وکٹوریہ ڈائمنڈ
جوہی ہائی اسکول، وزیر آباد سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ انٹر کالج، گجرات میں
داخلہ لیا تھا۔ چونکہ میں یہاں دیر سے پہنچا تھا، اس لیے مجھے کالج کے ہوسٹل میں جگہ نہیں
ملی تھی، اور میں شہر ہی میں ایک کرایے کے کمرے میں مقیم تھا۔ رفتہ رفتہ واقفیت کا حلقہ
وسیع ہوا، تو بعض دوستوں کے ساتھ میں یہاں کی زہم سخن کے مفتہ واری مشاعروں میں
بھی جانے لگا۔ عابد صاحب ان مشاعروں میں بحیثیت شاعر شریک ہوتے تھے۔ اختر شیرانی

(ف ۱۹۴۸) سے ان کی دانش کاٹی روٹی تھی اور دونوں ہم مشرب ہمارا تھے۔ ان دنوں وہ بھی اکثر لاہور سے گجرات آیا کرتے تھے اور انھیں کے ہمارے ہوتے تھے۔ عابد صاحب کا یہ شعر اسی عہد کا ہے:

گلیاں و زرنگا رہے گجرات کی زمیں

ہے اس جگہ قیام میری مست ناز کا

غرض میں نے عابد صاحب کو (اور اختر شیرانی کو بھی) پہلی مرتبہ یہیں گجرات میں دیکھا۔ اس نے گجرات میں شعر و نغمہ تھا یہاں کے دروید از حبت نگاہ و فرویں گوش کا مصداق تھے اور ہر کوچہ ادراقی مصور کا نمونہ۔ وکالت بڑی غور و جہد ہے، یہ کسی سوت کو پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ ہمہ تن اس کے ہو کے نہ رہ جائیں تو آپ اور خواہ کچھ بھی ہو جائیں، کامیاب وکیل نہیں بن سکتے۔ عابد صاحب کے تو وکالت کے ساتھ ایک چھوڑ دود و علیتیں اور لگی تھیں شاعر اور اختر شیرانی ایسے میں بھلا وکالت کیا چلتی، قصہ کوتاہ، ایک سال بعد وہ لاہور واپس سدھائے شاعر اور ادیب تو وہ تھے ہی، لاہور کے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، انہوں نے اور ہزار داستان رسالوں کی ایڈیٹری انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کی تھی۔ گجرات سے واپس آکر انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (فارسی) کی سند لی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی (ف جنوری ۱۹۵۱ء) دیال سنگھ کالج، لاہور میں صدر شعبہ فارسی وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے وٹیکیری کی اور یہ ان کے معاون کی حیثیت سے دیال سنگھ کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئے۔ اس طرح اب علم کی دنیا میں بھی نام آنے لگا۔ دیال سنگھ کالج، میں چار سال کام کیا تھا کہ یہاں سے فوراً کرپچین (ایف سی) کالج، لاہور میں صدر شعبہ السنہ شرقیہ ہو کر چلے گئے۔ وہ اس کالج میں ۱۹۴۲ء تک رہے۔

۱۹۴۶ء میں تاجور مرحوم دیال سنگھ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو اب عابد صاحب دوبارہ یہاں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ تقسیم ملک تک، وہ اس عہد پر

متمکن رہے اور پاکستان بننے پر کلچ کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ لیکن اس عہدے پر وہ زیادہ دن نہیں رہے، رفتہ رفتہ تنظیمیں سے اختلاف پیدا ہو گیا اور بالآخر ۱۹۵۴ء میں انھیں مستعفی ہونا پڑا۔ تقسیم ملک کے بعد حکومت پاکستان نے مجلس ترقی ادب نام کا ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد اردو کے کلاسیکی نثریے کی اشاعت اور بازیافت تھی۔ سید امتیاز علی تاج مرحوم (ف اپریل ۱۹۷۰ء) اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ عابد صاحب ان کے دست راست تھے۔ مجلس کی طرف سے ایک موزنر تھا ہی رسالہ صحیفہ بھی شائع ہونے لگا، عابد صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ غرض کہ یہاں کا ماحول اور مشغلہ سرسری اور ان کے مزاج کے موافق تھا۔ اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان سے کبھی تعلقات پیدا ہو گئے۔ یوں بھی لاہور اسٹیشن کے کرتا دھرتا ان کے شاگرد اور دوست بن گئے، اس لیے ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ عابد صاحب کو موسیقی میں بھی ماہرانہ درک تھا۔ اس سے متعلق ان کی متعدد تقریریں لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھیں۔ فروری ۱۹۷۷ء میں وہ مجلس ترقی ادب کی ملازمت سے الگ ہو گئے، لیکن اس کے بعد بھی اس سے غیر رسمی طور پر وابستہ رہے۔ ان دنوں اس کی فرمائش پر ایک کتاب عروض سے متعلق مرتب کر رہے تھے جس کے لیے غالباً سارسو روپیہ مہینہ وظیفہ انھیں ملتا تھا۔ صحت بہت دن سے خراب تھی۔ ایک زمانے سے محض مورفیا کے ٹیکوں کے سہارے جی رہے تھے گھریلو پریشانیاں بھی ساتھ تھیں، آمدنی کم اور خرچ بے پناہ۔ افسوس، ان کا ۲ جنوری ۱۹۷۱ء صبح کے وقت لاہور میں دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اہل تشیع کے معروف قبرستان مومن پورہ (میکوڈ روڈ) لاہور میں مدفن نصیب ہوا۔

انھیں نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ترجمے میں بھی اچھی مہارت تھی۔ چونکہ زبان کا مزاج پیچانتے تھے اور شعر کا مذاق بہت اچھا تھا، اس لیے تنقید کے میدان میں بھی بند نہیں تھے۔ انھوں نے ڈرامے اور افسانے بھی لکھے۔ پیر الوتی کی مشہور کتاب "ایفروڈاٹس" کا ترجمہ اردو میں داستان کے عنوان سے کیا تھا۔ اسی طرح دل دیوراں کی کتاب "مہٹری آف فلاسفی" کا

ترجمہ بھی ان کے قلم سے ہے۔ بعض نادلوں کا ترجمہ بھی کیا تھا مثلاً قیامت کی رات، بشر ہے کیا کہیے وغیرہ۔ ان کے ترجمے پر کہیں آدرد کا گمان نہیں ہوتا۔ ان کی تصنیفات کی فہرست خاصی طویل ہے، پچاس سے کم نہیں ہونگی۔

انھوں نے تمام اصنافِ نظم میں لکھا ہے۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں حیفظ جالندھری کے گیتوں اور نظموں کی دھوم مچتی تھی، اور یہی کسرِ اختر شیرانی نے پوری کر دی تھی۔ پنجاب کے نوجوان شعرا ان دونوں سے بہت متاثر ہوئے۔ عابد صاحب بھی انھیں لوگوں میں تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں انھوں نے بھی ابتدا میں گیت اور نظمیں لکھیں۔ لیکن اب ایک زمانے سے صرف غزل کہتے تھے اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ خوش گلو بھی تھے، بڑھنے کا انداز دلکش اور سامعہ لواز تھا۔ ان کی ابتدائی منظومات میں اقبال کے ارادی قبیح کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ اردو میں ساقی نامے کی تردید میں ان کا بہت ہاتھ ہے، اگرچہ اس میں انھیں تقدیم کا فخر حاصل نہیں ہے، یہ نفیس لکھنوی کا حصہ ہے۔ عابد صاحب نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی تو وہی گجرات کی بیگم ربلقیس تھیں۔ عابد صاحب کی ساری اولاد اسی بیوی سے ہوئی (سات بیٹیاں اور ایک بیٹا مینو چمر)۔ سب بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے، اور وہ اپنے گھر بار کی ہیں۔ اکلوتا لڑکا آج کل لاہور میں اسسٹنٹ کمشنر ہے۔ ان کی دوسری بیوی محمودہ تھیں۔ اس شادی کے جلد بعد ہی ربلقیس نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ لیکن محمودہ کی بھی ان سے نہیں نکھی، اس نے طلاق لے لی۔ تیسری بیوی محبوب تھیں۔ یہ بیگم امروہہ کے ایک ہاجر خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ یہ شادی انھوں نے پچاس سال کی عمر میں کی تھی۔ وہ آخری دم تک اسی بیوی کے ساتھ رہے، اور اسی کے ہاں ان کا انتقال ہوا۔

اب ان کے چند شعر سنئے :

سب کے جلوے نظر سے گزر رہے ہیں وہ نہ جانے، کدھر سے گزرا رہے ہیں
 موجِ آوازِ پائے یار کے ساتھ نغمے دیوار و در سے گزر رہے ہیں
 آج آیا ہے اپنا دھیان میں آج دل کے نگر سے گزر رہے ہیں
 گھر کے گوشے میں تھے کہیں پہاں جتنے سیلاب گھر سے گزر رہے ہیں
 جہاں کشود لوارِ خرواں کے پھر رہے ہیں وہیں بہارِ غزنخواں ہے دیکھیے کیا ہوا
 سبواٹھا کہ یہ نازک مقام ہے ساقی نہ اہرن ہے نہ بڑیاں ہے دیکھیے کیا ہوا
 ہوا کا رنگ یہ ہے، اشیاء تو ایک طرف قفس بھی شاخ پہ لرزاں ہے دیکھیے کیا ہوا
 ہمیں ہیں پیرِ مغاں کا فرد کے اے عا! ہمیں کو دعویٰ دیاں ہے دیکھیے کیا ہوا

چاند ستاروں سے کیا پوچھوں، کب دن میرے پھرتے ہیں؟

وہ تو بچارے خود ہیں بھکاری، ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
 جن گلیوں میں ہم نے، سکھ کی سبج پہ رایتیں کاٹی تھیں

ان گلیوں میں بیا کل ہو کر سا بھ سویرے پھرتے ہیں
 روپ سروپ کی جوت جگنا، اس نگری میں جو کھم ہے

چاروں کھونٹ بگولے بن کر، گھوڑا اندھیرے پھرتے ہیں
 جن کے شام برن سالیے ہیں میرا من سستا یا تھا

اب تک آنکھوں کے آگے، وہ بال گھینرے پھرتے ہیں
 کوئی ہمیں بھی یہ سمجھا دو، ان پر دل کیوں نہ کچھ گیا!

تیکھی چیتوں، بانکی چھب دالے، بہترے پھرتے ہیں
 اک دن اس نے نین ہلا کے، شرما کے مکھ موڑا تھا

تب سے سندر سندر سپنے من کو گھیرے پھرتے ہیں

اس نگرے کے باغ اور من کی، یارو! لیلانیاری ہے
 پنچھی اپنے سر پہ اٹھا کر اپنے سیرے پھرتے ہیں
 لوگ تو دامن سی لیتے ہیں؛ جیسے ہو حی لیتے ہیں
 عابد! ہم دیوانے ہیں، جو بال بکھیرے پھرتے ہیں
 غم دوراں، غم جاناں کا نشان ہے کہ جو تھا

وصفِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا
 شرع و آیین کی تعزیر کے باوصف، شباب
 لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا
 عشق کی طرزِ تکلم، وہی چپ ہے کہ جو تھی
 لب خوشگوئے ہوس، محو بیاں ہے کہ جو تھا
 سنگِ طفلان سے زرا نیچ کے رہے قصر بلند

یہ وہی کارِ گم شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
 گردش جام نہیں رگ سکتی جو بھی اے گردشِ دوراں! گذرے
 صبحِ محشر ہے بلا سے ظاہر کسی صورتِ شبِ ہجران گذرے
 کوئی برس! نہ سرکشت وفاق کتنے بادل گہرا فشان گذرے
 ابنِ آدم کو نہ آیا کوئی راس کئی آذر، کئی یزدان گذرے
 وہ جو پروانے جلے، رات کی رات منزلِ عشق میں آساں گذرے
 آیا ہمارے جینے کا انداز سب کو یاد جب ذکرِ جاں نثاری پروانہ ہو چکا
 انھیں کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت انھیں کو عرضِ وفا! اگر گزری ہے
 حریمِ شوق مہکتا ہے آج تک، عابد! یہاں سے نکھت گیسوے یار گزری ہے
 غامِ مونیض بہاراں تو مزا آجائے چاک ہوں سب کے گریباں تو مزا آجائے

و غطو! میں بھی تمھاری ہی طرح مسجد میں
 سا قیاب ہے تری محفل میں خداؤں کا ہجوم
 دنیا میں اپنی صبیحیں، نہ شا میں
 لے ہمسفیر و! گلشنِ قفس ہے
 میخوار، ساقی! قطرے کو ترسیں
 فصل بہاراں، گو یا دھن ہے
 اہرمن یار، نہ یزدان محرم
 گیسوے یار ہیں گو شاملِ کار
 زندگی آج ہے انگاروں کی
 یوں بڑھی ان سے راہ و رسم و فا
 میرا مرنا تو، ان پہ کیا کھلتا!
 بستی کے راندے ہوئے، اللہ کے ٹھکرائے ہوئے
 رہ گئے یا قتیلِ غم دوراں ہو کر
 دامنِ یار کی راہوں سے گزر کر آخر
 چاند ترا مرے کاشانے میں عابدِ اکل رات
 لے دوست! موجِ رنگ سے بنتے نہیں چمن
 نوکِ زبانِ خار کی دیکھی نہیں ادا
 جیسی بریاشے ہے، دل کو مضطرب کروں
 مدت کے بعد آئے ہیں اے راہبر! جہاں
 یوں تو میٹھی زباں، بنے ظالم کی
 لب سے ہوتی ہوئی آنکھوں سے سنسی جاتی ہے
 کوئی پردانوں کو سمجھائے کہ مرنے کے سوا
 بیچِ دول دولتِ ایماں تو مزا آ جائے
 محض افروز ہواناں تو مزا آ جائے
 دل کے اندھیرے دل کے آجائے
 آنکھوں پہ مہر ہے، ہونٹوں پہ تالے
 برسین چھما چھم سادون کے بھالے
 پھولوں کا آنکھل، چہرے پہ ڈالے
 یہی تقدیر بشر ہے، ساقی!
 ہر شبِ غم کی حسرت ہے، ساقی!
 عاشقی، رقصِ شر ہے ساقی!
 کہ مجھے بھی کوئی خبر نہ ہوئی
 میرے جینے کی بھی خبر نہ ہوئی
 آخر کار در پیر مغاں تک پہنچے
 ہم سے کچھ سوختہ جاں کی بتاں تک پہنچے
 دستِ گستاخ سرتاجوراں تک پہنچے
 دیکھیے رات کی یہ بات کہاں تک پہنچے
 لے دوست! موجِ خوں کی طلبگار ہے بہار
 غافل کو دہم ہے، گل و گلزار ہے بہار
 یادِ فورِ عشرت سے، یا غمِ تمنا سے
 میرا قیاس ہے کہ، چلے تھے وہیں سے ہم
 آنکھ میں رنگِ التفات نہیں
 لے تو اپیار کے اسلوب جدا ہوتے ہیں
 اور بھی چند مقاماتِ وفا ہوتے ہیں

روش صدیقی، شاہد عزیز

اگرچہ بعض تذکروں میں ان کی تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپی ملتی ہے، لیکن یہ غلط ہے، ان کا صحیح سال ولادت ۱۹۰۹ء ہے۔ مرحوم نے خود ایک مرتبہ میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ جنوری/فروری ۱۹۱۱ء میں نگار (لکھنؤ) نے تذکرۃ الشعرا نمبر شائع کیا، تو نیا ز نے ان سے بھی حالات طلب کیے تھے۔ خدا معلوم، کیسے وہاں تاریخ ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کی جگہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء چھپ گئی۔ اس کے بعد چونکہ سب لکھنے والوں نے حالات وہیں سے نقل کیے، اس لیے یہی تاریخ عام طور پر تسلیم کر لی گئی، حال آنکہ یہ غلط ہے۔

بہر حال روش مرحوم ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء کو جو الاپور (ضلع سہارنپور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد بھی شاعر تھے اور شاہد تخلص کرتے تھے۔ وہ ملا محمد اکرم غنیمت کنجاہی کی مشق 'اینرنگ عشق' کے عاشق تھے۔ اس شنوی کا مطلع ہے:

بنام شاہد نازک خیال

عزیز خاطر آشفہ حال

اسی سے انھوں نے شاہد تخلص اختیار کیا تھا؛ اور اب جو حد نے بنیادیا، تو اس کا نام انھوں نے

شاہد عزیز لکھ دیا۔ مشنری نیرنگ عشق کے یہی دو کردار ہیں، شاہد اور عزیز۔

گھر کا ماحول مذہبی تھا ہی، تعلیم بھی اسی پنج پر مبنی۔ اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی بھی اچھی جانتے تھے اور یہ ان کے وطن جوالا پور سے گوردھل کے قرب کا فیضان تھا۔ بعد کو سنسکرت اور انگریزی سے بھی کچھ واقفیت پیدا کر لی تھی۔

روش تقسیم ملک تک جوالا پور میں رہے۔ یہاں وہ بالنس کا کاروبار کرتے تھے اور اس سے ان کی گذر بسر کے لیے خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ آزادی کے ساتھ فساد آئے، جوالا پور میں بھی بہت سخت ہنگامہ ہوا۔ اسی میں روش کا مکان بھی نذر آتش ہو گیا۔ یہ جان بچا کر مراد آباد پہنچے اور یہاں مولوی منظر جلیل صاحب کے مکان میں پناہ لی۔ مولوی صاحب روش صاحب کے لئے خوش تھے کہ جب روش کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا، اور ایک زمانہ بعد انہوں نے دوسری شادی کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا، تو موصوف نے اپنی بیٹی (سعیدہ) ان کے عقد کاج میں لے دی۔ روش صاحب ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک مراد آباد میں رہے۔

ان کی بیوی کی ایک خالہ میرٹھ میں تھیں۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء میں یہ خاندان میرٹھ منتقل ہو گیا اور محلہ مشانجان میں انھیں کے مکان میں رہنے لگا۔

جوالا پور سے نکلنے کے بعد روش نے ساری عمر شعر کہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ درمیان میں کوئی چار سال کے لیے (۱۹۵۹-۱۹۶۳ء) آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ اردو میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے تھے، لیکن کچا شاعر، کچا دفتر کی بکو اس۔ وہ اس گون کے آدمی نہیں تھے۔ یہاں کا نظام اوقات اور دفتری زندگی کی پابندیاں، یہ بھلا کہاں ان کے بس کی بات تھی بالآخر پرچہ گزرا کہ یہ کام پر توجہ نہیں دیتے دفتر سے دن بھر غائب ہوتے ہیں۔ انجام کار انھیں لگ کر دیا گیا۔ اسی ملازمت کے دوران میں وہ برسلز (بلجیم) کے سہ سالہ جشن شعر میں سندھان سے اردو کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے، یوں یورپ کے بعض مقامات دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے شاہجہانپور گئے۔

رات کو شاعرے میں کلام شاربہ تھے کہ دل کا شدید دورہ پڑا اور تھوڑی دیر بعد ساڑھے چار بجے علی الصباح (۲۳ جنوری) اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ لاش اگلے دن میر گئی اور انھیں درگاہ شاہ ولایت میں (عبدالسمیع بیدل تلمیذ غالب کی قبر کے پاس) سپرد خاک کیا گیا۔ حکیم کلب علی صاحب امر دہوی نے جو مرحوم کے مخلص دوستوں میں سے ہیں، قطعہ تاریخ کہا: اس کے آخری تین شعر ہیں:

جب بھی ہو جائیگی شایستگی ذہن و ضمیر ہو گا اس عہد سعادت میں نمودار روش
یاد کرتی ہے تجھے دادی کشمیر بہت تجھ کو روتے ہیں وہاں کے درد یوار روش!
چل دیا سونے نشاط ابدی آج کی رات 'ہائے' وہ صید محبت وہ وفادار روش
قر سنھلی کا قطعہ تاریخ بھی قابل ذکر ہے: (۱۳۹۰)

اٹھ گیا، اف، روش سا اہل سخن بزم اردو سیاہ پوش ہوئی
اے قر! بھک یہ مصرع تاریخ 'آہ' شمع ادب خاموش ہوئی
اعجاز صدیقی نے عیسوی قطعہ تاریخ کہا ہے: اس کا آخری شعر ہے:

کہو! اعجاز! لب آہ سے تاریخ و قاتل مشعل باب سخن، نام روش صدیقی
روش بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے، اور ان میں آغاز سہا سے پچھلی کے آثار تھے۔ کبھی کسی
اصلاح نہیں لی، تھوڑا بہت مشورہ کیا، تو اپنے والد مرحوم سے کلام میں تصوف اور ویدانت کے
اثرات بہت گہرے اور نمایاں ہیں، اور یہ ان کے ماحول کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے
یہ بھی کہا تھا کہ میر انجمن صاحب روش فارسی کا لفظ نہیں ہے، یہ سنسکرت کا رومی ایش، یعنی
سورج دیوتا ہے جو ان کے کسی فاضل سنسکرت مندو دوست کا عطیہ تھا۔ بہت ابتدائی
میں ان کے کلام کی پچھلی سے بعض اصحاب کو دھوکا ہوا اور وہ انھیں کوئی سن رسیدہ شخص سمجھنے
لگے تھے۔ یہ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ان، م، راشد نے جو اس وقت صرف چودھری نذیر محمد راشد
تھے، روش سے اصلاح بھی لی۔ روش نے ۱۹۳۲ء میں بہادپور کے ایک صاحب

سید مبارک شاہ جیلانی (دف ۲۱ نومبر ۱۹۶۹ء) کے ساتھ مل کر ایک نماہی پرچہ "لآئہ صحرا" بھیجا
 کیا تھا، لیکن اس کا صرف ایک شمارہ نکل کر رہ گیا۔ وہ نظم بہت اچھی لکھتے تھے۔ شروع میں چند
 غزلیں کہیں، لیکن اس کے بعد انھوں نے مدتوں اپنے آپ کو نظم ہی کے لیے وقف رکھا، اور اس میں
 اتنا زہر پیدا کیا۔ ان کی بعض نظمیں (مثلاً کاروان، مرثیہ گاندھی وغیرہ) اردو کی آبرو کو ہی جانے کی
 مستحق ہیں۔ افسوس کہ کاروان، نظم والے کتابچے (بہشتی، ۱۹۵۰ء) اور ایک مجموعہ غزلیات محراب غزل
 (دلی ۱۹۵۹ء) کے علاوہ ان کا اور کلام شائع نہیں ہوا۔ ان کا سرایہ سخن یقیناً دو تین مجموعوں سے
 زیادہ کا ہو گا۔

ان کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ ہے۔ فارسی کی شگفتہ اور دلآویز ترکیبیں ایسی ہر جگہ اور چابکدستی سے
 استعمال کرتے ہیں کہ مزہ آجاتا ہے۔ لیکن شاعر سے بھی زیادہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ مرغاں
 منج، نیک نفس، پابندِ صوم و صلوٰۃ، ویندار۔ میں انھیں ۲۰-۲۵ برس سے جانتا تھا۔ ہمارے موجود
 دور کے اکثر شاعروں کی عام روش کے خلاف میں نے کبھی ان کی زبان سے کسی کلمے خلاف ایک کلمہ
 نہیں سنا، یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہاں مرحوم کی ایک سخن گسترانہ بات یاد آگئی:
 پھیلی جنگ عظیم کے دوران میں حیفظا جالندھری حکومت ہند کے اس محکمے کے کرتادھرتا تھے جس کے
 ذمے گانے بجانے اور کھیل تماشے کے ذریعے حکومت کو فوجی پراسپیکٹڈے کا کاروبار تھا۔ بعد کو ان کی
 خدمات جلیلہ کے اعتراف میں سرکار کی طرف سے انھیں 'خان بہادر' کا خطاب عطا ہوا۔ اس پر
 روش نے ایک قطعہ کہا تھا، جس میں اقبال کے اس مشہور شعر کی تلمیح ہے:
 آ، تجھ کو بتاؤں میں، تقدیر اُمم کیا ہے شمشیر و سناں آؤں، طاؤس و رباب آخر
 روش کا قطعہ ہے:

اقبال کے عرفاں میں تقدیر اُمم یہ ہے شمشیر و سناں آؤں، طاؤس و رباب آخر
 رٹا ص حکومت کی معراج یہ کہتی ہے طاؤس و رباب آؤں، اعزاز و خطاب آخر
 شعری حلقوں میں بھی ان کے فن اور انسانیت کے باعث ان کا وقار تھا۔ خدا اپنے فضل و کرم

سے انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

اب کچھ شعر سنئے، جو ان کے مطبوعہ مجموعہ کلام 'محرابِ نازل' سے ماخوذ ہیں:

مرا ذوقِ سفر ہے بے نیازِ جادہ و منزل	نہ کوئی راہِ میرا، نہ کوئی راہِ نرن میرا
بھری مینا سے کچھ، پھر کچھ ملائی چشمِ ساقی نے	بڑی رعنائیوں کے ساتھ مجھ تک دورِ جام آیا
چراغِ صبح سے کچھ گفتگو تھی بے شبانی پر	تصور میں یکایک چہرہ خورشیدِ شام آیا
تغافل کو کرم سمجھا ہے ہم نے	ہنیں آساں ہمارا بھول جانا
خود آرائی ہے، اظہارِ محبت	خود آگاہی، محبت کا چھپانا
خلوصِ زندگی ہے، گجھکلا ہی	فریبِ مصلحت ہے، سر جھکانا
میری تنہائی تھی اک دنیائے ویران کا حجاب	جانِ محفل! تو نے کیوں یہ راز افشا کر دیا
حسن کے رخ پر تو، اے منصور! پردہ ہی رہا	عشق کی مجبوریوں کو تو نے رسوا کر دیا
وہاں ہزار تغافل، شریکِ نازِ سکوت	ہزار شوق یہاں، شوقِ گفتگو کے سوا
گمانِ بادۂ عشرت مرے سبویہ نہ کر	ہے اس میں زہر بھی شامل، مرے لہو کے سوا
خطا معاف، مری لغزشوں کا محسوسِ راز	کوئی انہیں ترے لطفِ بہانہ جو، کے سوا

کوئی نسبت نہ ہو ساقی سے، تو میخانہ بھی خاک

لطفِ ساقی ہو، تو خاک و درِ میخانہ بہت	
محبت سے پہلے یہ عالم نہ تھا	کہاں آگئے ہم محبت کے بعد
اب اس سے کیا غرض، یہ حرم ہے کہ در ہے	بیٹھے ہیں ہم تو سایہ دیوار دیکھ کر
شایانِ جرم: عشق نہ تھی قیدِ زندگی	حی شاد ہو گیا رسن و دار دیکھ کر
رنج و راحت میں ہے اک ربطِ لطیف	سرخوشی ہے شاہدِ غم کا لباس
نقابِ رخ سر کتا حباب رہا ہے	مگر وہ خود ہوئے جاتے ہیں روپوش
یہ نازِ کم سخن و بصد کم آمیزی	کوئی ہوا تو سہی آج زینتِ محفل

یوں تو ہر خواب تمنا ہے محبت افروز فکرِ تعبیر تمنا ہے محبت کا دوا
بات اتنی سی ہے اے محوِ حجاباتِ نظر حسنِ افکارِ معیّر ہو، تو دنیا ہے حبس
مجھ سے پوشیدہ نہیں، پردہ تقدیر کا راز جو ترے دل میں نہیں، وہ تری قیمت میں نہیں
سکوتِ عشق ہو، یا اضطرابِ شوق، روش! حجابِ راز میں پنہاں نہیں، تو کچھ بھی نہیں
روش! کون لے اب محبت کا نام بڑی ڈلتیں ہیں، بڑی خواریاں
رگوں میں شعلہ حسرت، نہ برقِ آرزو دل میں کہاں سے روشنی ہو، ان خرد مندوں کی عقل میں
حرم نے کر دیا ہے محرمِ آدابِ نظار چلیں اب دیریں قطار، حسنِ ثباں کریں
مرا تو حال ہی کیا ہے، مرا تو ذکر ہی کیا ترے سکوں میں بھی رنگِ فغاں ملا مجھ کو
ہزار دیر و حرم ہیں سجد و آمادہ جہیں ملی کہ ترا آستان ملا مجھ کو
لے فقیہِ شہر! کیا اس کا علاج چشمِ ساقی بھی ہے پیمانے کے ساتھ
تبرِ فرہاد نے یہ راز نہاں فاش کیا کہ شکستِ دل بہسار نہیں کوہِ کنی
لے روش! پاس وضع میں شامل احترامِ تغیرات بھی ہے
دیارِ لالہ و گل بھی نہیں مقامِ سکوں سنو زکرمِ سفر کا روانِ شبنم ہے
مالِ تلخیِ عشرت سے بے خبر ہے حیات ابھی تو شکوہ آغازِ تلخیِ غم ہے
یہاں ہے وقتِ روش! نذرِ کرماتِ سکوں ادائے دلفِ پریشاں کچھ اور برہم ہے
ذیل کی تین غزلیں ان کے مطبوعہ مجموعے 'محرابِ غزل' کے بعد کا کلام ہے:
زندگی کی سچ و خم ہر گام پر سمٹ شکن کام آتا ہے یہاں اہلِ جنوں کا بانگین
حسنِ بے پروا نے توڑا ہے تمنا کا طلسم حیلہ پر ویز ہو یا سادگی کو کہن
کھل ہی جائیگا کبھی یہ راز تجھ پر ہم نشین! میں تو خود ہی پیر ہوں تجھ سے بے پیر
کس قدر رنگیں ہے افسانہ مرے انکار کا ساغرِ گل رنگ و دستِ ساقی گل پیرین
رفتہ رفتہ ارتقاے حسنِ تنہائی ہوا اک تجیر ہے نہ خلوت ہے نہ کوئی انجمن

میں نے کیا کیا رنگ دیکھے دلنوازی کے ترے
میری خاموشی سے خوابیدہ تھی روح کا ثبات
دل شکن، مینا شکن، ایماں شکن، پہاں شکن
میں نے اک مالہ کیا اور جاگ اٹھے دست و
آہ مجھ سے ہی گریزاں ہے مراد یو انہ بن
حسن خاموشی سے سیکھے میں نے آداب سخن
کیا یہ کہ دوں ہے مرے دل کی متاعِ گم شدہ
شامِ غربت میں کھلے اسرارِ میخانہ، روش!

مدتوں چھلکا کیا پیمانہ صبح و طن

حاصلِ عمر، خراباتِ مغاں کیا کہیے
ہے صنم خانہ، کوئینِ تقاضائے سکوت
ہوش آیا ہے تو آیا ہے کہاں کیا کہیے
شوخیِ جنشِ بہہائے بتاں کیا کہیے
کچھ جو کہیے تو بجز دہم و گماں کیا کہیے
کیوں پریشاں ہے صفِ بادہ کشا کیا کہیے
اور مفہومِ حیاتِ گذراں کیا کہیے
کوئی غارت گر محفل ہے کہاں کیا کہیے
حق ادا ہو نہ سکا راہ کے کانٹوں کا روش!

ساتھ تھا قافلہ گلِ بدناں کیا کہیے

نازِ فرما ہے فروغِ شعلہ رخسارِ دوست
عشق کہتا ہے کہ ہے دشمن کی غمخواری بھی شرط
سر جھکا دے اسے ہجومِ حسرت و یادِ دوست
یہ تو اسان ہے کہ کوئی دوست ہو غمخوارِ دوست
منگوں بیٹھے ہیں زیرِ سایہ دیوارِ دوست
یہ سلیقہ ہے عطا ہے کیسے ختمِ دارِ دوست
جیسے سچ مل گئی ہو دولتِ اقرارِ دوست
دیکھ ان کو بھی ذرا اے طالبِ یادِ دوست
جان دیتے ہیں جو نادیدہ جمالِ یارِ پر
حرفِ انکارِ محبت کی دل آویزی نہ پوچھ

ذکر دنیا، فکر عقبی گم ہوئے اس شغل میں زندگی کو ہم نے سمجھا اہتمامِ کارِ دوست
 اس بھوم بے نیازی میں بہت یوسف ہیں گم اک ذرا پاسِ دُوب اے دل سربازِ دوست
 حسن تہذیبِ غول کچھ اور ہے اے نیکو دل جا کہیں سے لاجنونِ شوخیِ گفتِ دوست
 زندگی کی رات آنکھوں میں کٹے گی اے ش سہل مت جاؤ پیامِ وعدہ دیدارِ دوست
 مجھ سا آشفقتہ نوادِ مصرعہ غالبِ و ش
 کچھ نہ کچھ کہنا پڑا آخر کہ تھا اصرارِ دوست

عقیل جعفری خیر آبادی، سید عقیل احمد

مشہور مصنف اور صحافی رئیس احمد جعفری (ف ۱۹۶۸ء) کے بڑے بھائی تھے۔ ان کا سالِ ولادت غالباً ۱۵۰۶ء تھا۔ اگرچہ مسقطاً از اس سیتا پور تھا، لیکن ان کی پرورش اپنی نانا خیمیاں خیر آباد کی مردم خیز بستی میں ہوئی۔ والد سیدنا طہر حسین کا ان کی کسبی میں انتقال ہو گیا تھا، اس لیے یہ دونوں بھائی خیر آباد چلے گئے، مشہور شاعر خمریات ریاض خیر آبادی (ف ۱۹۳۴ء) ان کے نانا سید نیاز احمد کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، انھیں دونوں کی نگرانی میں عقیل احمد اور رئیس احمد کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ لیکن چونکہ والد کے انتقال کے بعد گھر کی مالی حالت سیکھم ہو گئی تھی، اس لیے تعلیم پر کافی توجہ نہ دی جاسکی۔

شروع میں سیاست سے دلچسپی رہی اور خیر آباد میں بورڈ کے سپرینٹنڈنٹ بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اپنی خاندانی روایت اور ماحول کے زیر اثر بلند ہوا شعروادب کی طرف آ گئے۔ اس کے بعد کچھ دنوں میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ ایک مدت بعد ۱۹۴۵ء میں بمبئی چلے گئے، جہاں رسل احمد جعفری پہلے سے مقیم تھے جب ملک تقسیم ہوا تو یہ بھی ان کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ یہاں انھوں نے کراچی میں محمد علی اکھٹاری قائم کی تھی۔ خیال تھا کہ اسے نشری ادارہ بنائیں گے،

لیکن بعد کو اسے ٹیس احمد کے سپر کر دیا، اور اپنے لیے ایک اور بکٹ پونالیا وہیں کراچی میں ۲۶/۲ جنوری کی دمیانی شب میں انتقال کیا۔

ان کی سب سے پہلی تصنیف غالباً "نثر ریاض خیر آبادی" تھی، جو حیدر آباد کے کسی ناشر نے شائع کی تھی کراچی کے زمانہ قیام میں تین چیزیں شائع ہوئیں۔ مکالمات ابوالکلام، جوش و ہوش اور مجموعہ کلام جوش و ہوش، قطعوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے جوش بلخ آبادی کا الحاد اور ندی الم نشرح ہے وہ ان موضوعات پر وقتاً فوقتاً بیباکی سے لکھتے رہتے ہیں عقیل نے انھیں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مضامین کا بھی اچھا خاصہ ذخیرہ منتشر اور غیر مرتب شکل میں موجود ہے۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے

ذیل میں نمونے کے طور پر ان کی چار رباعیاں دی جا رہی ہیں جو انھوں نے جوش کے جواب میں کہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جوش ہی کے الفاظ میں رد و بدل کر کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا جذبہ حمیت دین اپنی جگہ، لیکن وہ بات کہاں مولوی دن کی سی!

مرتے ہیں ترقی پہ فنا کے بندے انسان ہیں یا حرص و ہوا کے بندے
چل اور دکھا راہ مستقیم ان کو اے حسن تقویم، خدا کے بندے

اے بلخ بلخ علم و عمل، محسب دیں! اے جنت الارضی میں جہنم کے یکس
سوئے ہوئے فتنوں کو جگانے والے تجھ کو بھی نہیں قرب قیامت کا یقیں

جب حشر کی تردید ہی کرتے گوری تو کس لیے عمر آپ کی ڈرتے گوری
کریجیے، اس کا بھی جہنم میں شمار جو عمر کہ ہائے کرتے گوری

موقوف ہوئی بانگ جس اے ساقی! وہ آگیا اب عرش، بس اے ساقی!
صد شکر ہوا خاتمہ بالآخر، عقیل! باقی نہیں اب کوئی ہوس اے ساقی!

وکیل اختر، وکیل احمد اختر خان

اس جواں سال ادیب کا ۹ فروری ۱۹۷۱ء کی دوپہر کلکتہ میں انتقال ہوا۔ اور افسوس اس طرح ایک اور بن کھلا غنچہ بادِ مخالف کی نذر ہو گیا۔

ان کا اصلی نام عقیل احمد اختر خان تھا، لیکن بعد کو کسی وجہ سے بدل کر عقیل کی جگہ وکیل لکھنے لگے۔ ان کے والد کا نام سحان خان تھا۔ وکیل اختر ایک تریہ پتھوری اصل گویا، بہار میں ۳۰ مئی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی۔ یہاں سے کلکتہ پہنچے اور مدرسہ عالیہ سے ۱۹۵۲ء میں اسکول فائنل کرنے کے بعد سنٹرل کالج کلکتہ سے بی اے اور پھر اسی یونیورسٹی سے تاریخ و تمدن اسلامی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ کینسر کا حملہ ہوا۔ علاج معالجے سے بظاہر ٹھیک ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرض جڑ سے نہیں گیا تھا۔ ایم اے کے بعد اسلامیہ ایمنی اسکول کلکتہ میں پڑھانے لگے؛ چندے بعد ۱۹۶۷ء میں کلکتہ مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ اسی دوران میں مرض عود کر آیا ادب کے جان لیوا ثابت ہوا۔

شاعری کالج کے زمانے میں شروع کی؛ اور آغاز میں اپنے کالج کے استاد پر وفسیر عباس علی خان

بہبود (ف ۱۹۶۹ء) ہی سے اصلاح بھی لی۔ بعد کو انھوں نے اپنے آپ پر اعتماد کو کے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں جدت اور نیا آہنگ ہے۔ آگے بڑھنے کے بہت امکانات تھے۔ اگر زندگی وفا کرتی، تو یقیناً ترقی کرتے، لیکن موت کسی کو مفر نہیں۔ مجموعہ کلام ان کی زندگی میں مرتب نہیں ہوا، اور غالباً کلام مقدّم میں کچھ زیادہ بھی نہیں۔ ان کے احباب اسے سمیٹ کر دائروں کی شکست، کے عنوان سے چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب چند شعر ملاحظہ ہوں:

مندروں مسجدوں اور گرجوں سوالوں کو تم

جس طرح چاہو سمار کر دو

اس لیے کہ

تم تو روز ازل سے

کتنے معبود کتنے معابد بناتے۔

— مٹاتے، مٹاتے بناتے چلے آ رہے ہو

اس لیے کہ تمہیں اب

خلاؤں میں بھی تھر سازی کا فن آچکا ہے

مگر اپنے ذہن رسا

زعم تحقیق و تخلیق سے پوچھ کر یہ بتاؤ

روز ازل سے اب تک

خون کا کوئی قطرہ بنایا ہے تم نے؟

گو کوئی راہبر نہیں ہوتا کارواں در بدر نہیں ہوتا

ہم نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں جن کے چہرے پہ سر نہیں ہوتا

صرف درسی کتاب پڑھنے سے آدمی دیدہ ور نہیں ہوتا

سنگ وہ پھینکتا ہے اوروں پر جس کا شیشے کا گھر نہیں ہوتا
 سچ کا پودا لگا کے دیکھ لیا اس میں کوئی ثمر نہیں ہوتا
 دوسروں پر کیا کرد تنقید تم سے کچھ اور گھر نہیں ہوتا
 ہائے وہ لوگ جن کی نظروں میں فرق عیب و ہنر نہیں ہوتا
 حسن والوں پہ کچھ نہیں موقوف کون اب خود نگہ نہیں ہوتا

خرد کی آندھیاں ان کا تغافل اپنی جھوٹی تماؤں کی کو مدھم نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
 منکر عیش و طرب ہے، یاد! دل کا اب حال عجیب ہے یاد!
 نہ غیر بھائے نہ اپنا لگے بھلا جھ کو مرے شعور نے کیا بنا دیا جھ کو
 کوئی سبب ہو سر رنکیز جو بیٹھا ہوں سمجھ رہے ہو تو سمجھو شکستہ پا جھ کو
 اب نیند کہاں آنکھوں میں شعلہ سا بھرا یہ پتے ہوئے ہونٹوں کو تکیے کی سزا ہے
 یوں تو تنہائی میں گھرائے بہت مل کے لوگوں سے بھی پچھتائے بہت
 عجب خامشی اس کے ہونٹوں پہ نئی عجب شور اس کی نگاہوں میں تھا
 زندگی دستِ تنگ رہی ہو برسوں یہ زمیں ہم پہ بہت تنگ رہی ہو برسوں
 یہ نہیں معلوم کہ کیا بات تھی دور ہے تھے میرے ہماری بہت
 کسی صورت کوئی صورت نکالو تجھے بے موت مرنے سے بچا لو
 اس شخص کے علم کا کوئی اندازہ لگاؤ جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے
 ہر قدم راہِ طاب میں دل یہ کہتا چلے ہو جو خرد سے مشورہ لے ہو وہ دھوکہ کھائے ہو
 جو کبھی کرنا ہو وہ کر گزروں دل کی رائے ہو سوچنے والا ہمیشہ سوچتا رہ جائے ہو
 یادِ حسنِ یار میں اس دل کی کیفیت نہ پوچھ ”آبگینہ تندہی صہبا سے بگھلا جائے ہو“
 اس کی بزمِ ناز سے آخر اٹھوں میں جب کبھی یوں لگے ہو جیسے دل سینے میں بیٹھا جائے ہو
 وہ آکھی جائے تو اس کو کہاں بٹھاؤنگا میں اپنے گھر میں تو رہتا ہوں گھر کی طرح

میاں لبشیر احمد

لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ باغباپنورہ ہے۔ یہاں کی میاں فیملی اپنی وجاہت، تمول، ترقی پسندی اور ملکی خدمات کے لیے معروف ہے۔ اسی خاندان کے ایک گلِ سرسبد میاں شاہدین ہمایوں ہوئے ہیں۔ کسی زمانے میں پنجاب چیف کورٹ کے جج رہے تھے، اس لیے عام طور پر آئرن ہیل جسٹس میاں شاہدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ جسٹس شاہدین کے والد سرمدی نظام الدین بڑے فضل بزرگ تھے اور دادا مولوی قادیان بخش حید عالم اور ہمارا چچ رنجیت سنگھ کے عہد میں شاہی خاندان کے نوہنوں کے استاد اور تالیق رہے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے، نادر تخلص تھا۔

جسٹس شاہدین بھی شعر کہتے تھے، ہمایوں ان کا تخلص تھا۔ ان کا مجموعہ کلام 'جذباتِ ستار' کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میاں لبشیر احمد نے شائع کیا تھا۔ ہمایوں کا ۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو انتقال ہوا۔ اقبال نے تاریخِ وفات کہی:

در گلستانِ دہر ہمایوںِ نکمہ سنج آمد مثالِ شبنم و چوں پوے گلِ دمید
حی حُبت عند لبِ خوش آسنگ سالِ نو "علامہ فصیح" زہر چار" سو شنید

انہیں میاں شاہین کے اکلوتے بیٹے میاں بشیر احمد تھے جن کا ابھی پچھلے دنوں ۳ مارچ ۱۹۷۱ء شام کے وقت لاہور میں انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت ۷۸ سال کی عمر تھی۔ میاں بشیر احمد مرحوم کے ساتھ گویا ہماری پچھلی نسل کی شرافت اور متانت، وضعداری اور خود کوفازی کا جنازہ اٹھ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میاں بشیر احمد ۲۹ مارچ ۱۸۹۳ء کو اپنے خاندانی مکان، باغبانپورہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کے ابتدائی مراحل لاہور میں مکمل کیے۔ ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ کالج (لاہور) سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد ولایت چلے گئے۔ وہاں داؤد حم کالج، آکسفورڈ سے ۱۹۱۳ء میں بی اے آنرز (تاریخ) کی سند لی، وہ اس سال کے تاریخ کے تمام طلبہ میں اول آئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں لندن سے بیرسٹری کا امتحان دیا۔ اس میں کامیابی کے بعد واپس وطن چلے آئے۔ اولاً چندے یہاں اعزازی طور پر اسلامیہ کالج میں تاریخ پڑھاتے رہے تھے۔

شعر بھی کہتے تھے۔ زار تخلص تھا۔ پہلے تدنوں، الجبر خوان، کے پردے میں سر عبدالقادر (د ف ۱۹۵۰ء) کے ماہنامے مخزن میں نثری مضمون بھی لکھتے رہے۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں اپنے والد مرحوم کے تخلص کی مناسبت سے ماہنامہ ہمایوں جاری کیا۔ اس کے سر لوح یہ شعر چھپتا تھا، جو ہمایوں مرحوم ہی کا تھا:

اٹھو، وگر حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
وورو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ہمایوں ہماری زبان کا صفِ اول کا رسالہ تھا۔ کیا یہ کچھ کم امتیاز کی بات ہے کہ اس میں کوئی ایسی نظم یا غزل کبھی نہیں بھپی، جس میں لفظ 'بوسہ' استعمال ہوا ہو۔ یہی احتیاط اور رکھ رکھاؤ میاں بشیر احمد کی پوری زندگی کی علامت ہے۔ ہمایوں ۳۵ سال تک اردو کی شاندار خدمات سرانجام دینے کے بعد ۱۹۵۷ء میں بند ہو گیا۔

میاں بشیر احمد نے اردو کی ترویج کے لیے ۱۹۳۶ء میں انجمن اردو پنجاب کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا اصل مقصد نوجوانوں میں علم و ادب کا ذوق اور تحقیق کا شغف پیدا کرنا تھا۔ وہ مختلف اوقات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رکن، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے فیلو (۱۹۳۷ء) ۱۹۴۰ء) انجمن ترقی اردو کی منتظمہ کے رکن بھی رہے۔

یہ زمانہ سیاسی تنگ و دو کا تھا اور پھر ان کے خاندان میں تو سیاست اور مسلم لیگ کے دن رات چرچے رہتے تھے۔ سرمیاں محمد شفیع ان کے چچا اور خسر بزرگوار تھے۔ (ان کی بیگم گیتی آرا سر محمد شفیع کی چھوٹی صاحبزادی اور جہان آرا بیگم شاہ نواز کی چھوٹی بہن ہیں) مسلم لیگ کے مارچ ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس لاہور کی (جس میں پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی تھی) مجلس انتظامیہ کے سکتر میاں بشیر احمد ہی تھے۔ وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کی مرکزی عاملہ کے رکن بھی رہے، ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۹ء پنجاب مجلس و اضح قوانین کے بھی رکن تھے۔ خضر حیات خاں ٹوانہ کی وزارت کے خلاف تحریک میں بھی شریک تھے، اور اس سلسلے میں ثبوت قید و بند تک پہنچی تھی۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد وہ ۱۹۴۹ء میں ترکیا میں اپنے ملک کے سفیر مقرر ہوئے۔ ترکیا اور پاکستان کے درمیان دوستانہ معاہدے پر انھیں کے عہد سفارت میں دستخط ہوئے تھے۔

انھوں نے ابتدائی ایام میں (آج سے کوئی چالیس سال پہلے) اپنے فلسفیانہ مضامین کا ایک مجلہ "ظہر زندگی" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں روزمرہ کے واقعات جو بصیرت افزا و نتائج اخذ کئے ہیں، وہ انھیں کا حصہ تھا۔ کتاب کی ظاہری شکل و صورت بھی بہت دیدہ و نظر تھی، جو ان دنوں اردو کتابوں کے لیے غیر معمولی بات تھی۔ اپنے والد کی سوانح عمری "انگریزی میں مرتب کی تھی" اس میں ان کی تقریریں بھی شامل ہیں۔ ایک کتاب کا نام "اسلام" بھی ہے۔ اسلامی سیاست سے متعلق بھی "مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل" ایک کتاب موجود ہے۔ مضامین کا بہت بڑا ذخیرہ دہائیوں کے صفحات میں محفوظ ہے۔

تذکرہ معاصرین

اولادِ جمالی میں ایک بیٹا (منظر بشیر) اور دو بیٹیاں (رفعت جہان اور ثروت جہان) ان سے یادگار ہیں۔ انتقال ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو لاہور کے مکان (المنظر) میں ہوا تھا، لیکن لاش اگلے دن (۴ مارچ) باغیا پورہ گئی۔ جہاں ان کے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

عبدالقادرسروری (پروفیسر)

پروفیسر عبدالقادرسروری صاحب کے والد حاجی محمد سرخز نام عامرہ، حیدر آباد میں بحیثیت
مشاور قلیل شاہری (غالباً بارہ روپے) پر ملازم رہے۔ یہاں ان کے ذمے وظیفہ خواروں کے
نام پکارنے کا کام سپرد تھا۔ اس قلیل آمدنی پر بھی قناعت اور خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں
چھوڑا۔ سروری صاحب ان کی دوسری بیوی کے لطن سے ۱۹ اگست ۱۹۰۶ء کو حیدر آباد میں پیدا
ہوئے۔ عربی اور فارسی وارد کی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے علاقائی بھائی مولوی محمد حفیظ سے
پائی۔ اسکول جانے کے قابل ہوئے، تو مختلف مدارس سے ہوتے ہوئے بالآخر سٹی ہائی اسکول
سے دسویں درجے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے
۱۹۲۷ء میں ایم اے (اردو) اور ۱۹۲۹ء میں ایل ایل بی (یعنی وکالت) کے امتحان پاس کیے۔
ایم اے میں مرحوم ڈاکٹر محی الدین قادری زور ان کے ہم جماعت تھے۔ یونیورسٹی میں اس وقت
صدر شعبہ اردو مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی (ف ۱۹۲۸ء) تھے؛ ڈاکٹر سید سجاد (ف) کراچی
۲۴ فروری ۱۹۵۵ء بھی یہیں تھے۔ اسی سال سلیم نے بیماری کے باعث لمبی رخصت لی تھی
اور ان کی جگہ مولوی عبدالحق صدر شعبہ مقرر ہوئے تھے۔ سلیم جاتے وقت سفارش کر گئے کہ

سروری صاحب کو شعبے میں مددگار پروفیسر مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ سروری صاحب اسی سال جامعہ عثمانیہ میں مددگار پروفیسر اردو کے عہدے پر فائز ہو گئے اور اس طرح اب انھیں مولوی عبدالحق کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ یہاں ۱۹۴۲ء تک رہے۔ ۱۹۴۲ء میں سروری صاحب کامیویریونیورسٹی میں شعبہ اردو کی صدارت اور پروفیسری پر تقرر ہو گیا۔ انھوں نے اپنے چھ سالہ دوران قیام میسوری اس یونیورسٹی میں اردو کی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے بہت کام کیا۔ ایم اے کے درجے کھلوائے، جس سے شعبے کا کام وسیع تر ہو گیا۔ اردو کے نصاب کے لیے کتب تیار کر دئیں، تاکہ تعلیم کا معیار بلند ہو۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی مادری تعلیمی میں صدر شعبہ کی جگہ خالی ہوئی، تو اس کی پیشکش انھیں کی گئی، جس پر وہ حیدرآباد واپس آ گئے۔ وہ تیرہ برس بعد ۱۹۶۱ء میں یہیں سے نیشنل پملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا سرنگر میں انتقال ہو گیا۔ جہاں وہ جون ۱۹۶۱ء سے اردو اور فارسی کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اب اصحاب مجاز کی نظر انتخاب سروری صاحب پر پڑی، اور یوں ۱۹۶۳ء میں وہ سرنگر پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ جاڑوں کی تعطیلات کے زمانے میں اپنے وطن چلے آتے تھے چنانچہ اب کے بھی ٹی اور حیدرآباد میں قیام رہا۔ وہ ۵ مارچ کو حیدرآباد سے سرنگر کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں دلی اور جموں قیام کیا اور ۹ مارچ کو سرنگر پہنچے۔ اگلے دن (۱۱ مارچ) یونیورسٹی گئے۔ اسی رات دل کا دورہ پڑا، جو ہلک ثابت ہوا۔ (۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء رات ساڑھے دس بجے اللہ کو پیارے ہوئے۔ ۱۲ مارچ قبل از نماز جمعہ جنازہ اٹھا اور ان کے مسکن (جواہرنگر) کے قریب ہی ایک دیوان سے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جناب نور اللہ حیدر آبادی (ملکیز جلیل انجمن) نے نو کے ٹخرہ سے حسب ذیل تاریخ وفات کہی ہے:

وہ ادیب نامور، وہ سپر خلق و کرم ہے بجا اگر اس کے غم میں خون آنکھوں سے بہے
تو بس وہ اور جی جاتے، تو ہوتا سال یہ عبد قادر سروری کسٹیر سے جنت گئے

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی ان کی طالب علمی کے زمانے (۱۹۲۶ء) ہی میں ہو گئی تھی لیکن یہ بیگم ڈیڑھ سال بعد اپنے پیچھے ایک دودھ پیتی بچی چھوڑ کر داغ مفارقت دے گئیں۔ زبیدہ کلثوم ایم۔ اے (۶۱) جو دنیا تھا دویالہ حیدر آباد میں عربی پڑھاتی ہیں، وہی بچی ہیں۔ دوسرا نکاح انھوں نے بہت دن بعد ۱۹۳۲ء میں کیا تھا۔ ان سے بھی مائتا اللہ تین لڑکے اور دو لڑکیاں یادگار ہیں۔

سروری صاحب کو اردو تصنیف و تالیف کا شوق زمانہ طالب علمی سے تھا۔ سلیم مرحوم اپنے طلبہ سے بہت محبت کرتے تھے اور ہونہار نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے۔ یہ امر واقع ہے کہ زور اور سروری کا تصنیفی شوق سلیم سی کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھا۔ بلکہ سروری صاحب نے اپنے والد کے نام کی رعایت سے سروری کی نسبت بھی سلیم کے ایما پر اختیار کی تھی۔

سروری صاحب کی سب سے پہلی تصنیف ”دنیاے افسانہ“ ہے؛ یہ انھوں نے ایم اے پاس کرنے کے بعد شائع کی تھی (حیدر آباد، ۱۹۲۷ء)۔ اس کا دوسرا حصہ بعد کو شائع ہوا (۱۹۲۹ء) جس میں ”مردار اور افسانہ“ سے متعلق بحث ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے بعض احباب سے دوسری زبانوں سے منتقل کردہ افسانوں کے چار مجموعے بھی شائع کیے تھے: قدیم افسانے، چینی اور جاپانی افسانے از افتخار الدین و فیض محمد (۱۹۳۰ء)؛ انگریزی افسانے؛ فرانسیسی افسانے اور عزیز احمد (۱۹۳۳ء)۔ وہ ایک زمانے تک حیدر آباد کے ماہنامے مکتبہ کے مدیر رہے تھے۔ یہ افسانے پہلے وقتاً فوقتاً وہیں شائع ہوئے؛ بعد کو انھیں کتابی شکل دے دی گئی، جب وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہوئے؛ تو انھوں نے ”جدید اردو شاعری“ تصنیف کی (۱۹۳۲ء)۔ ایک لحاظ سے یہ کتاب حالی کے ”مقدمہ شعرو شاعری“ کا متمم ہے۔ یہ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ دلی اور لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

اسی زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے اپنی انجمن طیلسانین قائم کی تھی؛ اس کا اپنا مجلہ بھی تھا۔ شروع میں غالباً پانچ برس تک (۱۹۲۷-۱۹۳۱ء) زور مرحوم اس کے مدیر رہے۔ اس کے بعد ایک سال (۱۹۳۲ء) یہ سروری صاحب کی ادارت میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر زور اوائل ۱۹۳۱ء میں یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے اور جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو ہی میں ان کا بھی تقرر ہوا۔ جیسا کہ بیان ہوا، مولوی عبدالحق اس زمانے میں صدر شعبہ تھے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری انجمن کے شہرہ آفاق مابہر سالے اردو کے مدیر بھی تھے۔ خدا معلوم کیونکہ دکن کے ادیبوں کو یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ مولوی صاحب موصوف مقامی مصنفوں کی مناسب حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ زور اور سروری کے زمانہ طالب علمی سے باہمی دوستانہ تعلقات تھے۔ انھوں نے اس خیال کو ہوا دی اور اپنے احباب کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد طے کیا کہ دکنی اور دکنیات اور دکنی ادیبوں کے فروغ کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت جنوری ۱۹۳۱ء میں ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے اولین بانی پانچ شخص تھے: ڈاکٹر محمد الدین قادری زور (ف ۱۹۶۲ء)، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، نصیر الدین ہاشمی (ف ۱۹۶۲ء)، اور مولوی عبدالقدیر صدیقی، مدرس شعبہ دینیات، جامعہ عثمانیہ (ف اوائل ۱۹۳۲ء)۔ کہا نہیں جاسکتا کہ ان اصحاب کا شک و شبہ کس حد تک جائز اور صحیح تھا۔ لیکن پچھلے ۴۰ سال میں اس ادارے نے اردو کی ترقی و ترویج، تصنیف و تالیف اور مخطوطات کے تحفظ و تدوین کے سلسلے میں جو شاندار خدمات سرانجام دی ہیں، وہ تاریخ ادب اردو کا روشن باب ہیں، اور اردو دواوں کو اس پر فخر کرنا چاہیے۔

ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے سروری صاحب کی یہ کتابیں شائع ہوئیں: سراج

کے کلام کا انتخاب، 'سراج سخن' (۱۳۵۵ھ)، 'سراج اور اس کی شاعری' اردو شاعری کا ارتقار (۱۹۴۰ء)، 'افسانوں کا مجموعہ: رات کا بھولا اور دیگر افسانے' (۱۹۴۲ء)، 'اردو کی ادنی تاریخ' (۱۹۵۸ء)۔ ایک کتاب 'زمان اور علم زمان' 'مجلس تحقیقات' حیدر آباد نے شائع کی تھی (۱۹۵۶ء)۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ابھی پارسل شائع ہوا ہے۔

نواب یوسف علی خان سالار جنگ سوم (ف ۱۹۴۶ء) حیدر آباد کے پشتینی امیر تھے۔ سالار جنگ میوزیم انھیں نے جمع کیا تھا۔ وہ علم و ادب اور فنون لطیفہ کے بڑے رسیا اور پارکھ تھے؛ دکنی زبان کے کئی انمول رتن اپنے کتب خانے میں جمع کیے تھے۔ بعض احباب کے مشورے سے انھوں نے ۱۹۳۵ء میں 'مجلس اشاعت' دھمی مخطوطات قائم کی، جس کا مقصد اس کے نام سے عیاں ہے۔ سروری مرحوم بھی اس کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ انھوں نے اس مجلس کے لیے یہ کتابیں مرتب کیں: پھولبن از ابن نشاطی (۱۳۵۵ھ)، قصہ بنیظیر از صنعتی (۱۳۵۵ھ)، کلیات سراج (۱۳۵۵ھ)۔

انھوں نے اپنے قیام میور کے زمانے میں نواب حیدر علی خان (ف ۱۸۲۷ء) کے منشی ہتاب رائے سبقت کی بیاض 'ہتاب سخن' کے عنوان سے مرتب کی تھی۔ میور میں ایک صوفی بزرگ شاہ صدر الدین گذرے ہیں۔ ان کا تصنیف کردہ ایک رسالہ 'مرآة الاسرار' دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے۔ سروری صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

سرنگر (کشمیر) کے قیام کا ثمرہ تین کتابیں تھیں: کشمیر کے دو ادیب 'دو بھائی' (پنڈت ہرگوپال خستہ اور سالک رام سالک) (حیدر آباد ۱۹۶۵ء) اور کشمیر میں فارسی اذ کی تاریخ (حیدر آباد ۱۹۶۸ء)۔ انھوں نے ریاست کشمیر میں اردو ادب کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ آخری ملاقات کے دوران میں انھوں نے بتایا تھا کہ تقریباً ۹۰ صفحات لکھے جا چکے ہیں، اس کا مسودہ کلچرل اکیڈمی، سرنگر کی تحویل میں ہے۔ اسے جلد شائع کر دینا چاہیے۔

قیس بنارسی، منشی شیو مورت لال

ان کے بزرگوں کا وطن ضلع جوئی پور کا قصبہ منڈیاہوں (ضلع جوئی پور) تھا۔ یہاں ان کی کچھ زمین تھی اور کھیتی باڑی ذریعہ معاش تھا۔ قیس کے والد منشی گنپت سہاسے تقریباً ایک صدی پیشتر اس گاؤں سے نقل مکان کر کے بنارس چلے آئے تھے۔ وہ قوم کے سربراہ استود کا ستھ، اور پیشے کے لحاظ سے عرائض نویس تھے اور اس فن کے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس سے انھوں نے خاصی بڑی جادو پیدا کی تھی۔

قیس ۱۹۰۳ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کونز کالج مینچے، لیکن یہ وہ زمانہ ہے، جب انگریزی حکومت کے خلاف ہماری جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ قیس نے بھی ترک مولات کی تحریک پر لبیک کہا اور تعلیم چھوڑ، کانگریس میں شامل ہو گئے۔ اس سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، اس کے بعد تعلیم کا رشتہ کچھ بھی استوار نہ ہو سکا۔

شعر و شاعری سے دلچسپی بھی اسی زمانے میں پیدا ہوئی، لیکن صرف پڑھنے اور سننے کی حد تک۔ ایک مشاعرے میں اتفاق سے ملاقات بنارس کے مشہور اہل دل شاعر شاہ سر

لال صوفی (ف ۱۹۳۶ء) سے ہو گئی۔ صوفی ہمارے مرحوم وزیراعظم شری لال بہادر شاستری (ف جنوری ۱۹۶۶ء) کے حقیقی ماموں تھے؛ شاستری جی کی تعلیم تربیت بھی صوفی کے سایہ عاطفت میں ہوئی تھی۔ وہ ایک زمانے تک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پیکار بھی رہے تھے۔ صوفی خود رحمت بنارس (ف ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵-۱۹۳۶ء) تلمیذ داغ کے شاگرد تھے۔ غرض نوجوان قیس کی صوفی سے ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اندر کی خوابیدہ شعری قوتیں بیدار ہو گئیں۔ انھوں نے قیس تخلص اختیار کیا، اور صوفی سے اصلاح لینے لگے۔

چونکہ والد کے ترکے سے ابھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، اس لیے فکرِ معاش ان کے شوق کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔ شاعری اور شراب ان کے دو شوق زندگی کے ساتھ بچے۔ آخر میں کچھ پریشان سے رہنے لگے تھے۔ اس پر اتر پردیش کی حکومت نے ان کا ۷۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ (ادبی) مقرر کر دیا تھا۔

افسوس کہ کلام شائع نہیں ہوا، حالانکہ ضخیم کلیات موجود ہے۔ اگرچہ سب اصناف سخن — غزل، نظم، رباعی، قطعہ — میں طبع آزمائی کی، لیکن ان کا اصلی میدان غزل تھی۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۱ء کو بنارس میں انتقال کیا۔ احباب اور شاگردوں کا بہت بڑا حلقہ ان کے سوگواروں میں ہے۔

ان کے کلام میں جذبے کی شدت اور دلہانہ پن ہے، جو اثر سے خالی نہیں۔ پڑھنے میں بھی ایک وارفتگی کا عالم تھا۔ چند شعر سنئے:

میری میناے تغزل سرِ فرازِ آرزو لے بت ایماں شکن! کیا ہے یہ رازِ آرزو؟
اب تو میں آہی گیا ہوں آتے پر تے کچھ بھی دے کیونکر ادا ہوگی نمازِ آرزو!
کتنے جذبے موجزن ہیں دیدہ و دل میں تر کتنے نغموں سے بھرا ہے میرا سازِ آرزو!
تیرے جلوے میرے سجدے تیرا عالم میرا دل اس پہ بھی ہوتا نہیں ہے امتیازِ آرزو

میں دی ہوں قیاس جو تیری بدولت آج بھی ہر حقیقت کو سمجھتا ہے مجاز آرزو

اے قیاس! نوشے کا ہر اک جام پیے جا
کچھ بھی تو نہیں گزشتہ ایام پیے جا
کو ترک خودی صبح سے تا شام پیے جا
اک نعرہ متانہ ہے انجام پیے جا
جس زبیت میں کچھ غم نہیں وہ زبیت تیری
ہر سانس تجھے دیتی ہے پیغام پیے جا
تیرے ہی لیے ساری فضا بھوم رہی ہے
تیرے لیے ہے وجد کا ہنگام پیے جا
تجھ کو تو انا بحق کی صدا ڈھونڈ رہی ہے
منصور کے سایے میں سر بام پیے جا
ان ہوش کے بندوں میں ترا نام نہیں ہے
گناہ ہی اچھا ہے تو گناہ پیے جا

نگاہ تو نے ڈال دی تو زندگی نئی ملی
نگاہ تو نے پھیر لی، فسانہ ختم ہو گیا
جفا پرست دوست کو دفا پرست کیا کریں
مزاجِ سخن ہی تو ہے بدل گیا بدل گیا

اگر شعورِ عشق ہے تو زندگی حسین ہے
خوشی ملی تو کیا ہوا، جو غم ملا تو کیا ہوا

اے مری جان تغزل! اک ادائے لبری
اب تو ایمانِ محبت ہے، نگاہِ کافی
اے مری جان تمنا! اے مری جان نظر!
قبلہ تسلیم تیری خود نمائی، خود سری
پھر تری موجِ تبسم کی طرت رقصاں ہوں
پھر فریب آرا ہوئی تیری نگاہِ سامری
پھر مجھے لے جا کے اس منزل پہنچا ہے جہاں
ہر نظر ہے فتنہ پردہ، ہر ادا جادوگری

ہم اہل غم ہمارے کو حیات کہتے آئے ہیں
ستم کی ہر ادا کو التفات کہتے آئے ہیں
خوشی ملی خوشی ہی، جو غم ملا تو غم ہی
تمہاری دین کو تبرکات کہتے آئے ہیں

جہاں کے ڈرے ڈرے میں تمہارا حسن پہنچا اسی جہاں کو لوگ بے ثبات کہتے آئے ہیں
 جنوں کو ساتھ میں لیے، بخود کی ساد پر، ہمیشہ قیس اپنے دل کی بات کہتے آئے ہیں
 متفرق اشعار

نہ پوچھ مجھ سے ابھی، صبح زندگی کیا ہے تجھے بتاؤ نگاہ، اے دوست! اپنی شام کے بعد

غینہ و گل ٹوٹے، بولے محبت نہ ملی دوست بھی ایسے ملے، جن سے طبیعت نہ ملی

امید یہ دنیا قائم ہے، اور مجھ کو کوئی امید نہیں جو مجھ کو ملا دیتی تم سے، قسمت میں مری وہ عید نہیں

مانا کہ گلوں کے دامن میں یہ رات بسر ہو چکی جب صبح کی کرنیں پھونگی، اے قطرہ شبنم! کیا ہوگا؟

سلتے نہیں مرا، آج دل بے قرار کے دیوانہ جب سے کہہ دیا تم نے پکار کے

انہیں کو پیار کیا میں نے تیرے دھوکے میں جہاں جہاں تری پر چھائیاں ملیں مجھ کو

مریم وقت کی پکار آج بھی ہو اسی طرح عیسیٰ اترے صلیب کی رات بہت اداں سے

اختر تلہری، سید اختر علی

ضلع شاہجہاںپور میں ایک قصبہ تلہر ہے؛ یہیں شیعہ سادات کے ایک ممتاز دینی گھرانے میں ۲۱ اپریل ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے خاندان کے ماحول اور روایات کے پیش نظر مذہبی رہی اور اس میں تکمیل کے درجے تک پہنچے۔ وہ مدرسہ عالیہ رامپور کے فارغ التحصیل تھے۔ عربی، فارسی کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی اتنی اچھی مہارت پیدا کر لی کہ انگریزی کی اعلیٰ اور دقیق کتابوں سے بلا تکلف استفادہ کر سکتے تھے۔ ان تینوں زبانوں میں ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ذریعہ معاش مدرسہ تھا۔ ۱۸۵۰ برس تک جوہلی کالج لکھنؤ میں پڑھاتے رہے اور یہیں سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ افسوس کہ انھیں سازگار ماحول میسر نہ ہوا اور ان کی قابلیت اور جولانی طبع کو اپنے جوہر دکھانے کے لیے پورا میدان نہ ملا، ورنہ جس پایے کے وہ محقق اور ادیب، نقاد اور ماہر لغات تھے، ہماری زبان کا دامن ان کی نگارشات سے مالا مال ہو سکتا تھا۔

جوہلی کالج میں ان کے ہمکاروں میں حامد اشرف (اردو) اور علی عباس حسینی (زبان)

اور خواجہ اہل حسین (انگریزی) تھے۔ خواجہ اہل حسین نے ایک زمانے میں ماہانہ ادب (لکھنؤ) میں کچھ مزاحیہ مضامین بھی لکھے تھے، جن میں سالی، سرود، ہمایہ وغیرہ نے خاصی شہرت پائی۔ ادب کے ایڈیٹر اعظم حسین تھے۔

اسی زمانے میں سیسوں میں دو فریق ہو گئے: علماء اور جدیدی۔ اختر، سجد آزاد خیال تھے اور قدامت کے مخالف؛ چنانچہ انھوں نے جدیدی گروہ کی تائید کی۔ اہل حسین اور علی عباس حسینی بھی اس میں ان کے ساتھ تھے۔ انھیں ایام میں اہل حسین نے مجرب کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں روایتی نظریے سے انحراف تھا۔ اس کا جواب فیضیوں کے کالج سلطان المدارس کے مدرس مولوی سید عبدالحمین منطقی نے دیا۔ پھر تو سخت رن پڑا۔ اس مناقشے میں اہل حسین کو سارا مواد اختر صاحب نے ہی کیا تھا۔

اگرچہ حکومت کے ملازم تھے، لیکن شدید قوم پرور؛ مدتوں روزنامہ سرفراز (لکھنؤ) میں 'سردلبر' کے عنوان کا مزاحیہ کالم "گل افشاں کے قلم سے" لکھتے رہے۔ حسینی بھی کبھی کبھی ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان مضامین میں یہ لوگ جی کھول کر حکومت کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ سرفراز شیعہ کانفرنس کا اخبار تھا، اور خواجہ اسد اللہ اسد اس کے ایڈیٹر تھے۔ کانفرنس میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا اور وہاں دو پارٹیاں بن گئیں۔ اس کشمکش میں اسد کی نوکری کے ماتھے گئی۔ اسد نے خیال کیا کہ اختر اور حسینی بھی ان کے مخالف ہیں۔ انھوں نے بدلہ لینے کی خاطر ان کے وہ مسودات جن میں ان لوگوں نے حکومت پر کتہ چینی کی تھی، حکومت کے حوالے کر دیے۔ پھر کیا تھا، تہلکہ مچ گیا اور دونوں ملازمت سے الگ کر دیے گئے۔ شیعہ رؤسا کا حکومت میں بہت رسوخ تھا۔ ان کے دوستوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ بار نے، حکومت نے برطرفی کا حکم واپس لے لیا اور بات تبادلے پر ٹل گئی۔ حسینی غازی پور بھیجے گئے اور اختر شاہجہانپور۔

وہ مدتوں سرفراز میں 'مجاہد' کے عنوان کے تحت "مبصر" کے نام سے تبصرے اور

علمی، ادبی بحکات بھی لکھتے رہے۔ لعنت پر ماہرانہ قدرت تھی اور حافظہ بے پناہ تھا۔ مراج کے دیکھے بغیر قلم برداشتہ ایسا مقلد و دل لکھتے تھے کہ اعتراض کسی کے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے کئی معرکے یادگار ہیں، جن میں حامد الشرافسر اور مجنوں گورکھپور سے حقیقتاً خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مذہب کے بارے میں ان کی رد و اداری ضرب المثل تھی۔ اختلاف خواہ ملک کے دو طبقوں میں ہو یا مسلمانوں کے دو گروہوں میں، وہ ان دونوں کے مخالف تھے۔ ان کی تحریریں اسی نظریے کی ترجمان تھیں۔ ان کی کتابیں ابتلائے عظیم (۱۹۲۵ء)؛ شہادت عظمیٰ (۱۹۳۰ء)؛ مذہبی تصورات (۱۹۵۳ء)؛ علوی تصورات (۱۹۵۴ء)؛ مولانا مودودی کا اسلامی نظریہ سیاست؛ شعروادب؛ تنقیدی شعور (۱۹۵۷ء)؛ مقالات تلہری؛ اور انگریزی کتاب آئیڈل کنگ جہاں ان کے علم کی وسعت کی آئینہ دار ہیں، وہیں ان کے فکر کی گہرائی پر بھی بران قاطع ہیں۔ ان کے سینکڑوں مضامین مختلف رسائل و جرائد میں منتشر پڑے ہیں۔ خاص طور پر اقبال کی شاعری اور فلسفے پر انھوں نے بہت اہم سلسلہ مضامین قلمبند کیا تھا۔ وہ کبھی کبھی شعری کہتے تھے، اختر تخلص تھا۔ افسوس کہ مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

وہ بہت دن سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ انھیں مدت سے فشارِ دم کا تکلیف دہ عارضہ لاحق تھا۔ اور جب اس کا دورہ پڑتا تھا، وہ ازکار رفتہ ہو جاتے تھے۔ پارساں اپریل میں دل نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ جب حملہ ہوا، تو بلرامپور اسپتال، لکھنؤ میں علاج کی غرض سے داخل ہوئے اور اچھے ہو کر واپس مکان پر آ گئے۔ لیکن اب سیدھا ہاتھ اور پاؤں مفلوج ہو گئے۔ ساتھ ہی پیٹ میں ایک گلی نمودار ہو گئی، جو ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق کینسر ثابت ہوئی۔ جب حالت خراب ہونے لگی، تو دوبارہ بلرامپور اسپتال چلے گئے۔ وہیں بدھ کے دن ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء صبح پونے چھ بجے اللہ کو پیارے ہوئے۔ اسی

دن جدِ خاکِ شاہجہاںپور منتقل کیا گیا، جہاں شام کو خاندانی قبرستان واقع ہمہ گڑھی میں تدفین عمل میں آئی۔

دو بیٹے آفتاب اختر اور سہیل اختر، اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار بھڑے۔ بڑے بیٹے آفتاب اختر گاندھی انسٹرکالج، شاہجہاںپور میں مدرس ہیں۔ نوٹہ کلام ملاحظہ ہو:

میرا سجدہ قیدیِ سنگِ درِ جانانہ ہے
میرا تاناہی رہے جو حادثاتِ دہشتور
پارہے ہیں اس سے اک تازہ حیاتِ اہلِ حق
ہے شہیدانِ وفا کی خاک اور بھگدڑ
عقل و دانش کے جنوں کی بدحواسی کچھ نہ پوچھ
تو نے خود ہی تو خیالِ ماسوا کو دی جسگہ
کھول ڈالے باتوں ہی باتوں میں اسرارِ حیات
دین سے مطلب نہیں دنیا سے میں بیگانہ ہوں
نہیں ہر برشِ تیغِ بجا وہ میرے قاتل کی
مرا عشقِ جنوں مشربِ ستم سے دب نہیں سکتا
ابھی گوداب کی طوفاں نفسِ موجوں سے لڑنا ہو
مقدّر اس کا ہے پامالِ کامِ رہرواں ہونا
کہیں سے تیشہ فرما دلِ جائے تولطف کے
پچھاتا ہو زمانہ راہ میں کس شوق سے نکھیں
بہارِ گلشنِ ہستی سہلے کیا لگا ہوں میں !
گلگوں کا رنگِ بوجتِ بدماں ہی سہی لیکن
سدا ہی عشق نے آخر مری وہ شانِ خودداری

توبہ : ذوقِ بادہ، رہنِ شیشہ دِ پیانہ ہے
ایسا دیوانہ حقیقت میں بڑا فرزانہ ہے
وہ ترے شورِ پیدہ سر کا نغمہ ستانہ ہے
کیش اپنا بند گئی سمیت مردانہ ہے
ہے کھبی پیشِ نظر کعبہ کھبی بت خانہ ہے
ورنہ تیرا دل تو اس کا خاص خلوت خانہ ہے
یوں تو کہنے کو یہ مردِ باخدا دیوانہ ہے
سامنے آنکھوں کے اختر جلوہ جانا نہ ہے
نگاہِ حسرت آگیاں دیکھ لی کیا اپنے بیل کی
ہیں زندانِ بلا میں وہی آزادیوں دل کی
ابھی مجھ کو نہیں ہے فکرِ عشرت گاہِ ساحل کی
خبر کیا خاکِ جاوہ کو طربہاے منازل کی
بہت یاد آرہی ہے اس بُتِ شیریں شامل کی
زرا توقیر دیکھو اپنے پابندِ سلاسل کی
حیاتِ مختصر دیکھے ہوئے ہوں شمعِ محفل کی
مرے کانوں سے ٹکراتی ہیں فرادیس غداں کی
چلا ہوں پھر اسی ظالم سے کہنے داتاں کی

خبر بھی ہو تجھے! ہر طلعت اکھٹا نفع! ترے جلوؤں کی ہیں شتاق نظریں اہل عقل کی
ہے اختر! ذوق خود ہی رہا اس صعب ل میں تجھے حاجت نہیں فنِ توانی و فواصل کی
جنت جو تھی مرے لیے جنت نہیں ہی یعنی چمن مزاج طبیعت نہیں رہی
پامال حادثات ہے گلچین نظر میرے خیال و فکر میں نہرت نہیں رہی
باد بہار ہے تو خرا ماں چمن حسن لیکن گلوں میں پہلی سی نکھت نہیں رہی
اس انقلاب دہر کی یزنگیاں نہ پوچھ دنیاے رنگ و بو کی وہ صورت نہیں رہی
شوریدگی فکر کی! شیرری جراتیں! حد بندی حجاز و حقیقت نہیں رہی
جب سے سنی ہے طور و بجلی کی داتاں تم سے نظر ملائے کی ہمت نہیں رہی
اب تنکدے سے کعبہ کی جانب ہو میرا رخ کیا وہ صنم فواز طبیعت نہیں رہی
اک لعل شب چراغ ہے ضرور یزد و فوگلن اب میرے غمکدے میں وہ ظلمت نہیں رہی
یہ پیش بندیاں ہیں کسی انقلاب کی سرین دیا سمین کی وہ رنگت نہیں رہی
ہندوستان کا ہر ہے اختر! عروج پر وہ سرورانِ عصر میں نخوت نہیں رہی

قطعات

بلند حوصلگی

گرداب کے نظائے سے ادا کپنے والے! بھری ہوئی موجوں میں بھی گھر کر میں ہنس اہو
ہے سبیلِ حوادث جو بلا خیز، تو کیا ڈر میں برق سے آندھلی سے سمندر سولا ہو

خوش منشی ساند

خوش منش رندا ہیں اب دیرِ حرم کی زینت زائد تنگ نظر کے لیے ناداں ہی سہی
دانشِ عصر ہے کیا ان کی روش پر خداں! محرم راز تو ہیں، چاک گھریاں ہی سہی
دماغِ نظرتِ خود دار، ہمنشینِ امت پوچھ کسی کا ڈر سہی، بھگتی نہیں جس میری
غورِ اہل ریاست پہ مسکراتا ہوں ہے ان کے عرش سے بالا کہیں زمیں میری

حبیب اشعر دہلوی، حکیم حبیب احمد

حکیم حبیب احمد اور حکیم اجل خان مرحوم یک جدی تھے۔ وہ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، ہر طرح کی فراغت تھی، اس لیے جوانی تک بہت عیش و آرام سے بسر ہوئی۔ اگرچہ قرآن، عربی، فارسی سب علوم کی تعلیم خاص اساتذہ سے حاصل کی تھی، لیکن طبیہ کالج سے تکمیل کے بعد اپنی خاندانی رودائیت کے پیش نظر طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا، تو یہ بھی لاہور چلے گئے۔ اس کے بعد گردشِ روزگار نے گویا ان کا گھر دیکھ لیا۔ وہ اطمینان اور فارغ البالی جو شروع سے ان کے گھر کی لونڈی تھی، دلی پھوٹے ہی ساتھ چھوڑ گئی۔ لاہور میں مطب قائم کیا، اور کئی مرتبہ مختلف اخباروں میں طبی کالم لکھتے رہے؛ اپنا ماہانہ طبی اور ادبی رسالہ 'حاذق' نکالا، متعدد عربی کتابوں کے مستند ترجمے شائع کیے، فلموں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ لیکن اتنے پاپر سیلنے کے باوجود معاشی تنگی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ نہ طبابت کے پیشے میں کوئی کامیابی نصیب ہوئی، نہ ادب و شعر نے کوئی فائدہ پہنچایا۔

۱۵ جون ۱۹۷۱ء رات کو لاہور میں قید حیات دہندہ غم دونوں سے نجات ملی۔ خاندان شریفی کے ذاتی قبرستان گلبرگ لاہور میں سپرد خاک ہوئے۔ مشہور لبنانی مصنف اور شاعر خلیل جبران کی متعدد کتابوں کے ترجمے کئے تھے، جو چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: ٹوٹے ہوئے پر، شیطان، دلہن کی سیج، بنفشہ کا بھول، ریت اور بھاگ، اشک و شبنم، پکار۔ ان کے علاوہ مصری افسانہ نگار مصطفیٰ لطفی منقلوطی کے یہ ترجمے چھپے ہیں: رخسار، تاج، شہناز، مصر کے دوسرے شہرہ آفاق مصنف محمد حسین ہیکل کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے مثلاً عمر فاروق عظیم۔ شعر بھی کہتے تھے، اشعر تخلص تھا۔ ان کا مختصر مجموعہ کلام 'راز و نیاز' کے عنوان سے قبل تقسیم ملک شائع ہوا تھا (دولت ۱۹۳۹ء)۔ کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

بطور نمونہ ان کا کچھ کلام ملاحظہ ہو:

روح فرسا کوئی نالہ دلِ ناشاد اکوئیں آج تجھے آج غمِ شوق سے آزاد کر۔ میں اہل دل جلووں میں ان کے آج اشعر اچھوئے بیقرار ان ازل کو بھی قرار آہی گسیا نہ ہو مسرت میں غم کا پہلو، تو زندگی میں مرا نہیں ہے میں اس کو دل ہی نہیں سمجھتا، جو درد سے آشنا نہیں ہے بنو! یہ بیدار بے سبب کیوں، کرم کی امید پر غصبت کیوں؟ تم ایسے پیش آرہے ہو ہم سے، ہمارا جیسے خدا نہیں ہے زمیں بھی دشمن، فلک بھی دشمن، تمام عالم خلافت، لیکن مجھے تو اس بات کا ہے رونا، تمہیں بھی خوفِ خدا نہیں ہے! مرے حق میں آہی! یہ جفا، دوست کیا کم ہے

مری تقدیر سے وابستہ دورِ آسماں کیوں ہوا
جوشِ خشت میں چھادہ در بھی سجده بھی گئے
کام کی باتیں بھی نذرِ ہوا، نیاں ہو گئیں

اب یہی دل ہو پریشان و پشیمان کیا کیا
 اَنَا لَمْ أَتُحْ، ثُمَّ بَاذَنِي، لَنْ تَرَانِي، اَنَا لَمْ يَلْبَسْ
 اس کی کجخت نے ربط اس سے کیا خود پیدا
 کئی عنوان سے مشہور ہوا کہ داستان اپنی
 دنیا کو دیکھ دیدہ بنا لیے ہوئے
 ہر ذرہ ہے جہاں تماشا لیے ہوئے
 تو، اور میرے لیے سے بھی تجھ کو اعتراض
 میں، اور دل میں تیری تنائے ہوئے
 اب ہم ہیں اور کشمکش اضطرابِ دل
 وہ دن گئے کہ دعویٰ صبر و قرار کھٹا
 شاید ہے انتہائے محبت اسی کا نام
 تم پاس تھے، تو ادھر بھی دل بیقرار کھٹا
 ہر ذرہ ہے سطر نور یہاں، ہر تپا ہے نخلِ طور یہاں

اب جائے بھی، تو جا کر سوے دادی این کیا کیجے
 یہ موجِ چمن، یہ موسمِ گل، صیاد پر اب بھی زور نہیں

اس وقت ہے ایک اک شاخ یہاں شایانِ نشین، کیا کیجے
 دل میں خوفِ خدا تو ہے، اشعر! میں اگر بارسا نہیں، نہ سہی
 سو سو بناؤ ہیں، ترے اک اک بگاڑ میں بس پھیر چھیر، کمر تجھے دیکھا کرے کوئی
 ہو گیا ترکِ محبت کو زمانہ، اشعر! خواب کی طرح کبھی اس کا خیال آتا ہو

محمد حبیب (پروفیسر)

لکھنؤ کے ممتاز خاندان شیوخ کے نام لیوا تھے۔ اس خاندان نے زندگی کے ہر شعبے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر حبیب کے والد جناب محمد نسیم (ف ۱۹۵۵ء)، اپنے زمانے کے مشہور دیوانی وکیل تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے اور تینوں نے اپنے اپنے میدان میں بڑا نام پایا۔ بڑے محمد نسیم تھے۔ یہ اپنے والد سے بھی بڑے نامی وکیل ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہاں کافی دن ایڈووکیٹ جنرل کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ ان کا ۱۹۵۱ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ دوسرے بیٹے پروفیسر محمد حبیب تھے؛ اور تیسرے سب سے چھوٹے پروفیسر محمد حبیب، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ ہیں۔ خدا انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

پروفیسر محمد حبیب ۶ جون ۱۸۹۵ء کو اپنے آبائی مکان (قصر باغ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے؛ یہ مکان اب مہندم ہو چکا ہے، ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ۱۹۰۷ء میں ایم اے اوکا جیٹ اسکول میں داخل ہوئے اور یہیں سے ۱۹۱۶ء میں بی اے کیا، اس سال یہاں سے درجہ اول میں پاس ہونے والے وہ واحد طالب علم تھے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہو کہ

۱۹۱۵ء میں اپنے اسکول کے قرآن کی پڑھائی، معافی، تشریح وغیرہ کے امتحان مقابلہ میں وہ اول آئے تھے اور تمغین (مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد) نے انہیں پہلا انعام دیا۔

یہاں سے بی اے کرنے کے بعد وہ ولایت گئے اور نیوکالج، آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں بی اے (آنرز) کی سند پائی، یہاں مشہور مؤرخ سر رابرٹ سٹوڈن کے استاد تھے۔ اب پنڈت موتی لال ہنر کے بلاوے پر وہ ہندستان آئے۔ پنڈت جی چاہتے تھے کہ وہ ان کے جاری کردہ انگریزی روزنامہ انڈیا پنڈنٹ (دھنڈو) کے ادارہ تحریر میں شامل ہو جائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ واپسی پر وہ علی گڑھ ہی میں ۱۹۲۲ء میں پہلے ریڈر اور سال بھر بعد ۱۹۲۳ء میں پروفیسر شعبہ تاریخ ہو گئے۔ جب پولیٹیکل سائنس کا شعبہ کھلا، تو وہ اس نئے شعبے میں پروفیسر مقرر ہوئے؛ تاہم تاریخ کے لیے کسی اور صاحب کا تقرر عمل میں آیا حبیب صاحب ایک مرتبہ علی گڑھ پہنچ کر پھر عمر بھر یہاں سے نہیں نکلے۔

ان کی پوری زندگی علم کی خدمت میں بسر ہوئی؛ خاص طور پر تاریخ ان کا موضوع رہا۔ انھیں ہندستان کے عہدِ وسطی (اسلامی دور) کی تاریخ سے خاص شغف تھا۔ اور ان کا اس کے ماہرین میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں آج جو اس عہد کی تاریخ سے اتنی دلچسپی لی جا رہی ہے اور یہ دور خاص طور پر مطالعے اور تحقیق کا موضوع بن گیا ہے، تو اس میں مروجہ پروفیسر حبیب کی مساعی کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ نہیں۔ اور جو ہیں، وہ بھی بیشتر اسی عہد کے متعلق ہیں۔ لیکن جو کچھ لکھا ہے، وہ مستند ہے اور ہم آج تک اس پر اسناد نہیں کر سکے۔ ان کی کتاب سلطان محمود غزنوی پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے جرات بخونی سے سلطان محمود کے کردار اور عمل کو خلافتِ اسلام قرار دیا۔ اس پر معترضین نے ان کی بہت مخالفت کی؛ خاص طور پر اردو اخباروں میں بڑے جوشیے مضامین چھپے۔ لیکن

انھوں نے اس کی ذرہ برابر پروانہ کی اور اپنے نقطہ نظر بدبختی سے قائم رہے۔ چنانچہ جب اس کتاب کا ۱۹۵۲ء میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، تو اس میں ایک لفظ کی کمی بیشی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں ہمات علاء الدین خلجی (۱۹۲۶ء)؛ حضرت امیر خسرو دہلوی (۱۹۲۷ء)؛ ہندستان ماقبل حملہ غوری (۱۹۳۰ء)؛ نظم و نسق ابراہیم (۱۹۳۲ء)؛ دلی سلطنت کا سیاسی نظریہ؛ اسلامی تصوف کا آغاز (شانتی نکلین یونیورسٹی میں نظام لیکچر (۱۹۳۶ء)؛ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۳۸ء) ہیں۔ یہ سب کتابیں اولاً انگریزی میں شائع ہوئیں؛ بعد کو ان میں سے بعض کے اردو ترجمے بھی ہوئے۔ ابھی پچھلے سال انھوں نے تاریخ ہند (عہد سلطنت) پر ویسلی خلیق احمد نظامی کی شرکت میں شائع کی تھی۔ اس میں مغلیہ دور سے پہلے کی سلطنت دلی (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) کے حالات پوری شرح و بسط سے بیان ہوئے ہیں، نیز صوبائی حکمران خاندانوں کا تذکرہ بھی ہے۔ پانچ سال (۱۶-۱۷ مارچ ۱۹۷۰ء) انھوں نے دلی یونیورسٹی میں حضرت نظام الدین اولیاء کی سیرت اور تعلیمات سے متعلق اردو میں نظام لیکچر دیے تھے۔ یہ ہندوستانی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔ ان پر بھی بعض حلقوں سے اعتراض کی آواز اٹھی تھی۔ لیکن جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے، اس کے اعلان میں انھوں نے کسی کے ڈر سے کبھی تذبذب کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے میدان میں اسکی امتیاز کے باعث انھیں انڈین ہسٹری کانگریس کی صدارت پیش کی گئی (۱۹۳۶-۱۹۳۷ء)

وہ بہت دن سے ضیاء الدین برنی کی مشہور تاریخ فیروز شاہی کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ عرصے سے صحت بھی خراب چلی آ رہی تھی اور کتاب ضخیم ہے؛ اس لیے ترجمے کا کام بہت آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ قدرتنا انھیں تشویش تھی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میری دلی تمنا ہے کہ میں مرنے سے پہلے یہ ترجمہ مکمل کر لوں۔ خدا نے ان کی سُن لی۔ یہ ترجمہ ان کے انتقال سے تین چار دن قبل پورا ہوا۔

انہوں نے کسی زمانے میں انگریزی میں افسانے بھی لکھے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ :

Desecrated Bones and Other Stories

کے عنوان سے پھپ چکا ہے۔

غرض وہ اپنے کام کے لیے جیسے۔ انہوں نے ساری عمر علم اور طالب علم کی خدمت میں گزاردی۔ اپنے شاگردوں سے بچہ محبت تھی اور وہ ان کی دلتے، دلتے، قدحے ہر طرح مدد کرتے رہتے تھے۔ کئی طلبہ ان سے باقاعدہ وظیفہ پاتے تھے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے امتحان کے پیچھے جانچنے کی ساری آمدنی وہ اسی کارِ خیر میں صرف کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ جب کوئی طالب علم ان سے ملنے کو جاتا، تو وہ اندر سے جیب میں روپیہ اور ہاتھ میں کاغذ قلم لیے برآمد ہوتے کہ آنے والا یا تو مالی امداد کے لیے آیا ہوگا یا کسی جگہ کے لیے سفارشی خط لینے کو۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آگیا:

چند سال ادھر کی بات ہے، مسلم یونیورسٹی میں کوئی جلسہ ہوا۔ جلسے کی صدارت اس زمانے کے وائس چانسلر جناب طیب جی فرما رہے تھے اور حبیب صاحب کو تقریر کرنا تھی جیسا کہ دستور ہے، صدر جلسہ مقرر کا تعارف کرانے کو کھڑے ہوئے۔ طیب جی علی گڑھ جانے سے پہلے ملک کی فارن سروس کے ممتاز رکن تھے، اور اسی باعث ہماری وزارتِ خارجہ میں سکتر کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ بیشک، حبیب صاحب کو اپنے طلبہ سے بہت محبت ہے، لیکن بااوقات وہ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا لحاظ نہیں کرتے۔ چنانچہ میرا تجربہ ہے کہ جب میں وزارتِ خارجہ میں تھا تو ایک ہی اسماعیلی کے لیے متعدد نوجوان میرے پاس پہنچتے اور ہر ایک کے ہاتھ میں حبیب صاحب کا سفارشی خط ہوتا۔ اس پر تہقہ ملند ہوا۔ ان کے بیٹھ جانے کے بعد حبیب صاحب اٹھے۔ فرمایا: وائس چانسلر صاحب کی تقریر آپ نے سنی، اس پر مجھے ایک پرانی بات یاد آگئی۔ جب میں یہاں نیا نیا آیا، تو ایک دن دفتر پہنچنے پر وائس چانسلر صاحب سر شاہ محمد سلیمان

کا ایک گشتی مراسلہ موصول ہوا۔ لکھا تھا: دیکھا گیا ہے کہ یونیورسٹی کے طلبہ عام طور پر نماز باجماعت نہیں پڑھتے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ خود بخود مسجد میں آکر نماز پڑھیں تاکہ ان کی مثال سے طلبہ کو بھی باجماعت نماز ادا کرنے کی ترغیب ہو۔ میں اس زمانے میں نماز روزے کا بہت پابند تھا، اور اس میں شاذ و نادر ہی قصا ہوتی تھی۔ میں نے جب یہ گشتی مراسلہ دیکھا، تو مجھے اس مداخلت بیجا پر بہت غصہ آیا۔ میں نے اس پروائس چانسلر صاحب کی خدمت میں لکھا کہ نماز کا معاملہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ہے، میں اسے جیسے چاہوں، پڑھوں۔ میں کسی شخص کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میرے اور میرے خدا کے درمیان حائل ہو۔ چنانچہ اس دن سے میں نے مسجد کی نماز ترک کر دی۔ کچھ اسی طرح کی بات آج موجودہ وائس چانسلر صاحب نے کہی ہے۔ میں ان سے صرف اتنا کہوں گا کہ میں کسی شخص کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ میرے اور میرے طلبہ کے درمیان حائل ہو۔ اس پر پہلے سے بلند تر فرقہ پڑا۔

جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے، تو انھیں امیر ٹیس پروفیسر مقرر کیا گیا اور ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔

اسی جذبے کے تحت انھوں نے ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ ”شع“ آگرہ سے شائع کو نام شروع کیا تھا۔ اس کا مقصد بھی اپنے ایک معذور وکیل دوست کی مدد کرنا تھا۔ یہ غالباً دو برس تک جاری رہا۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے، وہ اس کے مضامین کی بلندی اور طباعت کتابت کے اونچے معیار کی شہادت دینگے۔

وہ سیاست کے آدمی نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے بعض اوقات عملی سیاست میں حصہ لیا! ۱۹۴۶ء میں وہ یونی کی مجلس وضع قوانین کے لیے سورا جیہ پارٹی کے ٹکٹ پر امیدوار کھڑے ہوئے اور سلطانیور حلقے سے منتخب ہو گئے۔ وہ ۱۹۳۱ء تک اس اسمبلی کے رکن رہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں وہ اقوام متحدہ دیو این میں

ہندوستانی وفد کے ساتھ پیرس گئے تھے؛ وہ اس وفد کے دوسرے لیڈر تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ہمارے یونسکو وفد (پیرس) کے بھی رکن تھے۔ ۱۹۵۱ء ہی میں ایک خیرگالی وفد چین گیا تھا۔ پنڈت سندر لال اس کے لیڈر تھے۔ پروفیسر حبیب اس وفد میں شامل تھے۔ پروفیسر حبیب بھی اس وفد کے رکن تھے۔ حبیب صاحب نے داپسی پر اس سفر سے متعلق ایک کتاب بھی انگریزی میں لکھی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں حبیب صاحب رومانیہ کی حکومت کی دعوت پر بوڈاپسٹ بھی گئے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جب ہندوستان کے صدر اور نائب صدر کا انتخاب ہوا، تو بعض دوستوں کے اصرار پر حبیب صاحب نے نائب صدر کے عہدے کے لیے اپنا نام دے دیا تھا، لیکن یہ اسی وقت جب انھیں اطمینان دلا یا گیا کہ ان کے منتخب ہو جانے کا کوئی احتمال نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں علی گڑھ کا قیام کسی صورت میں ترک کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ جب وہ واقعی ہار گئے، تو بہت خوش تھے اور اطمینان کا سانس لے کر فرمایا کہ شکر ہے، رسیدہ ہو دہلی، ورنہ بخیر گزشت۔

طبیعت سجدہ مرخاں مرنج پائی تھی۔ ان کی سادگی اور بنفشی کے بیشمار واقعات زبازند ہیں۔ خدا کے اس نیک بندے کا ۲۲ جون ۱۹۷۱ء شام کے آٹھ بجے علی گڑھ میں انتقال ہوا۔ اگلے دن جنازہ اٹھا اور یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اپنے پیچھے جہانی یادگار دو بیٹے چھوڑے: بڑے کمال حبیب، یہ پاکستان میں ہیں۔ چھوٹے عرفان حبیب صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں پروفیسر ہیں۔

تسکین قریشی، محمد حسین

ان کا خاندان دراصل سہوان کا رہنے والا تھا۔ سوردن (ضلع ایٹہ) کے مغلوں اور سہوان کے قریشیوں میں آپس میں رشتے داریاں ہوتی تھیں۔ چنانچہ تسکین صاحب کی سگڑدادی سوردن کی تھیں۔ ان کے دواڑے کے بھٹے، بڑے رفعت اللہ اور ایک ان سے بھوٹے۔ والدہ ان دونوں کو ساتھ لے کر اپنے میکے سوردن آگئیں۔ یہی رفعت اللہ جناب تسکین کے پردادا تھے۔ یہاں منجملہ اور ارضی کے گوجر پوران کی جاگیر میں تھا، اور یہ زمینداری کے خاتمے تک خاندان کے قبضے میں رہا۔ رفعت اللہ سہوان جاتے آتے رہتے تھے۔ سوردن کی مستقل سکونت تسکین کے دادا گل حسین صاحب کے زمانے سے شروع ہوئی۔ زمینداری، کاشتکاری ان کا ذریعہ معاش تھی۔ تسکین کے والد سخاوت حسین صاحب نے پولیس میں ملازمت اختیار کر لی۔ تنہا داری سے پنشن پائی۔ ان کا ۵ سال کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا۔ سوردن ہی میں دفن ہے۔

تسکین صاحب جنوری ۱۸۹۹ء میں سوردن میں پیدا ہوئے۔ اگرہ گورنمنٹ

اسکول سے ۱۹۱۷ء میں دسویں درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے سینٹ انڈیووز کالج، گورکھپور میں داخلہ لیا۔ ان کے بڑے بھائی عبدالواسع اس زمانے میں گورکھپور میں ایئر کلکٹری تھے؛ انھیں کے ساتھ قیام رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ گورکھپور میں تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ ہوا ہی اس لیے تھا کہ بڑے بھائی وہاں مقیم تھے۔ ۱۹۲۱ء میں پولیس کے محکمے سے ملازمت مل گئی اور ترقی کرتے کرتے اوڈا پولیس ٹریننگ کالج میں پروفیسر ہوئے، اور آخر کار لکھنؤ میں سی آئی ڈی پبلک پراسیکیوٹر۔ یہیں سے ۱۹۵۲ء میں نیشن پر ملازمت سے سبکدش ہوئے۔ انھوں نے جس دیانتداری اور احساسِ فرض اور وضعداری سے ملازمت کا زمانہ بسر کیا، اس پر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ نیل کے مسکے سے بے داغ نکل آنا آسان، لیکن پولیس کی ملازمت سے ملوہ بچ نکلنا غیر ممکن؛ لیکن انھوں نے یہ کر دکھایا۔ خدا جسے توفیق دے! ملازمت کا زیادہ زمانہ سہارنپور میں بسر ہوا، یہاں چودہ برس (۱۹۳۰ء - ۱۹۴۳ء) قیام رہا۔ نیشن کے بعد مستقل قیام میرٹھ میں اختیار کیا۔

یہیں میرٹھ میں ۱۹۵۵ء میں میری ان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ میں اس زمانے میں تلامذہ غالب کی تکمیل کی فکر میں سرگرداں تھا۔ اس سلسلے میں میرٹھ بھی پہنچا۔ یہاں غالب کے دو شاگرد تھے: اسماعیل میرٹھی اور رنج میرٹھی۔ اسماعیل میرٹھی کے صاحبزادے جناب اسلم سیفی مدظلہ سے ملاقات ہوئی۔ ان سے دیر تک گفتگو رہی۔ جب میں نے سرشام اجازت چاہی تو پوچھا: اب کہاں جائینگے؟ میں نے عرض کیا کہ مجھے حکیم فصیح الدین رنج کے حالات کی تلاش ہے، اب انھیں کے ہاں جانے کا ارادہ ہے۔ فرمایا: میں ان کے پر پوتے حکیم سیف الدین احمد کو یہیں بلواتا ہوں، قریب ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ٹیلیفون کیا اور حکیم سیف سلمہ پہنچ گئے۔ اسلم سیفی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا، اور چند منٹ بعد ہم اٹھ کر سیف صاحب کے مکان (اور مطب) پر آگئے۔

تسکین صاحب وہیں پڑوس کے مکان میں رہتے تھے، بلکہ ان کا مسکن اسی احاطے میں تھا، جس میں سیف صاحب کا مطب ہے۔ سیف نے انھیں بلوایا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تسکین صاحب بہت مٹین اور سنجیدہ مزاج آدمی تھے، بہت آہستہ آہستہ اور ایک ایک لفظ صاف صاف کہہ کر بات کرنے والے۔ یہ غالباً ان کی مدد العمر کی پولیس کے محکمے کی ملازمت کا نتیجہ تھا۔ آخر میں انھوں نے میری درخواست پر بہت کچھ تکلف کے بعد اپنی دو غریب لیس سائیں۔ میں کلام کی بلندی پر دنگ رہ گیا۔ تسکین صاحب کو شعر و سخن سے دلچسپی بچپن کی بیت بازی سے شروع ہوئی۔ یوں سینکڑوں ہزاروں شعریاد ہو گئے۔ کبھی کبھی بیت بازی کے دوران میں ناطقہ بند ہونے لگتا، تو یہ اپنی طرف سے تنگ ملا کے کچھ سنا دیتے۔ رفتہ رفتہ خود بھی شعر کہنے لگے۔ آغاز میں کلام اپنے کچھ بھائی زاد بھائی مولوی محمد محفوظ کو دکھایا۔ محفوظ زیادہ تر نعت کہتے تھے۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ دیوان محفوظ کے عنوان سے موجود ہے۔ پھر ۱۹۱۶ء۔

۱۹۱۷ء کے دو سال انھوں نے مولوی سید حسن مرتضیٰ شفیق تھانوی (مت ۱۹۳۲ء) سے اصلاح لی۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں مرزا محمد ادری عزیز لکھنوی کے شاگرد ہو گئے اور یہ سلسلہ عزیز کی وفات (۱۹۳۵ء) تک جاری رہا۔

تسکین کا کلام بہت بلند اور پایدار ہے۔ سارا کلام انتہائی خوب معلوم ہوتا ہے، اس میں بھرتی کا شعر شاذ و نادر ہی نکلیگا۔ ۱۹۳۶ء میں حج کیا تھا۔ اس کے بعد کلام میں اور زیادہ رپورڈگی اور سنجیدگی آگئی، نعت سے بھی شغف ہو گیا تھا۔ غزل ایسی اچھی کہتے ہیں کہ کسی معیار پر اسے جانچے، آپ داد دینے پر مجبور ہو جائینگے۔ چونکہ وہ مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے اور پراپیگنڈے کا فن نہیں جانتے تھے، اس لیے ان کی کما حقہ شہرت نہیں ہوئی۔ صرف زبان کی ان کے ہاں چند اہمیت نہیں تھی۔ اسی لیے خالص لکھنوی دنگ پسند نہیں تھا وہ شہسوارہ مٹین کام سے دلدادہ تھے اور تو

اور اپنے استاد عزیز کی فوج خوانی بھی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ اسی لیے قافی بھی ان کے پسندیدہ شعرا میں نہیں تھے۔ اصغر سے متعلق انھیں شکایت تھی کہ ان کے کلام میں دکھائی نہیں؛ ثقیل ہے اور اس میں روانی ناپید ہے۔ اسی سے اندازہ کیجیے کہ ان کے اپنے کلام میں کیا ہوگا۔ وہ اپنی غزل سے متعلق کہتے ہیں:

خونِ دل رنگِ تغزل میں کیا ہے شامل

مٹ گیا ہوں تو یہ اندازِ بیاں آیا ہے

جگر اور حسرت ان کے محبوب شاعر تھے۔ جگر سے ان کے ذاتی تعلقات بھی اتنے قریب کے تھے کہ مثالی کہے جاسکتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے عاشق تھے۔ جگر کا دوسرا مجموعہ کلام ”آتشِ گل“ تسکین مرحوم ہی نے مرتب کیا تھا۔ وفات سے کوئی پانچ مہینے پہلے جگر نے ۲۶ مارچ ۱۹۶۰ء کو اپنے کلام کی طباعت و اشاعت اور اس کی آمدنی کی تقسیم سے متعلق ایک وقف، جگر ٹرسٹ، کے نام سے قائم کیا تھا۔ انھوں نے اس کا دواحد متولی تسکین صاحب ہی کو مقرر کیا، اور انھیں اجازت دی تھی کہ اپنے بعد جسے چاہیں متولی مقرر کر دیں۔ تسکین نے اپنی وفات سے پہلے غالباً کسی کو جانشین نامزد نہیں کیا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میں جب باہر چلا گیا، تو خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے جگر مرحوم کی زندگی میں ان سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا، جو نقوشِ دلاہور میں چھپ چکا ہے۔ اس کی فرمائش بھی تسکین صاحب نے کی تھی۔ ہوا یہ کہ شمس الہدیٰ تیسری صاحب نے جو گونڈہ میں تحصیلدار تھے، جگر کی سوا انھمڑی لکھنے کی داغ بیل ڈال دی۔ انھوں نے جگر سے پوچھا کہ آپ کے حالات کے لیے کن احباب سے رجوع کروں۔ منجملہ اور احباب کے جگر نے میرا نام بھی بتایا۔ میں اس زمانے میں قاہرہ میں مقیم تھا۔ تسکین نے مجھ سے مضمون لکھوانے کا فرض اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ میں نے تعمیل ارشاد میں یہ مضمون لکھا تھا۔ جب میں برسز (بلجیم) میں تھا، تو انھوں نے ”متاعِ تسکین“ کا پورا کلام خود

لکھ کر مجھے تحفہ بھیجا تھا۔ یہ مجموعہ اس کے بہت بعد شائع ہوا۔

ابھی دو ڈھائی چہینے ہوئے، میں میرٹھ گیا۔ سیف صاحب کے ہاں پہنچا۔ انھوں نے حسب معمول ملازم سے کہا کہ تسکین صاحب کو اطلاع کر دو کہ مالک رام آئے ہیں جب تک وہ آئیں، سیف صاحب نے بتایا کہ مجھے اندیشہ ہے، انھیں گلے کا کمینہ ہو گیا ہو لیکن یہ میری سنتے نہیں! کیا کیا جائے! اتنے میں تشریف لے آئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آواز صاف نہیں ہے! کچھ کچھ درمیان میں لفظ سنانی نہیں دیتا، کمزور بھی بہت ہو رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ فرمایئے! طبیعت کیسی ہے؟ جواب دیا کہ حلق پر نزلہ گر رہا ہے، اسی نے پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے یا اسپتال میں اپنا مکمل معائنہ کیوں نہ کر دالیجیے؟ اس پر انھیں شبہ ہوا۔ چمک کے کہنے لگے، نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ نزلے کا ایک جرب نسخہ میرے پاس ہے، وہی استعمال کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤنگا۔ اس پر مجھے جرات نہ ہوئی کہ کچھ اور کہتا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہی مشورہ حکیم سیف صاحب مجھ سے پہلے دے چکے تھے۔ اسی لیے انھیں شبہ ہوا کہ میں نے یہ انھیں کے کہنے پر کہا ہے۔

آخر وہی پیش آیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اطلاع ملی کہ جمعرات ۲۲ جون ۱۹۷۱ء صبح کے ۶ بجے آگرے میں انتقال ہو گیا۔ جب حالت بگڑنے لگی، تو انھیں علاج کے لیے سرحد جی ناسیڈ اسپتال، آگرہ میں داخل کیا گیا تھا۔ یہاں بہت تکلیف میں وقت گزرا۔ جب حالت مایوسی کی ہو گئی، تو اسپتال سے اٹھ کر اپنے پھوٹے بھائی فضل الرحیم صاحب افضل محلہ تاج گنج کے مکان پر آگئے۔ وہیں وقت موعود آیا۔ مٹی بھی آگرے کی نصیب ہوئی۔ تاج محل کے قریب ہی مشرق کی طرف، شاہی زمانے کی بنی ہوئی، سید احمد بخاری کی درگاہ ہے۔ اسی میں دفن ہوئے۔ انا شروانا الیہ راجعون۔

ہمارے دوست ڈاکٹر نور الشرفوری نے ایک کے تعجب سے عیسوی تاریخ کہی ہے:
ایک ملایہ مصرع غم خلدِ مکاں ہیں تسکینِ قریشی

(۱۹۶۰ + ۱ = ۱۹۶۱)

T

۱۹۱۸ء میں اپنے خاندان ہی میں شادی ہوئی تھی۔ لا ولد فوت ہوئے۔

ان کا کلام چار مرتبہ چھپا:

سرایہ تسکین (اول): (بلند شہر ۱۹۲۶ء)

سرایہ تسکین (دوم): (سہارنپور ۱۹۳۷ء)

گلگونہ: (لکھنؤ ۱۹۵۲ء)

متاع تسکین: (لکھنؤ ۱۹۶۲ء)

انھوں نے مکاتیب جگر (دلی ۱۹۶۲ء) کے عنوان سے جگر کے وہ تمام خطوط بھی شائع کیے تھے، جو ان کے پاس محفوظ رہ گئے تھے۔ اس میں جگر کے خطوط ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں انھوں نے مولانا اسعد صاحب (ناظم مظاہر علوم، سہارنپور) کے ۲۸ خط صحائف اسعد کے نام سے، اور اپنے استاد عزیز لکھنوی کے ۱۶ مکتوبات عزیز کے عنوان سے تضمین کر دیے ہیں۔

ان کے پاس جگر کے خطوط کے علاوہ ان کی کچھ بیاضیں وغیرہ بھی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ سارا ذخیرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ کر دیا جائے، تاکہ آئندہ جگر پر تحقیقی کام کرنے والے طلبہ اس سے استفادہ کر سکیں۔ کسی وجہ سے مسلم یونیورسٹی میں یہ انتظام نہ ہو سکا۔ اس پر انھوں نے یہ تمام چیزیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے حوالے کر دیں۔ یہاں یہ اشیاء گوشہ جگر کے نام سے مرکزی کتابخانے میں رکھی گئی ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اب کلام کا انتخاب ملاحظہ ہو، جو ان کے مجموعے متاع تسکین سے لیا گیا ہے:

عشق میں عشق کا حاصل نہیں دیکھا جاتا نہ دریا کبھی ساحل نہیں دیکھا جاتا
 بے طلب کبھی کبھی مل جاتی ہو منزل، تسکین ہر کہیں جادہ منزل نہیں دیکھا جاتا
 کفر و دیں سب کی سیر کر آیا کچھ نہ دل کے سوا نظر آیا
 دل ہے بے آرزو نظر بے ذوق تجھ کو جینا نہ عمر بھر آیا
 جب کہیں تذکرہ حسن و لا رام آیا کوئی محفل ہو، ہر اک لب پہ ترانہ آیا
 توبہ کے بعد ہی ساقی کا یہ پیغام آیا میکدے سے جو گیا، پھر نہ کہیں کام آیا
 عشق سے پہلے نہ سمجھے تھے، خوشی ہوتی ہے کیا کیوں چمکتے ہیں ستارے چاندنی ہوتی ہو گیا
 کوئی خاموش ہے، کوئی نالہ لب اپنا اپنا جنوں، اپنی اپنی طلب
 باہمہ جرات شوق و جوش طلب ہے مقام محبت، مقام ادب
 جن کو جنوں نے کر دیا، عشق میں خانہاں خراب

زیت بھی ان کی کامیاب، موت بھی ان کی کامیاب
 تری نظریں کائنات، میری نظریں صرف تو

تیرا بھی حسن، بینظیر، میرا بھی عشق لا جواب
 کہنے کو تو کہہ آئے غم دل، مگر اب تک وہ نیم نظر یاد ہے، وہ جین جیں یاد
 صہبا، ہمہ سرمستی و ساقی، ہمہ آغوش! کافر ہے جسے آئیں جواب کھل دل و دیں یاد
 اب کرم کی بھی دل کو تاب نہیں کیجیے کس امید پر فریاد
 ہاے، اس دل کی حسرتیں تسکین! جو محبت میں ہو گیا برباد
 جبر میں اختیار ہے تو، مگر جیسے کوئی قفس میں ہو آ زاد
 دل کی دنیا عجیب و نیا ہے جتنی برباد، اتنی ہی آباد
 بتکہہ، بتکہہ سہی تسکین! آگے اب تو، ہر چہ بادا باد
 ترا خیال کھلے ہے تیرے حسن سے معمور تمام شوخی و مستی، تمام نکہت و نور

جنوں، کمال یقین، انتہائے سوز و سحر
 حیات راہِ محبت میں ساتھ دے نہ سکی
 جنوں نہ ہو، تو محبت دل و نظر کا فتور
 سفر تمام ہوا، اور ابھی ہے منزل دور
 ہر ایک داغِ جگر، جنتِ نظارہ سہی
 تیری طلب کے سب ہیں مراحل
 تم دے گئے ہو، تنہائی، دل
 غمِ دل اور اتنا راحت انجام
 محبت بھی ہے، رسوائی کا ڈر بھی
 یقین، ذوقِ جنوں کی شرطِ اول
 ہر آرزو کا احساس ہے گم
 کچھ چشمِ تر ہی کام آئی، ورنہ
 ننگِ طلب ہیں دونوں ہی، تسکین!
 تسکین! یہ کوئے دست ہے، راہِ حرم نہیں

کچھ ہوش ہے، کہاں سے کہاں آگئے ہو تم!
 زندگی مرگِ ناتمام ہے آج
 نہ تمنا، نہ جستجو، نہ جنوں
 زرا حسن پیدا تو کرو، زندگی میں
 جہیں تیرے در پر تھکی تھی نہ جب تک
 وجہِ ستم، کچھ ہوا تو بتائیں!
 دردِ محبت دل میں چھپایا
 ننگِ زمانہ دیکھنے والے
 کفر نے بخشا ہے، تسکین! میرے ایاں کو فرغ
 اگر ہونہ آہوں سے آباد سینہ
 خرد بے سلیقہ، جنوں بے قرینہ

وہی عظمتِ زندگی سے ہیں واقف کہ طوفاں سے گزرا ہے جن کا سفینہ
ہزاروں جام و ساغر ٹوٹتے ہیں بہت دشوار ہے میخانہ سازی
صدائیت کیا، جو ہو محدود و پناہ جنوں کیا، جب نہ ہو ہنگامہ سازی
ہزاروں بار جب ٹوٹا ہے توبہ تو آیا ہے شہورِ پاکبازی
محبت، حسن بن جاتی ہے تسکین محبت میں اگر ہو بے نیازی
ان کی محفل میں جہاں ہم کھبی آئے نہ گئے آج کیا کیا ہمیں الزام لگائے نہ گئے!
انجم دہر و ماہ سے پہلے جلوہ تھا، جلوہ گاہ سے پہلے
کھیل سمجھے نہ کوئی شغلِ نغاں دم الٹا ہے، آہ سے پہلے
تغافل کے تو پہلو اور بھی تھے ستم ہی کس لیے کم ہو گیا ہے!
نہ دن دیکھے، نہ صبح و شام دیکھے تجھے کیا چشمِ پرِ نم ہو گیا ہے؟
ایسری سے فطرت بدلتی نہیں چھٹے، اور نشین بنانے لگے
سکوں، مگر ہی ہے رہ عشق میں قدم جب رکے، ڈمگمانے لگے
کس قدر ہم سے نا آشنا ہو گئے! تم محبت کے ہوتے ہی کیا ہو گئے!
دل جب آسودہ امید کو مہوتا ہے غم کا احساس اگر ہو کھبی تو کم ہوتا ہے
ہم نے دیکھا ہے حسینوں کو بھی محروم سکوں ہم سمجھتے ہیں، محبت میں جو غم ہوتا ہے
دش عام نہیں، مسکابِ ارباب جنوں بیچ کے چلتے ہیں، بعدِ نقشِ قدم ہوتا ہے
حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں جہاں میں سکیں دل کے جانے کا مگر اور ہی غم ہوتا ہے
زندگی اپنی حقیقت کھتی اب تک محروم تم بے ہوا، تو یقیناً دل و جان آیا ہے
نگہ سادہ، اے معاذ اللہ! نگہ، التفات کیا ہوگی!
کمالِ محبت، جمالِ آفریں ہے اگر دل حبیب ہو، تو دنیا حبیب ہے
وہ اک سجدہ بے حبیب، اللہ اللہ! کوئی آئین جس کے قابل نہیں ہے

بایں نامرادی، بایں بدگمانی محبت سراپا، یقیں ہی یقیں ہے
 مالِ عشق پہ ہم صبر کر تو سکتے تھے مگر یہ دل، جو ابھی تک ترے خیال میں ہو
 یہی ہو کفر، تو ایمان کس کو کہتے ہیں کہ سر ہے جدے میں، اور دل تے خیال میں ہو
 حضور حسن، اک افانہ بن گیا اس کا کہی تھی بات جو آغازِ گفتگو کے لیے
 ہزار ہزن اچھے ہیں، ایسے رہے جو راہ چھوڑ دے، منزل کی جستجو کے لیے
 گلروں سے کھیلنے والے، ہٹانہ کانٹوں کو جہانِ حُسن کی ہر شے ہے آرزو کے لیے
 یہ فیصلہ آخرِ اربابِ یقیں ہے جو کچھ ہے محبت ہے، نہ دنیا ہو نہ دیں ہو
 ملتی نہیں بے جان دیے منزلِ جاناں مشکل تو ہے یہ راہ، مگر دور نہیں ہے
 طیس تھی جس میں اک مدت سے آج وہ پھالا پھوٹ گیا

ٹوٹ گئیں جب ساری امیدیں، آخر دل بھی ٹوٹ گیا
 ترے لیے ملتے تھے سب، اب یہ نفاق ٹوٹ گیا
 ایک ترا کیا دامن پھوٹا، سارا زمانہ پھوٹ گیا
 ترکِ محبت کی بھی کوشش، اس نے آئی، اے تسکیں !
 پھانس بھی دل کی دل سے نہ نکلی، دل کا دل بھی ٹوٹ گیا
 تسکیں کا مرنا جینا کیا، افسوس ہے اتنا البتہ

غم جس کو رہا دنیا بھر کا، دنیا کو اسی غم نہ ہوا
 زرا بتاؤ، کبھی تم کو یہ خیال ہوا نگاہ کس پہ پڑی، کون پامیاں ہوا
 طرح طرح سے بھلایا، مگر یہ حال ہوا کہ ہر خیال سے، پیدا ترا خیال ہوا
 ہزاروں اور بھی آئے تھے بے بلائے ہوئے مجھی سے کیوں یہ بھری بزم میں الی ہوا
 کفر دایاں، جادۂ الفت کی ہیں۔ و منزلیں

ایک ہے کعبے سے پہلے، ایک بتانے کے بعد

احساسِ نامرادیِ الفت نہ پوچھیے
کچھ اور پوچھیے یہ حقیقت نہ پوچھیے
سجدوں سے طے مقامِ محبت نہ ہو سکا
جب یادِ یار سے بھی نہ تسکین ہو سکے
تھی رائے ابتداءِ محبت بس اک نگاہ
پیشِ نظر ہو جب وہ جمالِ نظرِ فرد
کہنے کو دل میں کچھ بھی نہیں، جز خیالِ یار
دونوں ہی بھول جانے کے قابل ہیں عشق میں
کعبے میں، بتکدرے میں، حرمِ جمال میں
تسکین! یہ جان و دل تھو ہیں بھی کبھی عزیز
عذرِ تم سے دل نہ دکھاؤ، پاسِ محبت نہ دے
کوئی کنارہ، کوئی سہارا کیا جانے کب مل جا
حرف و حکایت، شکر و شکایت دل میں لیے ہیں ہم کیا کیا
مٹتے مٹتے داغِ مٹنگے و درِ ہوس کے اے تسکیں!

کیا دل کے ٹوٹنے میں ہو لذت نہ پوچھیے
کیوں آپسے ہو مجھ کو محبت نہ پوچھیے
کیا کیا ہوتی ہے سر کو ندامت نہ پوچھیے
ہوتی ہے کیا وہ کاشِ فرقت نہ پوچھیے
ایسی نگاہ جس کی حقیقت نہ پوچھیے
پھر اضطرابِ شوق کی حالت نہ پوچھیے
لیکن خیالِ یار کی وسعت نہ پوچھیے
افسانہِ مجاز و حقیقت نہ پوچھیے
دل کی کہاں کہاں ہو ضرورت نہ پوچھیے
اب زندگی ہے کس کی بدولت نہ پوچھیے
کون کہیگا تم کو ظالم! اور کہے تو کہنے دو
یہ طوفان کی ماری کشتی، بہتی ہو جب تک بہنے دو
اپنے کرم کا ذکر کہاں تاک کچھ تو ہمیں بھی کہنے دو
بنتے بنتے دل بنتا ہو، خوب اسے غم بہنے دو

کس سے پوچھیں، ہم نے کہاں، وہ چہرہ روشن دیکھا ہے
محفلِ محفل ڈھونڈ چکے ہیں، گلشنِ گلشن دیکھا ہے
ہم کو دیکھو، منزلِ منزل لٹ کے ہوئے ہیں خاکِ نشین
ہم سے پوچھو کیا کیا ہم نے، رہزن دیکھا ہے
کس کو دیکھیں، کس کو نہ دیکھیں، بچوں بھی ہیں، کلیاں بھی، مگر
جس سے لگاتی آنکھ، اسی کو، دل کا دشمن دیکھا ہے

شافل قادری، سید محمد شافل قادری

ایک مذہبی اور متدین گھرانے کے فرد، ۱۲ جنوری ۱۹۲۲ء کو بمبئیہ ضلع گیا، بہار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ فتح ابٹار صدیقی منش اور اہل دل میں سے تھے۔ چونکہ وہ بیشتر عبادت میں مشغول اور عزت گزین رہتے تھے، اس لیے شافل کی تعلیم و تربیت اپنے بڑے بھائی ذاکر قادری کی نگرانی میں ہوئی۔

ان کے چچا اسد اللہ قادری نے انھیں بچپن ہی میں مختلف شعرا کے بہت شعریا ذکر ادا دیے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ابھی اسکول کی منزل طے نہیں ہوئی تھی کہ شعر گوئی کا چرکا لگ گیا۔ شروع میں تخلص صادق کیا۔ طبیعت جو نچال تھی، اس لیے سنجیدہ کلام کے ساتھ مزاحیہ رنگ میں بھی کہنے لگے، ایسے کلام میں تخلص کا ذبا دکھا۔ جب جھریاراج ہائی اسکول میں پہنچے، تو اب تخلص بدل کر پہلے دانش اور پھر شاہد رکھ لیا۔ ملازمت کے ابتدائی دو ربعی مکرڈنی انجینئرنگ: کس کے قیام کے زمانے میں چندے شرر تخلص سے بھی لکھتے رہے۔ لیکن جب اگست ۱۹۴۷ء میں مستقل طور پر ریلوے کی ملازمت مل گئی اور بھاکلیپور اسٹیشن پر تعیناتی ہوئی، تو اس کے بعد سے اپنے نام کے دوا جزاء شافل اور

قادری پر اکتفا کی، ان میں بھی ترجیح قادری کو رہی۔ مزاحیہ کلام میں البتہ آج تک پہلا
تخلص کا ذب ہی چلا کر ہاتھا۔ اب اس کی جگہ تلخ زبانی آنے لے لی۔
وہ ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک بھاکپور میں رہے۔ اس کے بعد تبادلہ ہوا، اور صاحب گنج
پہنچے یہاں ۱۹۶۱ء تک رہے اور اسی سال ہاٹ پور میں ریلوے اسٹیشن ماسٹر کے عہد پر
فائز ہوئے۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی رہے، ارفاء عام کے کام، شعرو سخن کی خدمت، اور
مشاعرے منعقد کرنے سے انھیں فرصت نہیں ملتی تھی۔ شروع میں پروفیسر اختر صدر
شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی سے اصلاح لی۔ جب دوران ملازمت میں صاحب گنج پہنچے،
تو حضرت سرور عظیم آبادی سے مشورہ کرنے لگے۔ انھوں نے اپنا مجموعہ کلام متاع شوق
کے عنوان سے قیام بھاکپور کے زمانے ہی میں مرتب کر لیا تھا، اگرچہ اس کی اشاعت
بہت بعد کو ہوئی (دیکھا: ۱۹۶۵ء)۔ انھیں غزل اور نظم، بلکہ ہر ایک صنف سخن پر،
یکساں قدرت حاصل تھی۔ مذہب اور سیاست ان کے دلپسند موضوع تھے۔ ان کے
مجموعہ کلام میں غزل، نظم، قطعہ، نعت، سلام، ہجو سب ہی کچھ ہے۔ آخر میں تلخیصات
کے عنوان سے طنزیہ اور مزاحیہ کلام بھی ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی خاصی ہمارت تھی؛
چنانچہ اس مجموعے میں چند قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔

یہ مجموعہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے نام بدیں الفاظ معنون کیا ہے؛
امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے نام، جن کی نشر نے میرے فکر و فن کو
جلاد دی۔

اس سے ان کی افتاد طبع کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں: اپنے نبرگوں کی طرح انھیں بھی ملکی
سیاست سے گہری دلچسپی تھی؛ چنانچہ جمعیتہ العلماء ہند سے باضابطہ وابستہ تھے۔ وہ جمعیتہ
کے جملہ کارہ سے بہت متاثر ہوئے۔ نظم کے علاوہ شری بھی لکھتے تھے۔ ان کے شری مضامین
مختلف رسالوں میں منتشر پڑے ہیں اور آج تک مدون نہیں ہوئے۔ ان سے یقیناً ایک اچھی

ضیغم جلد تیار ہو جائے۔

شب جمعہ ۶ جولائی ۱۹۷۱ء ریلوے اسٹیشن پنجوارہ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا۔ ان کی بیگم وائمہ المرض تھیں۔ اپنی اولاد نہیں تھی۔ ایک بچے کو گود لے لیا تھا، وہی ان کا وارث ہو گا۔

چند شعرا کے مجموعہ کلام متاع شوق سے ماخوذ درج ذیل ہیں:

دھندلا دھندلا سا دل کا عالم ہے	آرزو کا چراغ تدم ہے
ہر طرف ہے بلا کی تاریکی	دور منزل ہے، راہ پر خم ہے
نئے عنوان کی ہے مسجائی	جو دوا درد دل کی ہے اسم ہے
موت ماحول پر ہوئی طاری	سرنگوں زندگی کا پرچم ہے
چشم حق میں نہیں، مگر بالوس	روشنی گر نہیں، تو کیا غم ہے
دل میں شمع یقین تو ہے روشن	ہوا گر تیرگی کا عالم ہے
ہلکے ہلکے نسیم کے جھونکے	کہہ رہے ہیں کہ مات اب کم ہے
پھر چمن میں بہار آئیگی	کھلنے والا سحر کا پرچم ہے

دورِ فتن

زیگن فضا میں ہیں بہاروں پر چمن ہے	شاداب گل و لالہ و نسرن و سمن ہے
ہر شاخ گل تر پہ عنادل میں غرنخوان	گلگشت میں مصروف کوئی غنچہ دہن ہے
خوش فہمی اربابِ چمن خوب ہے، لیکن	شاعر کی نظر میں یہ نقطہ خواب بہن ہے
دیکھا تھا خزاں میں جو بہاؤں کا کھنچا	چھایا ہوا ذہنوں پر سی خواب کا ظن ہے
مرچھائے ہوئے پھول کو شاداب نہ کہیے	روتا ہوا جو بلبل اتونہ کہیے کہ مگن ہے
گہم گہم ہیں اے دوستِ حقیقت گریزاں	خطرے میں نشیمن ہے مصیبت میں چمن ہے
بلبل کے لیے چمن کی صورت نہیں اب بھی	صیاد سے ملتا ہوا مالی کا چیلن ہے

جس دل میں محبت نہیں ہر اہل وطن کی
وہ دل نہیں اے دوست! ناسو کہن ہے
ہم جو رستم پر تو نہ خاموش رہینگے
مانا کہ کٹھن مرحلہ دار و رسن ہے
ہر غنچہ بخود ابیدہ کو بیدار کرینگے
ہشیار رہو، قادر کی یہ دورِ قسن ہے
ان کی پیش یہ جو دکھا متبسم مجھ کو
راز داں کو مرے انداز پہ رونا آیا
ہے وہ تیر نیکش، شاغل!
شبِ فراق گزار می عجب تصویریں
زخمِ تازہ ہے آج تک دل کا
جن میں سننے کی سرور و جبارت آئی
کہ جیسے پاس مرے آپ آئے جاتے ہیں
رنگ لایا ہے مرا خون و فاکلشن میں
ان کے قدموں میں زانے کی سیادت آئی
گل تو گل، خار میں بھی جوئے محبت آئی
ہو اسے سود و زیاں کی فکر کیوں
جس نے تیرے عشق کا سودا کیا
رعنائی حیات کا باعث کبھی نہیں
وہ دردِ عشق، جس کی خلش دائمی نہیں
راہِ وفا میں کوئی دیتا ہے ساتھ کس کا!
دل میں تصویرِ تباں لب پہ سلام اور رُو
غم کیوں منائیں ناحق ہم اپنی بکسی پر
ہم تو عشق کے بندے تھے ہرے
زیستِ مجموعہ اضراد ہوئی جاتی ہے
کوئی ناحق کیوں دشمن ہے
عشق کی منزل سہل نہیں ہے
ہر اک کام پہ دار و رسن ہے

ہر دل میں غم و درد ہے بتیابی ہے
غنقا چمنِ زیست میں شادابی ہے
ساتھی کو بھی ہے تشنہ لبی کا رونا
صہبائے مسرت کی وہ نایابی ہے

تھا عہدِ خزاں میں جو چلن اب تک ہو
بلبل کے لیے دورِ محن ما اب تک ہو
کہنے کو تو آیا ہے گلوں کا موسم
صیدِ غم و آلام چن اب تک ہے

فلت کے خرابات میں پیئے والو!
اکرام پہ اغیار کے جینے والو!
غلاب و مجدھار میں سہجاء و گہریس!
ہشیار، خبردار، سفینے والو!

افسردہ گل و لالہ کھلا دیتے ہیں
تاریک فضاؤں کو ضیا دیتے ہیں
یہ آخر شب، اشکِ ندامت کے گہر
آئینہء خاطر کو چلا دیتے ہیں

خیر بہاروی، ابوالخیر

اس صدی کے آغاز (غالباً ۱۹۰۱ء) میں ضلع بلیا دیوپی کے ایک گاؤں بہارہ میں پیدا ہوئے پرانے طرز کی فارسی، عربی کی تعلیم پائی تھی، اور اردو سے محبت تھی۔ اسی لیے مرحوم مولوی عبدالحق نے جب انجمن ترقی اردو کا دفتر ۱۹۳۶ء میں اورنگ آباد سے دلی منتقل کیا، تو انھیں صدر دفتر میں بلا لیا۔ وہ تقسیم ملک تک انجمن کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے ملک بھر کا دورہ کرتے اور اس کی تنظیم کا کام کرتے رہے، کچھ زمانہ غالباً نائب معتمد بھی رہے جب تقسیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں انجمن کا دفتر ازبیر نو علی گڑھ میں قائم ہوا اور قاضی عبدالغفار (ف جنوری ۱۹۵۶ء) اس کے سکریٹری مقرر ہوئے، تو خیر صاحب ان کے دست راست ثابت ہوئے، انھوں نے انجمن کے ازبیر نو قیام و استحکام میں ان کی بہت مدد کی۔ قاضی عبدالغفار کی رحلت کے بعد نئے ماحول میں وہ زیادہ دن نہیں رہے؛ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں مستعفی ہو گئے۔

انھوں نے کسی زمانے میں غالب انسائیکلو پیڈیا، مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور اسی سلسلے میں غالب کی تصویریں ایک جلد میں مرقع غالب کے عنوان سے شائع کی گئیں

تذکرہ معاصرین

(لکھنؤ ۱۹۵۷ء)۔ اس کے لیے غالباً یوپی حکومت نے کچھ مالی امداد کی تھی۔ اس کتاب کا
ہندی ادیشن بھی شائع ہوا تھا۔ لیکن چونکہ پورا منصوبہ ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس
لیے مرتع غالب کے بعد وہ کوئی اور کام نہ کر سکے۔ انھوں نے لکھنؤ میں آل انڈیا میر
اکاڈمی قائم کرنے میں جناب مقبول احمد صاحب لاری کا ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ لاری صاحب
اسی کے ساتھ رہتے تھے اور یہ ان سے ہر طرح کا سلوک کرتے رہتے تھے۔

خیر صاحب کو بہت دن سے یہ عارضہ تھا کہ اچانک ان کے منہ سے خون آنے لگتا۔ بلا
مبالغہ بعض اوقات دودھ چلچلی خون خارج ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد ان کے جسم میں
تازہ خون چڑھایا جاتا تھا۔ اسی سے روز بروز نقاہت بڑھتی گئی اور حالت خراب
سے خراب تر ہوتی گئی۔ مسلسل بیماری سے گھبرا کر وہ گزشتہ مئی کے اوایل میں اپنے وطن
بہورہ چلے گئے تاکہ آخری ایام اپنے اعزاء و اقارب کے ساتھ گزار سکیں۔

بروز ہفتہ ۱۷ جولائی ۱۹۷۱ء بوقت شب بہورہ ہی میں انتقال کیا۔ خدا مغفرت
کرے۔

راز بلگرامی سید شریف الحسن

۱۹۰۱ء میں بلگرام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ریاض الحسن بلگرامی کی کچھ زمینداری تھی۔ راز کی عربی فارسی کی کچھ تعلیم گھر پر ہوئی؛ اسکول میں آٹھویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن یہ کمی انھوں نے ذاتی مطالعے سے پوری کی۔ مطالعہ بہت وسیع تھا، فارسی اور عربی دونوں میں بہت اچھی استعداد تھی، اور شعر میں خاص طور پر حافظہ اتنا اچھا تھا کہ حوالے میں سند دینے میں کبھی دقت نہیں ہوتی تھی۔

فن عروض شادال بلگرامی (ف جنوری ۱۹۲۸ء) سے حاصل کیا، لیکن شعر پر اصلاح سید وجاہت حسین رمز تلہری سے لی۔ اور طویل مشق سے خود استاد کی کا درجہ حاصل کیا۔ بلگرام کے بیسیوں نوجوان ان سے مشورہ کرتے تھے۔ شعر کے علاوہ نثر سے بھی مزا دلالت تھی۔ سید مقبول حسین وصل بلگرامی کے ماہنامے امرتج میں برابر کے شریک تھے اور اس میں کبھی کبھی نثری مضمون بھی لکھتے تھے۔ اس زمانے کا ایک مشہور تنقیدی مضمون شاد عظیم آبادی اور اکبر الہ آبادی کے کلام کے موازنے سے متعلق تھا جس پر کچھ بحث بعد کو نگار (لکھنؤ) میں ہوئی تھی۔

مطبوعہ تصانیف یہ ہیں: حسین بیتی، کاسر حسین، پیغامات

آخری ایام میں تاریخ بلگرام مرتب کرنے کا ارادہ تھا، لیکن اس کے لیے جس ذہنی اور جسمانی سکون کی ضرورت تھی، وہ میسر نہ ہو سکا اور کام نامکمل رہ گیا۔
کلام کبھی محفوظ نہیں رکھا، بلکہ جس نے طلب کیا، اس کے حوالے کر دیا۔ اگرچہ نظم، غزل، نعت، قصیدہ سب اصناف میں کہا، لیکن تلاش کرنے پر شاید ایک معقول مجملہ کے لیے بھی اب نہ مل سکے۔

سادات بلگرام کو اہل بیت سے بہت محبت رہی ہے۔ راز مروج بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ چنانچہ مرثیہ خوانی سے بہت شغف تھا، بلکہ فارسی "وہ مجلس" کے پڑھنے میں تو ان کی خاص شہرت تھی۔

تپ دق کے مرض سے ۱۰ اگست ۱۹۷۱ء کو بلگرام میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔
موت کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں:

بتوں کی زباں پر کلام محبت بنا کعبہ حق، مقام محبت
علی کے لیے خود سنی کہ رہے ہیں محبت کا پہلا امام محبت
کھل گئی بات رخ یار کے ماتھے آئی کچھ نہ کچھ پردہ اسرار کے ماتھے آئی
ڈور رہا تھا، مراکعبہ نہ کہیں طور بنے خیریت ہو گئی، دیوار کے ماتھے آئی
قدرت کی نظر کا کسا کہنا سوار اٹھی، پھر مڑ بھی گئی
جو گر دیڑی تھی عالم پر لمحوں میں ہوا سے اڑ بھی گئی
دنیا نے بالآخر دیکھ لیا مولودِ حرم کے صدقے میں
دیوارِ حرم قسمت کی دھنی خود ڈوٹ گئی، خود جڑ بھی گئی

طالب کشمیری، نند لال کول

پنڈت نند لال کول طالب جن کا مختصر علالت کے بعد اچانک ۳ ستمبر ۱۹۷۱ء کو شریج میں انتقال ہو گیا، کشمیر کے خاصے صاحبِ وجاہت طبقے کے فرو تھے۔ ان کے والد کا نام پنڈت ٹٹھا کر پرشاد کول تھا، جو ریاست کے بڑے زمینداروں میں گنے جاتے تھے۔ طالب کے دادا پنڈت دیوہ کول حکومت کشمیر میں دفتر دیوانی کے افسر اعلیٰ تھے۔ وہ فارسی کے منہتی اور شاعر بھی تھے، دیوہ تخلص تھا۔ عربی میں بھی خاصی دستگاہ تھی اور سنسکرت اور ہندی سے بھی واقف تھے، بلکہ ہندی میں تو ان کا ایک آدھ شعر بھی ملتا ہے۔ افسوس، ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ باقیاتِ صالحات میں سے فارسی کی چند غزلیں رہ گئی ہیں۔ شعر و سخن کے علاوہ خوشنویسی اور مصوری اور نقاشی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اہل نظر سے خراجِ تحسین لے چکی ہیں، بشیر تصویریا سنہ دیو مالالا اور مذہب سے متعلق ہیں۔ ان کا ۱۸۹۲ء میں سرینگر میں انتقال ہوا۔ دیوہ کے والد یعنی طالب صاحب کے جدِ امجد راے راگھونا تھا کول بہت بڑے رئیس اور زمیندار اور ریاست میں وزارت اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے تھے۔

تذکرہ معاصرین

پنڈت نبدلال ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ خاندان کا ماحول علمی تھا! اس لیے ان کی تعلیم پر پوری توجہ دی گئی؛ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں بی۔اے، دو سال بعد ۱۹۲۴ء میں ایم۔اے (فارسی) پھر ۱۹۲۵ء میں منشی فاضل (فارسی) اور اسی کے ساتھ ایم۔اے، ایل اور ایب فاضل (اردو) کے امتحان پنجاب یونیورسٹی سے با امتیاز پاس کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی اور سری پرتاپ کالج میں اردو اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک رہا۔ اس سال یہاں سے سکدوش ہو کر امرنگھ کالج میں پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی و اردو ہو کر چلے گئے؛ یہاں ۱۹۵۴ء تک رہے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۷ء تک کے تین برس جموں کشمیر یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے ڈین کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں جموں کشمیر کلچرل اکاڈمی سے بھی وابستہ ہو گئے۔

جس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس میں شعر گوئی کا شوق لا بد تھا، لہذا یہ بھی کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ پہلے کچھ دن دبیر تخلص کرتے رہے؛ پھر اسے بدل کر طالب کر لیا۔ شروع میں منشی رام سہاے تمنا لکھنوی (ف ۱۹۳۴ء) سے اصلاح لی جو منشی دوار کا پرشاد افق (ف ۱۹۱۳ء) کے بھائی اور منشی بشیر پرشاد منور، لکھنوی (ف ۱۹۱۷ء) کے چچا تھے۔ تمنا سے اصلاح کا سلسلہ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا۔ اس سال انھوں نے پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی دہلوی (ف ۱۹۵۵ء) کا تلمذ اختیار کیا۔ کیفی مرحوم نے اپنی وفات سے مدتوں پہلے انھیں فارغ التحصیل قرار دے دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سیما اکبر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) سے بھی شاگردی کا تعلق رہا؛ یعنی وہ کیفی اور سیما دونوں سے بیک وقت استفادہ کرتے رہے۔ انھوں نے کیفی مرحوم سے تلمذ کا ایک شعر میں ذکر بھی کیا ہے:

حضرت کیفی کی شاگردی پہ نازاں کیوں ہو! میں ہوا طالب، تو بخشا، فیض روحانی مجھ

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے: (۱) رشحات التخیل یعنی کلام طالب (بدایوں ۱۹۲۵ء) اور (۲) مرقع افکار (بدایوں ۱۹۵۲ء) اس کے علاوہ (۳) ترانہ طالب کے عنوان سے ایک طویل مسدس بھی شائع ہو چکا ہو۔ منشی تیرتھ رام فیروزپوری نے اردو میں پرتھوی راج چوہان کی سوانحی بھی لکھی تھی، طالب نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ کشمیر میں فارسی کے ایک شاعر ہوئے ہیں، پنڈت راجہ کول عرض بگی، وہ دیریں تخلص کرتے تھے، بہت نختہ کلام ہے۔ دیوان شائع نہیں ہوا تھا۔ طالب صاحب نے اسے بھی مرتب کر کے شائع کیا۔ ایک کتاب "ادب ایران میں کشمیریوں کا حصہ" کے عنوان پر شائع کی تھی۔

پنڈت برج کشن کول بخیر اور پنڈت جگموہن رینہ شوق نے "بہار گلشن کشمیر" کے عنوان سے کشمیری پنڈت شعرا کا ایک تذکرہ دو جلدوں میں شائع کیا تھا (۱۹۳۱ء-۱۹۳۲ء) طالب صاحب نے اس کے لیے شعرا کے حالات اور کلام کی فراہمی میں مرہبین کا بہت ہاتھ بٹایا تھا جس کا انھوں نے دیا چے میں اعتراف کیا ہے۔

طالب صاحب نے غالب کے اردو اور فارسی کلام کا تجزیہ کر کے سرمایہ کلام غالب کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین تیار کیا تھا "نوائے ادب" (بہار) میں شائع کیا تھا۔ اسی کو مرتب کر کے کتابی شکل میں جوہر آئینہ، کے نام سے چھپوایا۔ ابھی مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ منتشر حالت میں پڑا ہے۔

انھوں نے آٹھویں صدی کی مشہور کشمیری شاعرہ للہ عارفہ کے کلام کا اردو اور فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ للہ کا کلام شیوی فلسفے پر مبنی ہے۔ طالب کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ موضوع کی دقت کے باوجود اس میں کہیں اشکال پیدا نہیں ہوا۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ رہ گئی۔ آخری ایام میں وہ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ یہ غالباً نامکمل رہ گئی۔ اچھا ہو، کہ جتنا حصہ بھی لکھا جا چکا ہے، اسے شائع کر دیا جائے۔ اس سے نہ صرف ان کی محنت ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیگی، بلکہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے بنیاد

بھی ثابت ہوگی۔ وہ اردو کے علاوہ کبھی کبھی فارسی میں بھی کہتے تھے جیسا کہ 'بہار گلشن کشمیر' کے انتخاب سے ظاہر ہے۔ "مرقع افکار" میں بھی کچھ فارسی کلام موجود ہے۔ خدا معلوم سارے فارسی کلام کی مقدار کتنی ہو، بہر حال یہ بھی غیر مطلوبہ رہ گیا۔ بہت سے مضمون مختلف رسائل و جرائد میں منتشر پڑے ہیں۔

انھیں علمی خدمات کے جلد ویں صدر جمہوریہ ہند نے ۱۴ سال انھیں فارسی کا انعام (تین ہزار روپے سالانہ) عطا فرمایا تھا۔ وہ ۲۴ اکتوبر اس کی سند لینے کو دلی آنے والے تھے کہ چارپانچ دن کی مختصر علالت کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۶۱ء صبح ساڑھے سات بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے راسی ملک بقا ہو گئے۔ ان کی آخری کتاب جو ہر آئینہ بھی مطبع سے نہیں آئی تھی، یہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

اے سا آرزو کہ خاک شدہ

ان کی موت سے ایک صلح کل اور شریف دوست، ہمدرد اور شفیق استاد، اردو کا ایک خاموش خادم ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہوا۔

ہر کوئی محو تماشاے جمالِ یار ہے	ناچتی پھرتی صبا ہے، اور گاتی ہے بہا
غنیہ و سربستہ کہنے کو ہوا پناہ حال دل	راز کلیوں کی چٹک سے کہ سنا تی ہے بہا
جس کو رفیق سمجھے تھے، نشتر سے کم نہیں	پہلو میں ایک خار ہے میرے بجائے دل
بچپن کا اک رفیق تھا اب وہ بھی چھٹ گیا	دل میرا آشنا ہے، نہ میں آشنا دل
زخمِ جگر کی تشنگی، اے ہمیشیں! نہ پوچھ	ہر شور و نالہ شورِ نمکدراں سے کم نہیں
ہے اضطرابِ شوق، نقابِ رخِ امید	"نازِ نگاہ" پر وہ مرگیاں سے کم نہیں
لطفِ جفاے یار کا نقشہ نہ کھینچ سکا	کس کام کی ساری یہ طبع لطیف ہے
دیکھا جو وقتِ نزع کہا: دے رہا ہوں دم	طالب بہانہ ساز بھی ہے اور ظرفیہ ہے

تذکرہ معاصرین

ہو میرے رنج و راحت کا نہ پارب! رازِ داں کوئی
نہ سننے پائے محشر میں بھی میری داستان کوئی

عناصر کے قفس کی تیلیاں، اک روز ٹوٹ سینگ
ابھی سے ڈھونڈ لے ملکِ عدم میں تو مکاں کوئی

بند رکھتا ہو زبانِ التجا، شوقِ سکوت
اب وہ سوداے محبت سر سے ہی جاتا رہا
اپنی پر حسرت نگاہیں چشمِ حیراں ہو گئیں
ہمتیں رنجِ دالم سے پا بجھ لائیں ہو گئیں

رابعی

دنیا تو دِ بالِ جاں ہے پیری کے لیے
طالبِ پیری میں کب کوئی ساتھ چلے
ہے خواہشِ پرواز اسیری کے لیے
ہاں، ایک عصا ہے دستگیری کے لیے

عارف عباسی بلیاوی۔ قاضی محمد عثمان عباسی

ان کا شجرہ نسب حبر امت۔ حضرت عبداللہ عباس سے ملتا ہے۔ یہ خاندان پہلے چریاکوٹ (ضلع اعظم گڑھ) میں مقیم تھا۔ ضلع بلیا میں بلیتھار وڈریوے اسٹیشن سے کوئی چار میل دور ایک گاؤں پسوہاری ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ چریاکوٹ سے نقل مکان کر کے پسوہاری میں آئے۔ یہاں حکومت وقت نے ان کی مناسب قدر و منزلت کی اور سکندر پور غازی کی قضاۃ ان کے سپرد کر دی۔

عارف کے والد قاضی محمد سلیمان عباسی صاحب علم بزرگ تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی کی تحصیل دیوبند اور دلی کے مدارس میں کی تھی؛ لیکن اس کی تکمیل نہیں کر سکے تھے۔ انھوں نے ساری عمر کہیں ملازمت نہیں کی؛ اپنی گھر کی زمینداری کی دیکھ بھال میں مصروف رہے اور اسی اکل حلال پر قانع تھے۔

عارف صاحب یکم مئی ۱۹۱۲ء کو پسوہاری ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر بمشکل سات آٹھ برس کی ہو گئی جب ان کے والد قاضی محمد سلیمان اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی حسبِ درخواست نہ ہو سکی۔ انھوں نے امیر الدولہ اسلامیہ

تذکرہ معاصرین

لکھنؤ سے دسویں درجے کی سند لی اور اس کے بعد کرسچین کالج لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ انٹر تک یہاں تعلیم پائی اور اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کی ٹھانی؛ لیکن گھر کے ناسازگار حالات نے یکجہتی کی فرصت نہ دی؛ آخری سال میں یہ سلسلہ ترک کر دینا پڑا۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔

سبر اوقات کے لیے اب انھوں نے کالون تعلقہ دار کالج لکھنؤ میں مدرسہ کر لی۔ یہاں والیان ریاست اور تعلقہ داروں کے نوہال تعلیم پاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے ساتھ اس کالج کے حالات بھی دگرگوں ہو گئے، تو عارف صاحب یہاں کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ریاست ناپارہ اور محرمی تعلقہ (ضلع کھیرٹری) میں صاحبزادگان کے تالیق کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۹ء تک رہا۔ اس سال انھوں نے آخری مرتبہ غلامی سے گلو خلاصی پائی۔

اس کے بعد انھوں نے کہیں ملازمت نہیں کی۔ بقیۃ زندگی اپنی آبائی کاشتکاری کی نگرانی میں لگے رہے۔ اس کے ساتھ کچھ تجارت کا سلسلہ بھی کر لیا تھا۔ انھوں نے مہینوار و ڈ (ریلوے اسٹیشن) میں سمنٹ کی دکان کر لی، جس سے نفعیہ اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ عزت و آبرو کے ساتھ گھر کا اجلا خرچ چل جاتا تھا۔

صحت بالعموم اچھی رہی، جو سادہ اور آواز زندگی کا خالقہ ہے؛ لیکن دو برس ہوئے، بیوی کی موت (۱۵ اگست ۱۹۶۹ء) نے اس پر بہت برا اثر ڈالا۔ ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء کو دل پر پہلا حملہ ہوا۔ علاج معالجے میں کوتاہی نہیں ہوئی؛ لیکن بیسود۔ اپنے عزیز دوست حکیم سیف الدین کے پاس میرٹھ شہر گئے ہوئے تھے کہ وہاں دوسرا حملہ ہوا۔ اسی میں ۲۶ ستمبر ۱۹۷۰ء کو صبح ساڑھے پانچ بجے روح قفسِ عمری سے پرواز کر گئی۔ وہیں تدفین عمل میں آئی۔ حکیم صاحب موصوف کے خاندانی قبرستان شاہ سلطان میں آخری خواجگاہ نصیب ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے، گویا میرٹھ کی مٹی ہی نے انھیں وہاں کھینچ بلا لیا تھا۔

اپنے پیچھے اولاد جسمانی میں پانچ بیٹے اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے۔ سب سے بڑے سعید القلندر
الہ آباد یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ انھیں بھی علم و ادب سے شغف ہے۔ اور سعید عارفی کے
قلمی نام سے لکھتے ہیں۔

عارف نے شعر گوئی اگرچہ زمانہ طالب علمی ہی میں شروع کر دی تھی، لیکن اس میں باقاعدگی
۱۹۴۱ء میں آئی۔ ابتدا میں آزاد فنیوری اور حکیم سید باقر حسین شاعر لکھنؤی سے (ف ۱۹۴۲ء)
مشورہ رہا۔ بعد کو جگر مراد آبادی سے مستقلاً تلمذ اختیار کر لیا۔ حبیب احمد صدیقی نے بھی
ان کی ذہنی اور فکری تربیت میں خاصی دلچسپی لی تھی۔ وہ خوش فکر اور زود گو اور رپر گو
شاعر تھے، مگر افسوس کہ کلام کی تدوین سے متعلق بہت بے پروا رہے۔ چنانچہ کوئی مجموعہ
سج تک شائع نہیں ہوا۔ ان کے بڑے صاحبزادے سعید عارفی اسے مختلف رسائل و
جرائد سے فراہم کرنے کی فکر میں ہیں۔

دولت کو نین ہے، مگر غم ملے	غم بھی وہ، جو ہر نفس پریم ملے
مجھ کو ہر غم سے ہو گئی ہے نجات	تیرے غم کے یہ فیض، یہ برکات
وہ تو کہیے، تیرے غم نے بڑا کام کیا	ورنہ مشکل تھا غم زلیست گوارا کرنا
حسن کی فطرت، مکمل احتیاط	عاشقی، بیگانہ سودوزیاں
نظر آتی ہو جس کی روشنی میں اک نئی منزل	خدا رکھے، ترا نقش قدم ایسا بھی ہوتا ہو
لالہ دگل کہیں خورشید و قمر ہوتا ہے	حسن ہر رنگ میں فردوس نظر ہوتا ہو
میری اس نیند پہ بیداری کو نین نثار	آنکھ لگتے ہی ترے پاؤں پہ سر ہوتا ہو
اب منی جاتی ہے یہ لذت ناکامی بھی	کیا قیامت ہو کہ آہوں میں اثر ہوتا ہو
ایک وہ بھی طلب و شوق کی منزل ہو جہاں	حسن خود ساتھ مرے گرم سفر ہوتا ہو
اللہ اللہ، یہ مرے حسن تصور کا فروغ	دل میں اک شمع سی روشن ہو تری یاد کے ساتھ
وہ روئے زیبا، فردوس رنگیں	وہ قد رعنا، تکمیل محشر

تذکرہ معاصرین

حسن قسم، نازِ گلستاں موجِ نفس میں تسنیم و کوثر
 ہر جنبش لب، اعجازِ فطرت ہر لغزشِ پا، آشوبِ محشر
 علِ بیگناہِ حسنِ یقیں ہے بنائے زندگی ہو خاکِ محکم
 ہے یقیں کے دم سے روشن کائنات اے اسیرِ حلقہ، وہم و گماں
 عکسِ خرد سے دنیا اندھیری نورِ جنوں سے عالم منور
 جہاں تک جس کو احساسِ نظر ہے وہیں تک حسن میں رعنائیاں ہیں
 محبت میں محبت کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہو کہ دل روتا ہو، اور منہتے ہیں ہم ایسا بھی ہوتا ہو
 محبت میں کبھی چشمِ کرم بھی بار ہوتی ہے گلوں اشکِ شبنم کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہو
 زبانِ عشق بن جاتی ہو اکثر بے زبانی بھی نگاہوں سے برس پڑتا ہو غم، ایسا بھی ہوتا ہو
 ہجومِ غم میں بھی عارفِ بسکوں محسوس کرتا ہو خوشی سے بھی الجھ جاتا ہو دم، ایسا بھی ہوتا ہو
 پھونک کر میں نے آشیانے کو روشنی بخش دی زمانے کو
 وہ ترا غم تھا، جو سنوار گیا زندگی کے نگارِ خسائے کو
 جس کی دیوانگی مونا زِ خرد کون سمجھائے۔ اسِ دوائے کو
 کچھ حجابات اٹھ گئے عارِ عات کچھ حجابات ہیں اٹھانے کو
 تری ہی سمت محبت کے قدم اٹھتے ہیں موڑ آنے سے کہیں راہ بدلی جاتی ہو!
 کیا کیجیے اب اس کو کہ دل بیٹھ رہا ہے اے دوست! میں اٹھنے کو تو اٹھا ترے در
 کیا بات ہو آج ان کو نہ امت سی ہو عارِ عات کیا پاگئے وہ کچھ، مرے اندازِ نظر سے
 رہو والدِ بردہ تسلیم و رضا ہیں یہ لوگ شکوہ غم تیرے شاییت، غم کیا کرتے
 وہ جو ناموسِ مشیت کے میں ہیں عارف! وہ ثنا خوانی، اربابِ کرم کیا کرتے!
 عشرتِ بنیم نگا ہی بھی غنیمت سمجھو فرصتِ شوق کے لمحات کہاں ملتے ہیں!
 دلِ حشر آندو، نظرِ شرحِ آذر کس کی نگاہِ بلفہ ہو سائل، نہ پوچھیے

تذکرہ معاصرین

گم ہو گیا جو اپنے ہی جلوؤں کے حسن میں اس کا میاں دید کی مشکل نہ پوچھیے
وہ نگاہِ مست کی گردشیں کہ ہزار جامِ شاد ہوں

وہی دورِ بادِ بے سبب، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
نہ سکون تھا کسی حال میں، نہ قرار تھا کسی رنگ میں

تمہیں پا کے کبھی وہی سبب، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

منظر اکبر آبادی، شمشاد حسین صدیقی۔

منظر، اردو کے مشہور شاعر جناب سیاب اکبر آبادی (ف ۱۹۵۱ء) کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت والد مرحوم کی نگرانی میں پائی۔ لیکن کمزوری صحت اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہ میں حائل ہوئی۔ سیاب مرحوم اپنی ملازمت کے سلسلے میں کانپور کے بعد اجیرا ٹونڈلہ، اگرہ وغیرہ میں رہے۔ منظر کا بچپن بھی انھیں مقامات میں بسر ہوا۔ ٹونڈلہ کے قیام کے زمانے میں یہ وہاں کے ریلوے ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے، لیکن ابھی دسویں درجے تک نہیں پہنچے تھے کہ سیاب وہاں سے چلے آئے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں اور سب کام سے ہاتھ اٹھا کر اگرہ کے میں قصر الادب کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کی طرف سے ایک ماہنامہ پیمانہ جاری کیا۔ منظر اپنی کمسنی کے باوجود اس ادارے سے وابستہ ہو گئے؛ ادویوں تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد کچھ فارسی عربی اور اردو مدرسہ عالیہ، جامع مسجد اگرہ اور مدرسہ محمدیہ اگرہ میں حاصل کی۔

قصر الادب کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف پرچے شائع ہوتے رہے جن میں ہفتہ وا

تذکرہ معاصرین

تاج، ثریا، شاعر، کنول، مشورہ، ہفتہ وار ایشیائی خاص طور پر شہرت حاصل کی۔
منظر کسی نہ کسی حیثیت سے ان سب سے متعلق رہے اور غالباً پندرہ برس تک ایشیا
کے ایڈیٹر رہے۔

جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی، اس میں شعر گوئی گویا لازمہ حیات تھی۔ یہ بھی
بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے، اصلاح اپنے والد سے لی۔ اگرچہ غزل بھی کہتے تھے،
لیکن زیادہ مزاح و لہجہ نظم سے رہی۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں سیما بک کراچی میں انتقال ہو گیا، تو منظر صاحب آگرے سے پاکستان
چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے ایک ماہنامہ 'پرچم' کے نام سے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ
واقع ہے کہ پاکستان میں پریشان حال رہے۔ انھیں حکومت پاکستان کی طرف سے ادبی
وظیفہ ملتا تھا۔ تندرستی ادھر بہت دن سے خراب چلی آ رہی تھی۔ ضیق النفس کا عارضہ تھا۔
لیکن اس کے باوجود بظاہر تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اچانک ۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء شب بیکانہ
کا شدید دورہ پڑا جس سے ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اور دس منٹ بعد آٹاٹا
ساڑھے دس بجے روح قفسِ عسری سے پرواز کر گئی۔

کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

اب نمونے کے چند شعر دیکھیے، جو مختلف رسائل سے جمع کیے گئے ہیں:

میں پوچھتا ہوں یہ دنیا کے بامرادوں سے وہ کیا کرے کہ جو ناکام آرزو ہو جائے
جسے منظور ہو بربادی مطلق، منظر! آئے، وہ جامہ ہستی کا گریباں ہو جائے
رہا کہیں تھا کہ تھی ہر چیز پر اک سا دگی ظاری۔ جوانی ہو کہ اک دنیا جواں معلوم ہوتی ہو
عبادت ہو کہ سجدے روز کو تباہوں خدا کو میں طبعیت ہو کہ اب تک بت پرستی کو ترستی ہو
دیکھیے، کس نام سے ہو ذکر مرگ عاشقی نام میری بخیو دی کا زندگی مشہور ہو
تو ہے چپ فضا خاموش بچھے شب کا ساٹا مناسب وقت ہو، دل چاہتا ہو اک فنکار کی

تذکرہ معاصرین

اب کہیں تیری تمنا کا ٹھکانا بھی نہیں دیکھ انجام، تمناؤں کے ٹھکرانے کا
 مراد لے مر گیا، تو زندگی کو روینگی دنیا نشاطِ محفل بہتی عبارت ہو مرے دل سے
 عجب ایک چیز ہو انسان کا ہونا بھی نہ ہونا بھی جہاں آباد ہوتا ہے، وہیں برباد ہوتا ہو
 کبھی مثلِ غیر رسماً مرا حال پوچھ لیتا جو نہ چارہ ساز تھا تو، تو زمانہ ساز ہوتا
 برباد کر کے دے نہ فریب التفات کے اب ہم تری نگاہ کے قابل کہاں رہے
 جب میں نہ تھا، تو دل کا نعتین محال تھا جب دل نہ تھا، تو آپ کے جلوے کہاں رہے
 جدید ہو کوئی تصویرِ زہنِ فطرت میں بنا بنا کے ہیو لے مٹائے جاتے ہیں
 بیکار ہو، جنوں سے بھی فرصت اگر ملے اب اتنی دوا لوٹ کے جائیں، تو گھر ملے

سامی، مہادیو پرشاد

بی (یوپی) کے ایک متوسط الحال کاشتہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد کا نام
 پرشاد تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے: بڑے شامہ داس پرشاد تھے اور چھوٹے ہی مہادیو پرشاد۔
 پرشاد ۲ جولائی ۱۸۹۵ء کو ہردوئی میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم جوہلی
 ہائی اسکول، لکھنؤ میں پائی۔ اس کے بعد کیننگ کالج میں داخلہ لیا۔ بی ایس سی آخری سال
 میں تھے کہ والد چل بسے۔ چونکہ اس کے بعد مالی حالت ٹھیک نہ رہی، اس لیے تعلیم کا
 سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب انھوں نے ضرورتاً فیض آباد کے ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ چندے
 بعد مارل اسکول، جیلپور میں منتقل ہو گئے، اور پھر گویا عمر بھر کے لیے یہیں کے ہو رہے۔
 ۱۹۲۰ء میں محکمہ تعلیم نے انھیں تدریس کی تربیت حاصل کرنے کے لیے منتخب کیا۔
 جس کی سند اسپینس ٹریننگ کالج، جیلپور سے سند حاصل کی، اور اس کے بعد
 وہ بی گورنمنٹ کالج ہائی اسکول میں مدرس مقرر ہو گئے۔
 ۱۹۳۹ء کے اواخر میں تھکارتی سجھا، جیلپور نے انھیں تھکارتی سٹی کالج میں اردو فاری
 کا لکچرر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اردو یا فارسی میں ایم اے نہیں تھے۔ اس لیے

تذکرہ معاصرین

یونیورسٹی اپنے قواعد کی رو سے ان کے انتخاب پر بجا طور پر معترض ہو سکتی تھی، لیکن ان کی مسئلہ قابلیت اور تجربے کے پیش نظر ناگپور یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے استثنائی طور پر ان کے تقرر کی اجازت دے دی۔ اس پر انھوں نے جنوری ۱۹۴۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور بقیہ عمر اگما ہتھ کارنی کالج میں گزار دی۔ اپنی گرتی صحت اور سیرانہ سالی کے باعث وہ یہاں سے ۱۹۷۰ء میں سکندرشہ ہونے لگے۔

پچھلے کئی برس سے ان کی صحت تشلی نخش رہی تھی۔ ان کی بڑھ کی بڑی میں کچھ نقص پیدا ہو گیا تھا، جس سے گردن میں بھی کچی آگئی تھی۔ مزید مصیبت یہ کہ نجی حالات بھی بہت ناخوشگوار ہو گئے۔ خانگی جاداد سے متعلق کچھ تنازعہ پیدا ہو گیا اور نوبت عدالت تک پہنچی۔ مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا۔ اور وہ پریشان رہنے لگے۔ اسی زمانے میں ان پر فاج کا حملہ ہوا، اور اس کے بعد اس کے متواتر حملے ہوتے رہے۔ آخری حملہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو ہوا اور اسی دن سہ پہر کے پانچ بجے وہ میڈیکل کالج میں جان بحق ہو گئے۔ لا ولد فوت ہوئے۔

جیسا کہ ذکر ہوا وہ گھر کے ناموافق حالات کے باعث اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے، لیکن خداداد ذہانت اور ذاتی جدوجہد سے انھوں نے یہ کمی پوری کر لی۔ سائنس کے وہ طالب علم رہے تھے۔ اس کے علاوہ ریاضی میں ان کی ہمارت کا کچھ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپی ایچ ڈی کے طلبہ اور پروفیسران سے مشورہ کرتے اور رہنمائی حاصل کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں بھی اچھی دستگاہ پیدا کر لی تھی، جب سے وہ بہت دن تک مدھیہ پردیش کے فارسی بورڈ کے صدر کے عہدے پر فائز رہے۔

شعر و سخن سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ جب شعر کہنے لگے، تو افتخار الملک مضطر خیر آبادی سے مشورہ کیا۔ افسوس کہ ایک نعتیہ نظم (ردیت حسنہ) کے علاوہ جو جذباتی

کے عنوان سے شائع ہوئی تھی، سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا؛ اتنا اطمینان ہے کہ وہ محفوظ ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔

اس نعتیہ نظم کی شان نزول یہ ہے کہ فروری ۱۹۲۷ء (یعنی شب ۵/۶ شعبان ۱۳۴۵ھ) کو مغرب کے بعد ایک ستارہ ٹوٹا اور آسمان آسمان کی روشنی سے آسمان پر لفظ محمد ظاہر ہوا یہ منظر کم و بیش آدھ گھنٹے تک دکھایا گیا اور پھر بتدریج مدھم مدھم ہوا مٹ گیا۔ یونانی اور مدھیہ پریش (سی پی) کے متعدد شہروں میں ہزاروں اشخاص نے اسے دیکھا۔ اس زمانے کے اخباروں میں بھی اس کا بہت چرچا رہا تھا۔ اس سے متعلق یکم مارچ ۱۹۲۷ء کو جیلپور میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جس کے کوائف ستارہ محمدی کے عنوان سے علی احمد جیلپوری نے شائع کیے تھے۔ اس مجموعے میں سامی کی اس نظم اور بیت حسنہ کے علاوہ تین فارسی رباعیاں، ایک فارسی قطعہ اور ایک فارسی نعت بھی شامل ہیں۔ یہ نظم 'رویت حسنہ' انھیں آیام میں جذبات سامی کے عنوان سے بھی چھاپی گئی تھی۔ یہ مسدس کی شکل میں ہے۔ اس میں سترہ بند (۵۱ شعر) ہیں۔

غزل کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں

سامی کی حقیقت کیا احباب کی شفقت ہے

اچھوں کو تو اچھا ہی اچھا نظر آتا ہے

عشق میں لٹے ہیں اکثر کارواں منزل کے پاس

غرق ہو جاتی ہیں اکثر کشتیاں ساحل کے پاس

تم تھے تو نگاہوں میں دیرانہ گلستاں تھا ہم آج گلستاں کو دیرانہ سمجھتے ہیں
اک ہم ہیں کہ غیروں کو اغیار نہیں سمجھا اک آپ ہیں انہوں کو بیگانہ سمجھتے ہیں

نیکوں کے بھی بدے اب بدی سے ملتے ہیں

دوستی کے سب پہلو دشمنی سے ملتے ہیں

تذکرہ معاصرین

ابھیں غرض کہ صدائیں سنیں غریبوں کی یہ بخودی تھی ہماری جو ہم پکا لائے
ایسی پریش سے تو بہتر تھا تغافل تیرا حال یوں پوچھا کبھی جیسے شناسائی نہ تھی
اب انھیں میری وفا کا اعتبار آیا، تو کیا! بعدِ مردن، مژدہ دیدار بھی آیا، تو کیا!
جہاں سارا ترا آئینہ صورت نما نکلا کہ جس بت کو نگاہِ غیر سے دیکھا، خدا نکلا
ایک مدت کے جو کچھ کہ نہ سکا تھا سامی میں درِ حضرتِ مضطر پہ جس میں سانا ہوا

افقر موبانی، سید محمد حسین

محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاً (ف ۱۳۲۵ء) کے خلیفہ حضرت نصیر الدین (ف ۱۳۵۶ء) چراغِ دہلی کے نام سے کون صاحبِ علم واقف نہیں ہوگا! انھیں کے خلیفہ اور جانشین حضرت سید محمد گیسو دراز تھے (ف ۱۴۲۲ء) جن کا مدفن گلبرگہ میں ہے۔ ان سے آگے یہ سلسلہ طریقت چلا۔ ان کے خلفائے سچ حضرت سید شاہ عبد الحکیم عرف دادامیاں اولاً بہت دن کا لپی (ضلع جالندھر) میں مقیم رہے اور پھر ۸۵۰ھ میں وہاں سے نقل مکان کر کے قصبہ موبان (ضلع آٹاؤ) میں اقامت گزیر ہو گئے۔ یہی دادامیاں ہمارے شاعر سید محمد حسین افقر موبانی کے جدِ عالی تھے۔ حضرت دادامیاں کی آنکھوں پشت میں افقر کے دادا مولانا شاہ غلام علی پیرزادہ عرف میاں جی ہوئے۔ پیری مریدی کا یہ سلسلہ رشد و ہدایت انھیں پر ختم ہو گیا۔ ان کے جانشین مولانا سید اکرام علی افقر موبانی کے والد تھے۔ یہ ۱۸۴۵ء میں موبان میں پیدا ہوئے انھوں نے عربی فارسی اور علوم دینیہ کی تعلیم اپنے والد یعنی حضرت میاں جی سے پائی۔ وہ چاہے تو یہ سجادہ نشینی جاری رکھتے، لیکن انھوں نے یہ سلسلہ بیعت قائم نہیں رکھا؛ اور خود سید حاجی وارث علی شاہ، دیوبہ (ف ۱۹۰۵ء) کے مرید ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

تذکرہ معاصرین

انہوں نے قصبہ موہان اور قرب حصار کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔
۱۹۱۸ء میں پنجو ریں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، بسمل تخلص
تھا۔ 'افقر صاحب' ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ان کا کلام دیوان کی شکل میں مرتب نہ ہو سکا،
صرف کچھ اوراق میرے پاس موجود ہیں۔

افقر جیسا کہ انہوں نے خود مجھے اطلاع دی تھی ۱۳ جولائی ۱۸۸۷ء کو اپنے وطن مالوہ موہان
میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے محمد حسین کے علاوہ ان کا تاریخی نام "ظفر وارث" بھی رکھا
جس سے ۱۸۸۷ء برآمد ہوتے ہیں؛ ان کے تہ تکلف معاصرین آخر تک انھیں اسی تاریخی
نام سے کارتے رہے۔ افقر کی ناخیاں قصبہ آسیون (ضلع اناؤ) میں تھیں۔ چنانچہ ان کی
ابتدائی تعلیم یہیں اپنے ماموں مولانا ضیا الدین قادری کی نگرانی میں ہوئی۔ اس کے
بعد یہ موہان آگئے اور اب دینیات اور دوسرے علوم رسمہ کی تحصیل میں لگ گئے۔
انہوں نے مقامی اردو ٹل اسکول سے ۱۹۰۱ء میں بعمر ۱۴ سال ٹل کا امتحان پاس
کیا۔ اس کے بعد رسمی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں وہ مستقلًا لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں انہوں نے حکیم عبدالعزیز (جھواری ٹولہ) سے
طب کی تعلیم پائی، لیکن انہوں نے کبھی باقاعدہ مطب نہیں کیا۔ جب فکرِ معاش ہوئی،
تو ۱۹۰۷ء میں مطبع نوکشور میں مصحح مقرر ہو گئے۔ یہ سلسلہ بہت دن تک رہا۔ کئی سال
بعد سرکاری ملازمت مل گئی اور وہ کورٹ آف وارڈس میں ضلعدار مقرر ہو گئے۔ اس کے
بعد تحصیل میں ناظر اور واصل باقی نويس کے عہدوں پر بھی رہے؛ ان کا زیادہ تر زمانہ
لیج آباد (ضلع لکھنؤ) میں گزرا۔

افقر ۱۹۱۲ء میں بمبئی چلے گئے۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ وہاں کے ایک سیٹھ حاجی منشی
محمد حسین لکھنؤ آئے جب وہ مطبع نوکشور گئے، تو یہاں ان کی ملاقات افقر سے
ہوئی۔ منشی محمد حسین کا ایک ہفتہ وار پرچہ 'مفید روزگار' تھا؛ وہ اس کے لیے کسی

ایڈیٹر کی تلاش میں تھے۔ جب وہ افقر صاحب سے ملے تو انھیں بھیجی آنے اور مفید رکارڈ کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ افقر نے اسے قبول کر لیا اور اپنی سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر بھیجی چلے گئے۔ یہاں وہ تین برس ۱۹۱۵ء تک رہے مفید رکارڈ کے ایڈیٹر تو تھے ہی، منشی محمد حسین کے ایما پر انھوں نے ایک مزاحیہ پرچہ مولانا پیچ، بھی جاری کیا۔ لیکن بھیجی کی مرطوب آب و ہوا انھیں راس نہیں آئی، اب وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ بالآخر انھوں نے تنگ آ کر ان صحافتی سرگرمیوں پر لات ماری اور لکھنؤ کی راہ لی۔ اس سے معاش کا مسئلہ تو حل نہیں ہو سکتا تھا۔ بارے مطبع نو لکھنؤ کے تنظیمین نے دستگیری کی اور یہ دوبارہ اپنی پرانی جگہ پر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں وہ ڈسٹرکٹ گزٹ کے مدیر ہو کر گوئندہ چلے گئے۔ یہ کانگریس اور خلافت کی سرگرمیوں کی روز افزوں ترقی کا زمانہ تھا، ان دونوں کے خلاف حکومت کے پراگندے کی مشین تیزی سے کام کر رہی تھی، اور اس کام کے لیے سب ضلعوں سے گزٹ شائع ہونے لگے تھے۔ گوئندہ گزٹ بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ ۱۹۲۲ء میں یہ گزٹ بند ہو گیا اور افقر صاحب لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں ان کا باجا وادائے دے کے نو لکھنؤ چھاپہ خانہ تھا، اب کے انھیں صحافتی تجربے کے پیش نظر روزانہ اودھ اخبار کا نائب مدیر مقرر کیا گیا۔

اس زمانے میں سید جالب دہلوی (ف جولائی ۱۹۳۰ء) لکھنؤ میں ہمد اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ افقر صاحب سے ان کے دید و دید کے تعلقات تھے، جالب کے مشورے سے افقر نے ماہنامہ جام جہاں نما، جاری کیا، اس کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۲۷ء میں نکلا تھا۔ اس میں لکھنؤی اسلوب بیان اور طریق سخن پر بڑی کردی تنقید شائع ہوئی، جس سے یہاں کے شعرا اٹھ اٹھے، اور انھوں نے افقر کے خلاف باقاعدہ محاذ بنالیا۔ مخالفوں کے نام لکھنے سے فائدہ؟ یہ سمجھیے کہ عزیز، آرزو، بخود مولائی، آسنی الدئی، امید چھوٹی

وغیرہ تو البتہ غیر جانبدار رہے، بقیہ تقریباً تمام بڑے اور چھوٹے شاعران کے خلاف ہو گئے تھے لیکن اصغر گوندوی، بنجو دموہانی، اور اثر لکھنوی جام جہاں نما کے ممتاز مضمون نگار تھے۔ جب لکھنوی شعرا کی دھمکیاں مسیو ثابت ہوئیں، تو متعدد حضرات نے متاک عزت کے مقدمے دائر کر دیے۔ انقر نے ان کے اوجھے حملوں کے آگے متھیارد ڈالنے سے انکار کر دیا اور ڈٹ کر مقابلہ کیا؛ اور بالآخر خالفوں کو ہر میدان میں زک اٹھانا پڑی۔ یہ پرچہ اپنی پوری ان بان سے ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ اس کے سبب ہو جانے کے بعد وہ پانچ چھ برس تک پڑھاتے رہے، جہاں سے ۱۹۵۰ء میں سکندوش ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں اتر پردیش کی حکومت نے ان کا ایک سو روپیہ ماہانہ ادبی وظیفہ مقرر کر دیا، جو انھیں اپنی وفات تک ملتا رہا۔ توکل اور صبر و شکر انھیں ورثے میں ملا تھا؛ اس لیے اس قلیل وجہ معاش کے باوجود انھوں نے کبھی شکایت کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی حضرت دارث علی شاہ (دیوہ) کے مرید تھے۔ ان کے نام کے ساتھ دارثی کا اضافہ اسی مناسبت سے تھا جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، انھیں معلوم ہو گا کہ وہ بالعموم ایک گیر و اتہد باندھے رہتے تھے۔ یہ بھی دارثی گردہ کا اتیازی نشان ہے۔ ان کے سرے میں عین پینگ کے اوپر حضرت دارث علی شاہ کی ایک تصویر لٹکی رہتی تھی، اگرچہ اس پر ایک پردہ پڑا رہتا تھا۔

انھوں نے اپنے پیر کی یاد منانے کو ۱۹۰۵ء میں سالانہ طرحی مشاعرہ کی بنیاد رکھی تھی؛ یہ مشاعرہ اپریل کو ہوا کرتا تھا۔ اسے وہ اپنی زندگی بھر باقاعدگی سے کرتے رہے۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ مصرع طرح ہمیشہ ہرج مٹمن سالم میں ہوتا اور قافیہ آستان۔ اس کے لیے وہ شاعروں کو دعوتنامہ بھیجتے تھے؛ اور ان شاعروں کے علاوہ اور کسی کو کلام پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ چونکہ وہ بہت کمزور رہنے لگے تھے اور کمزوری روز بروز رہتی تھی؛ اس لیے انھیں معلوم تھا کہ اب وہ

زیادہ دن جیسے کے نہیں۔ چنانچہ آخری مشاعرے کے موقع پر انھوں نے اپنے احباب اور ملائذہ سے ان کے نام لے کر یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس مشاعرے کو آئندہ بھی جاری رکھیں۔ سال رواں کے مشاعرے میں انھوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ آئندہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہیں ہو سینگے۔ وی ہوا۔

کبرنی کا عالم تھا۔ ۸۴ برس کی عمر ہندستان کے معیارِ عمر کو دیکھتے ہوئے کم نہیں ہی۔ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ بہت معذور ہو گئے۔ سال گذشتہ دوسرا حملہ ہوا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اب دنوں کے یہاں ہیں، لیکن موت کا بہانہ قلبی دورہ ہوا۔ وہ ایک زمانے سے محلہ لاٹ کلن (ماموں بھانجے کی قبر کے موڑ پر) لکھنؤ میں رہتے تھے۔ یہیں مشکل کے دن ۲ نومبر ۱۹۶۹ء ۱۲/۱۲ رمضان ۱۳۹۱ھ کو بعدِ مغرب انتقال ہوا۔ تدفین اگلے دن (۳ نومبر) بعدِ ظہر ہوئی۔ نمازِ جنازہ ان کے رشتے کے بھتیجے محمود اختر دارلش نے پڑھا۔ عیش باغ کے قبرستان میں قبر نصیب ہوئی۔

ابھی وہ نڈل اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ انھوں نے (۱۹۰۰ء میں) شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا سب سے پہلا شعر تھا :

دل غنی ہے تو مفلسی کیا ہے

گھر میں اللہ کے لمی کیا ہے

یہ شعر ان کے خاندان کے مذہبی ماحول کا ترجمان ہے۔ جس زمانے میں یہ لکھنؤ آئے ہیں یہاں حکیم ضامن علی جلال (ف ۱۹۰۹ء) اور نشی امیر اللہ تسلیم (ف ۱۹۱۱ء) دو صاحبِ فنِ سادہ موجود تھے۔ چونکہ فقر کو مومن (ف ۱۸۵۲ء) کے کلام اسے شغف تھا، اس لیے انھوں نے تسلیم کی شاگردی اختیار کی۔ تسلیم خود نواب اصغر علی خاں نسیم (ف ۱۸۶۶ء) کے شاگرد تھے جن کا مومن کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس طرح فقر کا سلسلہ سخن تیسری پشت میں مومن سے جا ملتا ہے۔ اصغر گو نڈوی (ف نومبر ۱۹۳۶ء) اور حسرت موہانی

(ف ۱۹۵۱) ان کے خواجہ تاش تھے۔ فقرہ ۱۹۰۵ء کے آخر میں تسلیم کے شاگرد ہوئے؛ حسرت ان سے دو تین سال پہلے شاگرد ہو چکے تھے اور اصفی گونڈوی دو تین سال بعد آئے۔

ان کی کچھ تصنیفات شائع ہو چکی ہیں: (۱) رسائل تصوف، پانچ حصے (لکھنؤ ۱۹۱۵ء)؛ (۲) عید کی ڈالی (لکھنؤ ۱۹۱۷ء)؛ (۳) سعی عمل (نظمیں) (الہ آباد ۱۹۲۲ء)؛ (۴) مختصر سوانح عمری حضرت حاجی دارث علی شاہ (لکھنؤ ۱۹۳۳ء)؛ (۵) فردوس معانی (پہلا دیوان) (لکھنؤ ۱۹۲۷ء)؛ (۶) رہنمائے شاعری حصہ اول (لکھنؤ ۱۹۶۰ء)؛ (۷) نظر گاہ (دوسرا انتخابی دیوان) (لکھنؤ ۱۹۶۱ء)؛ (۸) رہنمائے شاعری، حصہ دوم (لکھنؤ ۱۹۶۷ء) ان میں سے دو کتابوں پر ۱۳ اور ۷ پر حکومت کی طرف سے پانچ پانچ سو روپیہ انعام عطا ہوئے۔ ابھی بہت کلام غیر مطبوعہ پڑا ہے جس سے ایک مجلد تیار ہو سکتا ہے۔ نظر اس کے شائع ہونے کا امکان اب کم سی ہے۔ اور جو انھوں نے مصحفی کی تقلید میں شاگرد اور دوستوں میں تقسیم کر دیا، اس کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے!

افقر کو زبان و بیان و عروض پر ماہر نہ قدرت حاصل تھی۔ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ملک کے مختلف حصوں میں موجود ہے جن کی بدولت ان کا نام روشن رہیگا۔ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر سلام سندیلوی بھی ان کے شاگرد ہیں۔

جسمانی اولاد میں صرف ایک صاحبزادہ محشر موہانی تھے۔ وہ طب کے فارغ التحصیل تھے اور طبیب کی حیثیت ہی سے ملازم ہو گئے تھے۔ ان کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ افقر اس زمانے میں حج کو گئے ہوئے تھے، وہ ان کی غیر حاضری میں فوت ہوئے۔ ماشاء اللہ ان کی اولاد موجود ہے۔ ان کے علاوہ دو لڑکیاں شادی شدہ اپنے گھر بار والی موجود ہیں۔ کچھ کلام بطور نمونہ دیکھیے:

وہ کیوں جانے لگا دیر و گرم کی ٹھوکریں کھانے
تبے افقر کو تیرے میکدے پر ناز ہو ساقی!

پکٹائی جمال کی اللہ سے دستیں سو جلوے ہیں بطرہ دیگر، کچھ نہ پوچھیے
 کبھی کو جو یاں جلوہ سرا نہ دیکھا برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
 معاذ اللہ نزاع دیر و کعبہ بحمد اللہ در میخانہ آیا!
 موت کے ڈر سے کانپنے والے موت ہی حاصل حیات نہ ہو
 ہو کرم میں نہاں شتم نہ کہیں! اتنا ممنون التفات نہ ہو
 لے بس آؤ، مل جائیں چھوڑیں ضدوں کو نہ تم بات والے، نہ ہم بات والے
 وہ ہونگے جہاں، صبح کی بات ہوگی جہاں ہونگے ہم، رات ہی رات ہوگی
 جو کچھ چار تنکوں کو ہم جانتے ہیں وہ گلچین و صیاد کم جانتے ہیں
 دل غنی ہے، تو مفلسی کیا ہے گھر میں اللہ کے کمی کیا ہے
 یوں تو تمام رات تڑپتے کٹی، مگر گزری جو دل پہ وقت سحر کچھ نہ پوچھیے
 اس کی دنیا کا عالم نہ پوچھو جس کی دنیا تمھاری نظر ہے
 کسی نے نہ پہچانا ان کو اسی سے ہزاروں تھکے جلوے، مگر ایک ہی ہے
 ہے مقصود دیر و حرم ایک لیکن وہ کافر نے، جو کہے شیخ جی سے
 ہر اسے ان کا وحشی داستان کچھ اور کہتا ہو نہیں ہوتا جہاں کوئی دہاں کچھ اور کہتا ہو
 سب کچھ ہو اور کچھ نہیں ساماں تے بغیر دنیا ہے ایک خواب پریشاں تے بغیر
 مشکل نہیں ہے کوئی بھی ہوتے ہوئے ترے مشکل نہیں ہو کوئی بھی آساں تے بغیر
 جینا ہی کچھ محال نہ تھا تیرے، بحر میں مرنے بھی اپنا اب نہیں آساں تے بغیر
 ہوتا گیا حضور ی جاناں سے دور تر وہ جو کشاکش حق و باطل میں رہ گیا
 گبر مومن کو، تو کافر کو مسلمان کر دے جس کو جو چاہے، وہ غارتگر ایماں کر دے
 اللہ ری تقدیر کی ناکامی پیہم یوں بٹھا ہوں اب، جیسے کوئی کام نہیں ہے
 سنی تو اس نے غیروں سے ہوا گو بدگماں ہم بہر صورت رہی بہتر ہماری داستان ہم

تجلی حسن جاناں کی نہیں موقوف ایمن پر جہاں محسوس کرتا ہوں وہیں معلوم ہوتی ہے
 فکر دنیا، فکر عقبی، فکر حق، فکر سخن چار دن کی زندگی، افقر ہے، کیا کیا کھیے
 خفا وہ ہیں اجل و کھٹی ہو دل بتیاں جہاں مضطر اٹھائے کتب تک ایسی زندگی کی سختیاں کوئی
 اس کی نہیں خدائی کہ اس کا خدا نہیں تم جس کو مل گئے، اسے پھر کیا ملا نہیں
 تے بلب سا غریب دست و خم بس غرض بیا میکہ سے جو بھی نکلا، میکہ ہر دوش تھا
 میں کہنہ گمانہ پریشانی خاطر، ناصح! اور اس نے جو مرا حال پریشاں دیکھا!
 دامن کا چاک، حبیب کا چاک، آستین کا چاک سب مل گئے ہیں چاک گریباں کے آس پاس
 گزرتے ہیں جناب شیخ جب میخانے سے ہو کر نہیں کہتے زباں سے کچھ، مگر ہاں دیکھ لیتے ہیں
 جبین شوق، اندر سجدے میں اتنی کمر سبقت ہر ایک نقش قدم، نقش پاے یار نہیں
 ٹھارے وعدے کا ہولا کھ اعتبار، مگر وہ کیا کرے، جسے قسمت پہ اعتبار نہیں
 دلکش یوں ہی تھی میری محبت کی داستاں دنیا کا اس پہ حسن بیاں کچھ نہ پوچھے
 افقر کو اس کے حال پہ رہنے بھی دیجیے بس جان کر خراب جہاں کچھ نہ پوچھے
 خدا رکھے، غضب کی دلکشی دنیا میں ہو، فقر! جو کلیکا، وہ دے کر جان اس محفل سے نکلیگا
 میں کہے کو ترے کچھ، زاہد! کہتا نہیں بس یہ کہتا ہوں

ہوتے ہوئے ان کی چوکھٹا سراور کہیں خم کون کرے
 مل جاتا ہے جو راہ میں کوئی خراب عشق ذکر اس کا چھیر دیتے ہیں پہرں اسی سے ہم
 جناب شیخ نہ فرمائیں کچھ یہاں، افقر! یہ میکہ ہے، مشائخ کی خانقاہ نہیں

سید عبد اللطیف (ڈاکٹر)

ڈاکٹر سید عبد اللطیف بروز جمعہ ۶ صفر ۱۳۰۹ھ (۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء) کو کراچی (تامل ناڈو) میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت تک پہنچتا ہے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ جہانیاں جہاں گشت اثنا عشری امام دہم حضرت علی نقی (ف ۲۵۲ھ) سے دسویں پشت میں تھے، لیکن فرشتہ سے قبل کی کسی تاریخ یا تذکرے میں اس کا ذکر نہیں ملتا، نہ خود جہانیاں جہاں گشت کے ملفوظات ہی میں کوئی اس طرح کا دعویٰ ہے۔ بعد کے مصنفوں نے فرشتہ کی تقلید کی ہے، لیکن ہر جگہ درمیانی کڑیوں کے ناموں میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ اختلاف ملتا ہے۔ واللہ اعلم اس خاندان کے جو فرد سب سے پہلے ہندوستان آئے، وہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے دادا سید جلال الدین حسین سرخ بخاری ابن سید علی ابوالموید تھے۔ وہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں بخارا سے بھگڑ آئے۔ یہاں سے ملتان پہنچے اور حضرت شیخ بہار الدین زکریا سے علوم باطنی کی تکمیل کی۔ ملتان سے اوچہ گئے، جو بہار و پور سے ۳۸ میل دور دریا سے تلج اور چناب کے سنگم پر ایک مختصر سا قصبہ ہے۔ یہ کسی زمانے

میں بڑا علمی مرکز رہا ہے۔ سید جلال سرخ بخاری کا ۹۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۱ء میں انتقال ہوا۔ وہ اچھ ہی میں مدفون ہیں۔

مخدوم جہانیاں جہان گشت بن سید احمد کبیر بن سید جلال سرخ بخاری کے حالات سے اہل دل کے سینے روشن ہیں۔ وہ صاحب علم و قلم اور برگزیدہ صوفی تھے۔ ان کا بعمر ۷۷ سال چار شنبہ ۱۰ ذی الحجہ ۸۵۷ھ (۲۳ فروری ۱۴۳۸ء) کو اچھ ہی میں انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

اس خاندان نے ہر دور میں صوفیہ کرام اور علمائے عظام پیدا کیے ہیں۔ ان کی ایک شاخ کم نول میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف اسی کو نولی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد شاہ حسین الجینی وہاں کے مشہور عالم و صوفی تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں کم نول میں رحلت کی اور خاندانی بڑاڑ میں اپنے جدِ اعلیٰ حضرت شاہ عبداللطیف قادری عرف یاہو پادشاہ (د ۱۶۷۹ء) کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ یہ سلسلہ ان کی عمر کے بارہویں سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ مقامی ہائی سکول میں بھیج دیے گئے۔ یہاں سے ۱۹۱۰ء میں دسویں درجے کی سند لی۔ اس سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لیے مدراس کرسچین کالج میں داخلہ لیا، یہاں سے ۱۹۱۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ ان کے والد سید شاہ حسین ان کے کرسچین کالج میں داخلے کے خلاف تھے۔ وہ ٹھہرے پرانی وضع کے مذہبی آدمی تھے انھیں اندیشہ ہوا کہ بٹیا زیادہ انگریزی پڑھ کر گمراہ اور بیدین ہو جائیگا۔ لیکن سید عبداللطیف نے یہ برہستہ جواب دے کر انھیں قائل کر دیا کہ اباجان، میں تو انگریزوں سے بے گناہ ہوں کہ اس کے ذریعے سے قرآن اور اسلام کی مقدس تعلیمات کو مغربی ممالک میں عام کر سکوں۔ انھوں نے بچپن کے اس وعدے کو آخر میں پورا

گھر دکھایا۔ کالج میں ان کا خاص مضمون اصول تنقید ادبیات اور تاریخ تنقید ادبیات انگریزی تھا اور اس میں وہ اس سال کے کامیاب طلبہ میں سے اول آئے تھے۔

اس زمانے میں نواب بیگن پٹی کے بھائی میر اسد علی خان مرکزی مجلس وضع قوانین کے رکن تھے۔ ان کی وساطت سے سید عبداللطیف صاحب، سید نواب علی چودھری سے ملے اور ان کے ذاتی سکریٹری مقرر ہو گئے۔ چونکہ سید نواب علی بھی مجلس مذکورہ کے رکن تھے، اس سے ان کا قیام اکثر دلی میں رہتا تھا اور ان کے ہاں ملک کے علماء کی آمد و رفت تھی۔ اس طرح سید عبداللطیف کا ان سے تعارف ہو گیا۔ انھیں میں سربراہ ایم رحمت الد (بہمنی) تھے۔ وہ ان کی قابلیت اور انگریزی میں ہمارت سے خالص طور پر بہت متاثر ہوئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ چند برس بعد جب انھوں نے بہمنی کے مصافات میں پنچ گنی کے پہاڑی مقام پر معمول طبقے کے طلبہ کے لیے ایک پبلک اسکول قائم کیا، تو انھوں نے اس کی پریشانی کے لیے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دی۔ وہ وہاں دو برس تک رہے۔ ۱۹۱۹ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا، تو وہ ۱۹۲۰ء میں یہاں انگریزی کے اسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں ایک اسکیم تیار ہوئی کہ یونیورسٹی کے مختلف مضامین کے چار اسٹنٹ پروفیسروں کو مزید تعلیم کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ ہر ایک کو تین سال کی تعلیمی رہت دی جائے، جس کے دوران میں انھیں نصف تنخواہ ملیگی، مزید ہراں ہر ایک کو خرچ کے لیے تیس ہزار روپیہ قرض بھی دیا جائے، جس پر ان سے سود نہیں لیا جائیگا۔ انگریزی کے شعبے سے ڈاکٹر سید عبداللطیف کے بھیجنے کا فیصلہ ہوا اور ان کے علاوہ خلیفہ عبدالحمید اور پروفیسر وحید الرحمن کا انتخاب ہوا تھا، خیال تھا کہ یہ بی اے آنرز (انگریزی) میں، اعلیٰ ترین سطح پر پیش آئی کہ ریاست کے نمائندہ مقیم انگلستان نے اطلاع دی

کہ تمام جگہیں پر پھیل چکی ہیں، لہذا اس سال داخلہ ممکن نہیں، اگلے برس یعنی ۱۹۲۳ء میں داخلہ ہو سکیگا۔ ان ایام میں ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار سید شاہ حسین حسینی بہت سخت بیمار تھے اور حالت تشویشاک تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ ولایت کا داخلہ ایک برس کے لیے ملتوی ہو گیا ہے، تو یو سی کا اظہار تو درکنار، انھوں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو، بلا ٹلی — اب میں کیوئی سے والد کی خدمت اور تیمارداری کر سکونگا۔ لیکن جب ان کے والد کو صورت حال کی اطلاع ملی، تو انھوں نے سخت مخالفت کی اور اصرار کیا کہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ تم انگلستان جاؤ اور لندن یا آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے اصحابِ حجاز سے ملو، وہ لازماً تمھارے داخلے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیں گے، اور انھوں نے مزید یہ کہا کہ بفکر رہو، تمھاری داسی تک مجھے موت نہیں آئیگی۔ اس حکم کے آگے انھیں سر تسلیم خم کرنا پڑا، اور یہ انگلستان چلے گئے۔

انگلستان میں وہ کنگز کالج (لندن یونیورسٹی) کے صدر شعبہ انگریزی پر فیسر سرائڈ ائبل گولانز کے سامنے پیش ہوئے۔ سرائڈ ائبل اور ان کے ساتھی پروفیسر عبداللطیف صاحب کی انگریزی میں ہمارے اور انگریزی ادب پر عبور سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے پوچھا: آپ بی اے (آنرز) میں داخلے کی جگہ ایم اے یا پی ایچ ڈی کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے؟ بھلا انھیں کیا غدر ہو سکتا تھا! چنانچہ یہ براہِ راست پی ایچ ڈی کی تیاری کرنے لگے۔ مقالے کا موضوع قرار پایا: انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر؛ اور اس کی تیاری اور پیش کرنے کی میعاد تین برس مقرر ہوئی۔ یہ ۱۹۲۲ء کے شروع کی بات ہے۔

۱۹۲۳ء کے وسط میں نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی نے انگلستان اور امریکا کی یونیورسٹیوں کے انگریزی کے پروفیسروں کی پہلی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں شمولیت کے لیے انگلستان کی دوسری یونیورسٹیوں نے اپنا ایک ایک نمائندہ بھیجا، لیکن لندن

یونیورسٹی نے سر ازرائیل گولانز کی سفارش پر دو نمائندے بھیجنے کی منظوری دی: ایک وہ خود اور دوسرے سید عبداللطیف، حال آنکہ وہ ہنوز صرف ریسرچ اسکالرتھے اور پروفیسر نہیں بنے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سر ازرائیل کے دل میں ان کی کتنی وقعت تھی، اور وہ ان کی قابلیت کے کس درجہ قائل تھے۔ اسی سفر میں انھوں نے ہارورڈ اور سیل یونیورسٹیوں کا امریکا میں، اور میک گل کینیڈا میں دورہ کیا۔

امریکا سے واپسی پر سر ازرائیل نے ان سے کہا کہ آپ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں؟ تین سال کی قید تو عام حالات میں ہے۔ مقالے کے لیے آپ کا مواد جمع ہو چکا ہو تو آپ اسے یکجا کر کے قلمبند کر دیجیے! ہم آپ کا مقالہ دو ہی سال میں لینے کو تیار ہیں اس پر انھوں نے دو مہینے کی رخصت لی اور شمالی سکاٹ لینڈ کے شہر سٹریٹھم پیر چلے گئے۔ وہاں ٹھہر کر انھوں نے ایک مختصر نويس کی مدد سے مقالہ مکمل کیا اور لندن واپس آ کر اسے پیش کر دیا۔ لیکن سالانہ جلسہ تقسیم اسناد (کافو کنیشن) کا زمانہ ابھی دور تھا۔ بارے سر ازرائیل کی وساطت اور اثر و رسوخ سے یہ اہم بھی سر ہو گئی، ایک غیر معمولی کافو کنیشن کا انتظام کیا گیا جس میں انھیں سند عطا کی گئی (۱۹۲۳ء)۔ یوں تین برس کی جگہ دو ہی برس میں اپنا کام مکمل کر کے حیدر آباد واپس پہنچ گئے۔

جب یہ انگلستان گئے ہیں، تو یونیورسٹی نے ان سے بھی ایک معاہدے پر دستخط کرائے تھے کہ واپسی پر یہ کم از کم دس برس تک یونیورسٹی کی ملازمت کرینگے، نیز ان کی تنخواہ کا ایک حصہ قرض میں جبراً کرنے کو کاٹا جائیگا۔ چنانچہ دایم حیدر آباد پہنچے، تو یہاں ۵۰۰-۱۰۰۰ روپے کے گریڈ میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جونہی دس برس پورے ہوئے، انھوں نے درخواست دی کہ مجھے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ انھوں نے لکھا کہ میرا ارادہ مزید ملازمت کرنے کا نہیں ہیں کیسوی سے کچھ علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری صرف اتنی درخواست ہو کہ نیشن کم از کم اتنی ضرور ہو کہ شریفانہ بسر اوقات کے لیے کفایت کر سکے، تاکہ معاش کی تشویش

میرے علمی کام کے رستے میں حائل نہ ہو۔ یونیورسٹی کے اصحاب مجاز نے یہ درخواست منظور کر لی۔ اولاً انھوں نے پوری تنخواہ پر ایک سال کی رخصت منظور کی؛ پھر ملازمت کے زمانے میں پانچ برس کا اضافہ کیا، تاکہ نیشن کی رقم کچھ بڑھ جائے۔ لیکن اس سے بھی نیشن دودھائی سوا ماہ نہ سے متجاوز نہیں ہو سکتی تھی۔ جب یہ حالات نظام مروج، میر عثمان علی خان (دف فروری، ۱۹۶۶ء) کے علم میں آئے، تو انھوں نے حکم دیا کہ چونکہ ڈاکٹر سید عبداللطیف کا ملازمت سے دست بردار ہونے سے مددِ عارضہ مست علم ہے، اس کی قدر کرنا چاہیے۔ پس ان کے لیے پوری پانچ سو ماہانہ کی نیشن منظور کی جاتی ہے (جو عام حالات میں پچیس سالہ ملازمت کے اختتام پر دی جاتی ہے)۔

ترکِ ملازمت کے بعد، ۱۹۶۳ء میں انھوں نے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار نیو ایرا (عصر نو) جاری کیا۔ اور اس زمانے میں نظامِ دکن اور ان کی حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیں اور حیدرآباد میں اصطلاحات نافذ کریں، جس سے لوگوں کو ریاست کے نظم و نسق میں شریک کیا جاسکے۔ ۱۹۶۳ء میں نظام کو یہ مشورہ کوئی مردِ قلندر ہی دے سکتا تھا۔ لیکن چونکہ سب ان کے خلوص کے قائل تھے، اس لیے اگرچہ کسی نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا، لیکن ان سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوئی۔

ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی کچھ کم اہم نہیں تھیں، اگرچہ وہ رہیں یکسر ذہنی اور نظریاتی سطح پر کیونکہ انھوں نے عملی سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ چونکہ وہ دہے میں ہماری سیاسی فضا بڑی ہیجان خیز تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ملک کی آزادی کے لیے اصرار کر رہے تھے، لیکن جس بات پر دونوں متفق نہیں تھے، وہ تھا یہ مسئلہ کہ انگریزوں سے گلو خلاصی کے بعد ملک کا دستور کیا ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بھی اس مسئلے پر دور سالے (انگریزی میں) قلمبند کیے تھے: (۱) مسلم کلچر ان انڈیا (ہندستان میں اسلامی کلچر) اور (۲) ڈفرنٹ کلچرل زونز ان انڈیا (ہندستان میں مختلف کلچری خطے) انھوں نے

ان رسالوں میں جو نظریہ پیش کیا تھا، بعد کو اسے ایک باقاعدہ اسکیم کی شکل دے دی جس کی رو سے ہندستان کا دستور وفاقی قرار پاتا تھا۔ ہر ایک وفاقی خطے کے لیے پوری اندرونی آزادی کی سفارش تھی؛ مرکز میں صرف دفاع، امور خارجہ، تجارت، درآمد و برآمد مواصلات کے اہم ذرائع رکھے گئے تھے؛ غیر محبوب اختیارات بھی وفاقی خطوں کو تفویض کیے گئے تھے۔ اس سے وہ مسلم لیگ کے حلقوں میں بھی خاصے معروف و مقبول ہو گئے۔ بلکہ جناح صاحب ان پر بہت اعتماد کرنے لگے۔ مسلم لیگ نے کسی زمانے میں عبداللہ اردن کی صدارت میں ایک فارن کمیٹی بنائی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے نظریے کے مطابق پاکستان اسکیم کا ایک خاکہ وضع کیا جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف بھی اس کمیٹی کے رکن تھے (دوسرے اراکین غلام رسول، ہر، رضوان اللہ، ڈاکٹر انصاف حسین قادری، پیر علی محمد راشدی تھے)۔

اپنی وفاقی اسکیم سے متعلق ان کی فریقین کے زعماء سے خط و کتابت رہی۔ بالآخر گاندھی جی نے مسز سر وجین نائیڈو کی وساطت سے انھیں بمبئی آنے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین سے ملنے کی دعوت دی۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ اس پر یہ بمبئی پہنچے اور کانگریس کے لیڈروں سے ملے۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے شب ۸ اگست کے جس جلسے میں ہندستان چھوڑ دو کی قرارداد منظور کی تھی (اور جس کا ذکر مولانا ابوالکلام آزاد نے غبارِ خاطر کے پہلے ہی خط میں کیا ہے)، ڈاکٹر سید عبداللطیف نہ صرف اس میں موجود تھے، بلکہ دوسرے لیڈروں کے ساتھ شہ نشین پر بیٹھے تھے۔ آدھی رات کے بعد علی الصباح یہ سب لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور انھیں مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا گیا۔ اگر مسلم لیگ چاہتی، تو اب بھی گفت و شنید کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن مسٹر جناح (۸ ستمبر ۱۹۴۷ء) نے جو رویہ اختیار کیا، ڈاکٹر سید عبداللطیف اس سے اتنے دل گرفتہ ہوئے کہ انھوں نے اس کے بعد نظریاتی اور ذہنی سطح پر بھی کل ہند سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اب انھوں نے اپنی تمام

توجہ حیدر آباد کے مسائل پر مرکوز کر دی۔ اسی مقصد سے انھوں نے اپریل ۱۹۴۶ء میں ایک اور انگریزی ہفتہ وار کلیئرین (Clairion) نام کا نکالا۔ یہ پرچہ تین برس تک جاری رہا۔ اس کے آخری شمارے پر ۱۲ مئی ۱۹۴۸ء کی تاریخ ثبت ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مجلس اتحاد المسلمین اور مولوی قاسم رضوی (د فوری ۱۹۴۰ء) کی عاقبت نااندیشی کے باعث حیدر آباد کی فضا بہت کدڑی ہو رہی تھی۔ رہی ہی کس میر تقی علی (د فوری ۱۹۴۱ء) کی وزارت عظمیٰ نے پوری کر دی۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح حیدر آباد کے قائدوں کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ وہ جس رستے پر جا رہے ہیں، وہ تباہی کے غار کی طرف جاتا ہے جس سے ریاست حیدر آباد اور نظام دکن دونوں ملیا میٹ ہو جائینگے۔ لیکن رضوی نقار خانے میں لطیفی طوطی کی صدا کسی نے نہ سنی۔ نتیجہ ہم سب کو معلوم ہے؛ اور اسی کی پیشگوئی انھوں نے کلیئرین کے آخری شمارے کے ادارے میں کی تھی۔

حیدر آباد کے انضمام کے بعد وہ اتنے دل برداشتہ تھے کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے جانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک لطیفہ غیبی کے نتیجے میں انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ بہر حال کچھ دن سکون اور آرام کے لیے پیچ گئی چلے گئے۔ وہاں سے واپس حیدر آباد آئے، تو ان کے وطن کرنول سے ایک وفد پہنچا کہ وہ آئیں اور عثمانیہ کالج، کرنول کی پرنسپل سنبھال لیں۔ اس کالج کے قیام میں خود ان کی مساعی بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں۔ یہاں کا انتظام ابتر تھا اور تنظیم کو اندیشہ ہونے لگا تھا کہ چشم بد دور کالج بند ہو جائیگا۔ وفد کے اراکین ان کے ملنے والے تھے اور مقصد نیک، ان کے اصرار کے سامنے انھیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک دو برس اس کالج کے پرنسپل رہے۔ جب ایک معقول جانشین کا انتظام ہو گیا، تو مستعفی ہو کر حیدر آباد چلے آئے۔ ۱۹۵۲ء میں کرنول سے واپسی کے بعد انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمائش پر

انسٹی ٹیوٹ آف انڈوسٹریل اینڈ کمرشل اسٹڈیز اور اکاڈمی آف اسلامک سٹڈیز کی بنیاد رکھی۔ مولانا آزاد کی وساطت اور سفارش پر انھیں اس کام کے لیے مرکزی اور آئندہ اپریش حکومت نے مالی امداد بھی دی۔ ان دونوں اداروں کی طرف سے تقریباً ۴۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد وہ مولانا آزاد کے بہت قریب آ گئے، اگرچہ وہ انھیں آزادی ملک سے بہت پہلے سے اچھی طرح جانتے تھے۔ مولانا آزاد نے ان سے فرمائش کی کہ وہ ان کے شاہکار ترجمان القرآن کا ترجمہ انگریزی میں کر دیں، اور اس کے لیے انھیں دعوت دی کہ وہ ان کے پاس آکر دلی میں قیام کریں۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء سے مولانا آزاد کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) تک ان کا بیشتر زمانہ مولانا آزاد کے ساتھ بسر ہوا۔ جس دن مولانا کی رحلت ہوئی ہے، وہ یہیں کوٹھی میں موجود تھے۔

میری ان سے پہلی ملاقات مولانا آزاد ہی کے وہاں ہوئی۔ میں ۱۹۵۴ء میں مصر سے آیا، تو حسب معمول مولانا کی خدمت میں بھی سلام کو حاضر ہوا۔ مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہ خود ہمیں دوسرے یاد فرماتے تھے۔ ان کے سکرٹری محمد اہل خان مرحوم مجھے ٹیلیفون سے مطلع کر دیتے کہ کل صبح آجائیے، وقت وہی فجر سے پہلے کا ہوتا۔ میں پہنچ جاتا اور دو تین گھنٹے مختلف موضوعات پر خوب گپ رہتی۔ بالعموم ناشتے کے بعد میں اجازت لیتا کہ اب ان کی دوسری منصبی مصروفیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دن رخصت ہو رہا تھا، مولانا آزاد میرے ساتھ کمرے کے دروازے تک آئے۔ دروازہ کھولا، تو سامنے سے ڈاکٹر صاحب گزر رہے تھے۔ انھوں نے مولانا کو سلام کیا۔ اس پر مولانا نے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ مالک رام صاحب کو تو جانتے ہونگے! انھوں نے جواب نفی میں دیا۔ مولانا نے تعارف کرایا اور واپس کمرے میں چلے گئے، اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آ گئے۔ اس کے بعد ان سے بہت ملاقاتیں رہیں۔

ایک دن کہنے لگے: میں تو خود آپ کی تلاش میں تھا۔ بات یہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی کتاب 'عورت اور اسلامی تعلیم' کا انگریزی ترجمہ اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کروں، آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا! میں نے ہامی بھری۔ اس پر انھوں نے جناب عبدالعلی سے اس کا ترجمہ کروایا اور 'دوسرا ان اسلام' کے عنوان سے اپنے انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کر دیا (حیدر آباد ۱۹۵۹ء)۔ ان سے آخری ملاقات مارچ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں ان کے مکان پر حیدر آباد میں ہوئی۔ میں غالب صدی تقریبات میں شرکت کے لیے جناب عابد علی خان کا بلایا ہوا گیا تھا۔ اگرچہ قیام بید مختصر صرف وہی دن کا تھا، لیکن ناممکن تھا کہ بن لے چلا آتا۔ چنانچہ ایک دست کے ہمراہ حاضر ہوا۔ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس موقع پر ایک لطیفہ ہو گیا: جانے کیسے دکن کی قوموں کا ذکر پھر گیا۔ میں نے کہا یہ لوگ تو اناڑی ہیں۔ وہ زراچوں کے اور دریافت کیا کہ کیا مطلب؟ میں نے عرض کیا کہ جب آریہ لوگ یہاں آئے، تو انھوں نے یہاں کی غیر آریہ اقوام کو (ان - آریہ) کہنا شروع کیا، جس سے رفتہ رفتہ لفظ نایر اور نیر بنے۔ اردو دالوں نے اسی کو بگاڑ کر اناڑی بنایا اور معنی اس کے ہوئے، 'دھنچھو جو کسی خاص فن میں طاق نہ ہو'۔ منہس پڑے اور کہا آپ کی اتج کی داد دیتا ہوں، لیکن خیال رکھیے، کوئی سن نہ لے۔

افسوس کہ مولانا آزاد کی زندگی میں وہ ترجمان القرآن کا ترجمہ مکمل نہ کر سکے۔ تفسیر سورہ فاتحہ اور البقرہ کے متن اور حواشی کا ترجمہ وہ کر چکے تھے کہ مولانا چل بے۔ یہ حصہ انھوں نے دیکھ لیا تھا اور اس پر صاد کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کام اس کے بعد بھی جاری رکھا اور اسے ۱۹۶۱ء میں تین جلدوں میں مکمل کر لیا۔ ان میں سے دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور تیسری زیر طبع ہے۔

ترجمان القرآن صرت پہلے ۱۸ پاروں کے ترجمے اور تفسیری حواشی پر مشتمل ہے! مولانا اسے

مکمل کو ہی نہیں سکے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب اسے انگریزی میں منتقل کر رہے تھے، تو انھیں اپنا وہ وعدہ یاد آیا جو انھوں نے تعلیم کے آغاز میں اپنے والد سے کیا تھا۔ اس پر انھوں نے عزم کر لیا کہ جس طرح بھی ہو پورے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر دینا چاہیے۔ ان کے ہندوستانی ادیب و رپنی دوستوں نے بھی ان سے اس کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس پر بقیہ ۱۲ پاروں کے متن کے ترجمے کا اضافہ کیا اور اسے بھی شائع کر دیا۔ ترجمے میں ان کا اصول یہ تھا کہ اصلی متن کی روح نمایاں ہو، نہ کہ محض مرادف الفاظ رکھ دیے جائیں۔ ان کا ترجمہ سب کے سامنے ہے اور صاحب نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کہاں تک اس میں کامیاب رہے ہیں۔

اد پر جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے، ان کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مکمل فہرست درج ذیل ہے۔

1. The Influence of English Literature on Urdu Literature (1924)
2. Ghalib - A Critical Appreciation of His Life & Urdu Poetry (1927)
3. The Muslim Culture in India (1932)
4. The Muslim Problem in India (1939)
5. The Pakistan Issue - Plan of Federal Constitution of India. Congress-League reaction and Press statements (1943)
6. The Cultural Basis of a New World Order (1937)
7. An Outline of The Cultural History of India - edited and compiled (1958)
8. Address on National Integration (1967)
9. Language and National Integration (1968)
10. The Concept of Society in Islam (1937)
11. Prayers of the Prophet (1937)
12. Towards Reorientation of Islamic Thought - A fresh examination of the Hadith Literature (1954)
13. Basic Concept of the Quran (1958)
14. Bases of Islamic Culture (1959)

15. Madras University Lectures I
Principles of Islamic Culture (1961)
16. Was the Prophet of Islam Unlettered? (1964)
17. The Problem of Islamic Studies in Indian Universities (1964)
18. The Call of the Quran (1966)
19. Faith and Action — The Quranic View (1967)
20. The Unity of Man — The Quranic View (1968)
21. Tarjuman-al-Quran of Mawlana Abul Kalam Azad—a rendering into English in three volumes Vol. I (1962). Vol II (1967). Vol. III under print)
22. Al-Quran rendered into English (1969)
23. The Mind Al-Quran Builds (1952) Revised edition (1971)

اردو دان حلقوں میں ان کا نام اس مختصر کتابچے کی وجہ سے زندہ رہیگا، جو انھوں نے غالب کے عزائم سے انگریزی میں لکھا تھا (حیدر آباد ۱۹۶۸ء) بعد کو اس کا سیدھا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہوا اور ترجمہ بھی شائع ہوا (حیدر آباد ۱۹۶۲ء)۔ یہ صحیح معنی میں مطالعہ غالب کے سلسلے میں انقلابی مضمون ثابت ہوا۔ انھوں نے پہلی مرتبہ غالب پر کچھ ہی نکتہ چینی کی۔ اردو میں غیر جانبدارانہ اور محرومی تنقید کا یہ پہلی نثر دان تھا اور اردو میں سے اب تک ہے) اور غالب سے متعلق مبالغہ آمیز خیالات تو ہمارے ذہنوں پر بطور مسلط تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بخوری (دفتر نومبر ۱۹۹۱ء) نے اس سلسلے میں کچھ ایسے بلند بانگ دعادی کیے تھے کہ جو سمجھے وہ کبھی اور سمجھے وہ کبھی نہ سمجھے گا۔ ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر بخوری کے مطالعے اور وسعت نظر اور اس سے کبھی بڑھ کر ان کی ذہانت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ "حاجن کلام غالب" میں انھوں نے غالب سے زیادہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس مضمون پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکے تھے کہ موت کا بلاوا آگیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جیتے رہتے تو ان میں تو ان آجاتا اور وہ غالب کی حقیقی عظمت پر بھرپور لکھتے اور اسے ہم سے قابو کرتا۔

طریقہ پر روشناس کراتے۔

نیز یہ توجہ معترضہ تھا۔ ڈاکٹر لطیف نے اپنی مختصر کتاب 'غالب' میں اسی افراط و تفریط میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی دوسری اہم کوشش غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب دینے کی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے سر اکبر حیدری کی دستاویز سے نسخہ حمید یہ کی اصل یعنی نسخہ بھوپال حاصل کیا اور پورے کلام کو مرتب کر کے چھاپنا شروع کر دیا۔ اس کے ۱۲۶ صفحات تک چھپ چکے تھے کہ اس مطبع میں جہاں یہ چھپ رہا تھا، آگ لگ گئی اور مطبوعہ کا غذات اور ان کا تیار کردہ اصل مسودہ بھی جل کر رہا کہ ہو گئے۔ وہ کہتے تھے کہ اس افسوسناک حادثے کے بعد دوبارہ اسے مرتب کرنے کی جھ میں ہمت نہیں تھی! یوں یہ مفید کام ادھورا رہ گیا۔ خوش قسمتی سے مطبوعہ جسے کے فرے کسی طرح ٹیکنیکل کاظمی مرحوم (ف ۱۹۶۱ء) کے ہاتھ لگ گئے تھے، جو انھوں نے مولانا آتیاء علی خان عرشی کو بھیج دیے اور انھوں نے دیوان کا نسخہ عرشی مرتب کرتے وقت ان سے استفادہ کیا۔ بہر حال الفضل للمتقدم کے اصول کے مطابق ڈاکٹر لطیف ہمارے شکر کے مستحق ہیں کہ دیوان کی تاریخی ترتیب کا خیال سب سے پہلے ان کے ذہن میں آیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کے اصول مرتب کر دیے، جس سے ان کے پسروں کو روشنی ملی اور انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

ان کی ان ہی علمی خدمات کے اعتراف میں ابھی پارسا سال یوم جمہوریہ (۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء) کے موقع پر حکومت ہند نے انھیں پی بھوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔

پانچ چار سال سے ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ پہلے آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ بائیں آنکھ پر عمل جراحی کرایا، جو بد قسمتی سے ناکام رہا اور آنکھ بالکل بیکار ہو کے رہ گئی۔ دوسری کی بینائی بھی بہت کم تھی اور وہ مدد کے بغیر چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کمی نہیں کی۔ قرآن کا ترجمہ انھوں نے اسی زمانے میں

مکمل کیا۔ پہلے اٹھارہ پاروں کے متن کا ترجمہ تو ترجمان القرآن کے ساتھ پورا ہو ہی چکا تھا، اب تکمیل کے لیے باقی بارہ پاروں کا ترجمہ درکار تھا۔ وہ عربی نہیں جانتے تھے، اگرچہ اس کے حرف شناس ضرور تھے۔ انھوں نے طریقہ کاریہ اختیار کیا کہ تین چار معاون ساتھ لیے۔ ایک قرآن کی آیت پڑھتا، دوسرا اس کے مختلف ترجمے (اردو۔ فارسی۔ انگریزی) پڑھتا، کبھی کبھی وضاحت کے لیے بعض اہم تفسیروں کا متعلقہ حصہ بھی پڑھا جاتا۔ اس کے بعد وہ اپنا ترجمہ کھوادیتے، جو ان کے نزدیک اصل کی روح کے قریب ترین تھا۔ وہ ترجمے سے زیادہ ترجمانی کے قائل تھے۔ اگر کوئی موجودہ ترجمہ یا ترکیب ان کے معیار پر پوری اترتی تو انھیں ان معنوں کو لفظ بلفظ اپنے ہاں لے لینے میں بھی عار نہیں تھی۔ ان کے نزدیک اصلی مقصود یہ تھا کہ ایک اوسط درجے کے قاری کی سمجھ میں آجائے کہ قرآن کیا کہتا چاہتا ہے۔

پچھلے سال ڈیڑھ سال سے انھیں حلق کے کمینسر کی شکایت تھی۔ علاج معالجہ ہوا، لیکن بیسود، اب نوراک تک گلے سے نہیں اترتی تھی۔ سیال چیزوں پر کوئی کہاں تک جی سکتا ہو۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب آخری مرحلہ بہت دور نہیں ہے، تو چھ ماہ قبل انھوں نے کمرول میں اپنے جدِ اعلیٰ حضرت سید عبداللطیف یا ہو پادشاہ کے مزار کے جوار میں اپنی قبر کھدوائی۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی ساری عمر حیدرآباد میں بسر ہوئی، یہاں کے بھی آپ پر حقوق ہیں، آپ نے کمرول کو حیدرآباد پر ترجیح کیوں دی، تو جواب میں یہ شعر پڑھا:

ما بفلک ماندہ ایم، یا رملک بودہ ایم
بار آبخا میر ویم خواجہ کمر آں شہرست

اپنی بیماری کے آخری ایام میں وفات سے کوئی ایک ہفتہ پہلے انھوں نے ”ڈاکٹر سید عبداللطیف قرآنک انیڈاؤر کلچرل اسٹڈیز ٹرسٹ“ کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم

کیا، جس میں صرف یہ تین چار سطر ہیں :

منکہ ڈاکٹر سید عبداللطیف ولد حضرت سید شاہ حسین صاحب مرحوم، عمر ۸۰ سال، پیشہ وظیفہ یاب پر و فیسر جامعہ عثمانیہ ساکن ۷۴ آغا پورہ، حیدر آباد بہ نسبت ہوش و عواس، اُس دیرینہ دلچسپی کی بنا پر جو تجھے قرآنی اور دیگر مذہبی امور سے ہے، ایک قرآنی ٹرسٹ قائم کرتا ہوں اور اپنی تمام کتابوں کے حق تصنیف کو اس ٹرسٹ کے حوالہ کیا ہوں۔

اس کے اخراجات کے لیے بیس ہزار روپیہ کا عطیہ بھی اپنی جیب سے دیا اور اپنی جملہ تصنیفات کا حق اشاعت بھی ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کسی زمانے میں ایک ادارہ اسلامیات کے لیے قائم کرنا چاہتے تھے، اور جیسا کہ چودھری محمد شفیع دم ش نے ڈاکٹر سید عبداللطیف کو ایک خط میں لکھا تھا، اقبال مرحوم اس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر عبداللطیف کو دعوت دینے والے تھے۔ ادارے کی تاسیس سے قبل اقبال رحلت فرمائے۔ بہر حال ان کے کام کی تکمیل ڈاکٹر عبداللطیف نے کر دی، اپنی زندگی میں بھی ادارہ کے ذریعے سے اور مرنے کے بعد کے لیے یہ 'قرآنی ٹرسٹ' قائم کر کے۔ خدا کرے اس کے کارکنوں کو اسی خلوص اور تندہی سے کام کی توفیق ملے، جو ان دونوں مرحوموں کی خواہش تھی۔

آخر وہ دقت آگیا جس کا بہت دن سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ۲ نومبر ۱۹۶۱ء ۱۳ رمضان ۱۳۹۱ھ) ساڑھے پانچ بجے صبح اپنی قیام گاہ پر جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ہوش و حواس آخری لمحے تک بجا رہے، بلکہ ان کے ارد گرد لوگ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے، انہوں نے خود کہا کہ اب کوئی سورہہ یسین کی تلاوت کرے، اور اس کے بعد پورے سکون سے اپنے مولا حقیقی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

لاولدفوت ہوئے۔ لیکن ان کی اولاد معنوی اتنی ہے، بالخصوص ان کا انگریزی ترجمہ قرآن

کہ اس سے مستفیض ہونے والے ہمیشہ انہیں دعا سے خیر سے یاد رکھینگے۔ اسی دن یعنی ہم نومبر
مہ پر کوہِ نبیؐ معظمؐ جیسا ہی مارکیٹ کی مسجد والا کنٹھ میں نمازِ جنازہ ہوئی، جس کی امامت
مولانا ابو الوفا نے کی۔ اس کے بعد میت کھڑی ہو گئی، جہاں ان کی وصیت کے مطابق اگلے
دن ۲۵ نومبر بعد نمازِ جمعہ تدفین عمل میں آئی۔ یہ رحمۃ اللہ تعالیٰ

مہر، مولانا غلام رسول

۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو مولانا غلام رسول جہر کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے لاہور میں انتقال ہو گیا۔

نئی نسل کے، خصوصاً وہ لوگ جو آج پچیس کے پیٹے میں ہیں، انھوں نے یہ ایک سطری خبر پڑھی یا سنی ہوگی۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ غلام رسول تہر کون تھے اور انھوں نے اردو صحافت کی خصوصاً اور علم و ادب کی عموماً کیا خدمت کی!

مولانا غلام رسول تہر ۲۴ اپریل ۱۸۹۵ء کو جالندھر سے کوئی چار میل دور، ایک پھوٹے سے گاؤں پھولپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قریب کے ایک اور گاؤں میں ہوئی۔ اس کے بعد جالندھر شہر کے مشن ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا یہاں انھوں نے دسویں درجے تک تعلیم پائی۔ اب وہ لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج سے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کیا۔ وہ ابھی انٹر کے درجے میں تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جولائی ۱۹۱۲ء میں اپنا شہر آفاق ہفتہ وار اہلالِ کلکتہ سے جاری کیا۔ ہر صاحب اس سے پہلے شعر کہنے لگے تھے اور مذہبی اور سیاسی مطالعے میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اہلال کے خریدار

بن گئے اور یہ پرچہ سب ان کے مطالعے میں رہنے لگا۔
مولانا آزاد نے اہلال کے ذریعے سے ملک کی عام سیاسی بیداری میں عموماً اور مسلمانان ہند کی تاریخ میں خصوصاً جو اہم رول ادا کیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو انگریز دوستی اور کانگریس دشمنی کا جو سبق دیا تھا، وہ اس وقت تک اس ملک میں اسلامی سیاست کا اصل اصول بنا ہوا تھا۔ اس کے خلاف پہلی آواز مولانا ابوالکلام آزاد نے بلند کی۔ ان کا اسلوب تحریر اور اپنے نظریات کی تائید میں قدم قدم پر نص حدیث سے استدلال ایسا برجستہ اور بدیع تھا کہ اس نے گویا ہر لگادی۔ نوجوان طبقہ اہلال پر دیوانہ وار فریفتہ ہو گیا۔ غلام رسول مہر بھی اہلال اور صاحب اہلال کے والد و شہید بن گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی تنظیم کے لیے ایک جماعت 'حزب اللہ بنانی' بنائی تھی اور اس کے اراکین کی تربیت کے لیے 'دارالارشاد' قائم کیا تھا۔ غلام رسول مہر بھی 'حزب اللہ' اور 'دارالارشاد' کے رکن بن گئے۔ ان تمام اراکین کے نام ایک رجسٹر میں درج کیے جاتے تھے۔ ہر صاحب نے مولانا آزاد سے جو تعلق اپنی نوجوانی میں قائم کیا تھا، اسے اپنے آخری دم تک نباہا۔ اس دوران میں کیسے کیسے سیاسی زلزلے اور نظریاتی ہنگامے نہیں ہوئے لیکن ان کے پاسے ارادت کبھی نہیں ڈگمگا سے۔ وہ مولانا کے عاشق تھے اور کبھی ان کا نام حضرت اور رحمۃ اللہ علیہ کے اضافے کے بغیر نہیں کہتے تھے۔

ہر صاحب نے ۱۹۱۵ء میں بی اے پاس کر لیا، تو انھیں حیدرآباد (دکن) میں ملازمت مل گئی۔ وہ وہاں پانچواں وقار الامرار میں انسپکٹر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر اتحادی قوتوں کا ترکی کے خلاف رویہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بہت تشویش کا باعث رہا تھا۔ ہر صاحب نے حیدرآباد کے بعض دوستوں کے مشورے سے ایک اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا، "سلطنت" اس کا نام تجویز ہوا اور انھوں

نے اجرا کے لیے درخواست دے دی۔

اوس مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بنگال سے اخراج کا حکم صادر ہوا۔ چونکہ بہار کے علاوہ بیشتر دوسری صوبائی حکومتیں پہلے سے ان کے اپنے ہاں داخلے پر پابندی عائد کر چکی تھیں، اور سب راستے مسدود یا کردہ رانچی چلے گئے اور تین چار مہینے بعد یہیں ان کی نظر بندی کا حکم صادر ہو گیا۔ ان کے ٹکٹوں سے نکلنے پر حکومت نے ان کے گھر اور دفتر کی تلاشی لی، اور ان کے تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ انھیں میں ”حزب الشریعہ“ کے اراکین کا رجسٹر بھی تھا، جس میں من جملہ اور اصحاب کے ہر صاحب کا نام بھی درج تھا۔ یہ سب لوگ حکومت کی نظر میں مشتبہ اور خطرناک قرار پائے اور ان سے متعلق پوچھ گچھ ہونے لگی۔ شدہ شدہ ہر صاحب کا کھوج بھی نکلا، اور رپوٹ ملی کہ ان دنوں یہ حیدر آباد میں ہیں اور ایک اخبار سلطنت نکالنے کے لیے ان کی ڈکلیئریشن کی درخواست زیر غور ہے۔ حکومت جو مولانا آزاد کے اخبار اہلال ہی کے اثرات سے جڑ بزمور ہی تھی، بھلا ان کے کسی مرید کے اخبار کی اجازت کیوں دینے لگی تھی چنانچہ ان کی درخواست رد کر دی گئی۔ اس سے ٹھوڑے دن بعد ہی ۱۹۲۰ء میں ہر صاحب حیدر آباد سے وطن واپس آئے۔

مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کو اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ہفتہ وار سے روزانہ بنایا تھا۔ ظفر علی خان اردو صحافت کا ایک اور درخشندہ نام ہے۔ ان کا اخبار زمیندار گویا اردو صحافت کی درس گاہ تھا۔ بھلا جس اخبار میں مختلف اوقات میں عبدالرشید العمدی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول ہیر، عبد المجید سالک، جواغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خان سیکش، نصر اللہ خان عزیز نے کام کیا ہو اور وہاں سے الگ ہونے کے بعد زندگی بھر کامیاب صحافتی کجروی ہو، اس اخبار کو صحافت کی درس گاہ کے سوانے اور کس نام سے یاد کیا جائیگا؟ اور ان اصحاب میں سے کس کا نام اردو صحافت میں فراموش کیا جاسکتا ہو؟

یہ حقیقت ہے کہ ظفر علی خاں بنیادی طور پر ادبی آدمی تھے۔ وہ اگر سیاست کے خازنہ میں نہیں بھنس گئے ہوتے، اور لکھنؤ سے علم و ادب اور صحافت ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہتے، تو آج اردو کا دامن کیسے کیسے گلہاے رنگ رنگ سے معطر اور مشکبو ہوتا۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہی بات حسرت موہانی اور مولانا محمد علی پر اور شاید کسی حد تک مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی صادق آتی ہے۔ کون بتا سکتا ہو کہ ان اصحاب کی شکل میں اردو ادب نے کتنی بڑی قربانی دی ہے، سیاست کی بارگاہ پر! ۱۹۲۰ء میں مولانا ظفر علی خان نے اصرار کر کے عبدالحی سالک کو زمیندار میں آنے کی دعوت دی۔ سالک صاحب اس وقت مولوی سید ممتاز علی (امتیاز علی تاج کے والد) کے رسالوں تہذیبِ نسوان اور پھول کے ایڈیٹر تھے۔ سالک کو ابھار کرتے نہ بنی؟ اور وہ زمیندار سے وابستہ ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن بعد ان کا نام سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپنے لگا اور وہ اس کے ادارے لکھنے لگے۔ ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء کا زمانہ ہمارا تحریکِ آزادی کے آغاز کا زمانہ تھا اور شباب کا بھی۔ عدم تعاون کی تحریک پورے زور شور سے چل رہی تھی۔ حکومت بھی اپنے پورے لاؤشکر سے اس کے مقابلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔ ادھر کسی نے حکومت کے خلاف کوئی بات کہی یا لکھی، اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ پنجاب میں روزنامہ زمیندار خاص طور پر حکومت کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ ظفر علی خان گرفتار ہوئے، ان کے بیٹے اختر علی خان گرفتار ہوئے، یہی اب سالک صاحب کے ساتھ پیش آیا۔ انھوں نے ایک ادارہ لکھا، جو حکومت کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا۔ چنانچہ وہ گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لیے جیل خانے بھیج دیے گئے۔

ہر صاحبِ حیدر آباد سے واپس آ کر خلافت تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے تھے اور اس کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نکالنے کی بھی فکر میں تھے۔ سالک کے جیل چلے جانے کے بعد زمیندار کے منیجر جو ہر صاحب کے دوست تھے، ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آئیے اور

زمیندار کی باگ ڈور سنبھالیے۔ انھوں نے بھی خیال کیا کہ اگر ذاتی اخبار نکالنے سے پہلے کسی دوسرے پرچے میں کچھ تجربہ حاصل ہو جائے، تو یہ مفید رہیگا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء میں ہر صاحب زمیندار کے ایڈیٹر بن گئے۔ لیکن وہ یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکے۔ پکڑ دھکڑ کا زمانہ تھا، اور زمیندار تو خاص طور پر معتبہ سرکار تھا۔ ممکن ہے، حکومت نے اپنے کل پرزوں کے ذریعے سے بھی دباؤ ڈالا ہو۔ بہر حال ہر صاحب کے خاندان کے بزرگ لاہور آئے اور انھوں نے اصرار کیا کہ وہ زمیندار کی ملازمت سے استعفیاء دیں اور واپس اپنے وطن چلیں۔ ہر سہر تسلیم خیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد ہی حکومت نے زمیندار کی مالی ضمانت ضبط کر لی، جس پر (عارضی طور پر) اس کی اشاعت بالکل بند ہو گئی۔

تین چار ہفتے بعد زمیندار پھر جاری ہو گیا۔ اب کے اخبار کے کڑتا دھرتا ہر صاحب کے گاؤں پہنچے اور ان کے خاندان والوں کو قائل معقول کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس پر ہر صاحب دوبارہ زمیندار کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں سالک صاحب بھی قید کاٹ کر رہا ہوئے اور آکر ان کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر و سالک کا یہ قرآن السعدین روزنامہ زمیندار کا تو خیر ہے ہی، اور دو ضمانت کا بھی زریں و وثابہت ہوا۔ ہر کے سنجیدہ، تین، مدلل اداریوں کی اور سالک کے افکار و عواذ میں ہمارے تمام قومی مسائل پر طنز و مزاح کے انداز میں متبرے کی دھوم مچ گئی۔ بہت لوگوں نے ان کی نقل کی۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی! مارچ ۱۹۲۴ء کے آخر میں ہر و سالک نے بوجہ زمیندار سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اخبار کے بیشتر اعلیٰ نے بھی ان کا ساتھ دیا، ان میں ادارتی شعبے اور کاتب تک سب شامل تھے۔ شروع میں ان کا اپنا نیا اخبار جاری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن اعلیٰ کے آجانے سے وہ مجبور ہو گئے کہ ان کے روزگار کا مسئلہ تھا۔ اب ان کے لیے اخبار

نکالنے کے سوائے کوئی چارہ کار نہ رہا۔ چنانچہ ۱۲ اپریل ۱۹۲۷ء کو روزنامہ انقلاب جاری ہوا۔ جن اصحاب کو اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس سے نظریاتی اختلاف کے باوجود اعتراف کریں گے کہ انقلاب صحافتی معیار سے کمتر کبھی کوئی بات نہیں کی۔

تہر نے یورپ اور مغربی ایشیا کے بیشتر ممالک کے سفر کیے تھے۔ اور وہاں کے کئی اکابر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر ان کی گہری نظر تھی جو ایک روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔

۱۹۲۷ء میں آزادی آئی۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ ایک کی جگہ دو د ملک وجود میں آئے۔ تہر دو سالک نے دیکھا کہ تبدیل شدہ حالات آزاد صحافت کے لیے سازگار نہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ اپنی آزادی برائے بھی قائم رکھیں اور حکومت بھی ہم سے خوش رہے، تو یہ ناممکن ہے۔

چونکہ آزادی ضمیر ان کے نزدیک خوشنودی حکومت سے عزیز تر تھی، انھوں نے انقلاب کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو انقلاب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ایک کامیاب، با اثر و رسوخ، نفع مند اخبار کو اصول کی خاطر بند کر دینے کی ایسی اور مثال شاید ہی کہیں مل سکے!

اس کے بعد ہر صاحب نے براہ راست سیاست سے ہٹ کر تعلق رکھا۔ ان کی کتاب غالب پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے غالب کے خطوط اور دوسری تحریروں کے اقتباسات کو اس طرح سے مرتب کیا ہے کہ اس سے کم و بیش غالب کی پوری سوانح عمری سامنے آگئی ہے۔ یہ کتاب ان کے غالب سے متعلق ایک بڑے پر گرام کا حصہ تھی، جو ان کی اور دوسرے گرامیوں کے باعث ادھورا رہ گیا۔ لیکن اہل نظر مجھ سے اتفاق کریں گے کہ جو کچھ ہو گیا، وہ بھی بہت قابل قدر ہے۔ پچھلے ۲۵ برس میں غالب پر بہت کام ہوا ہے اور اس کی بعض اچھی سوانحیں وجود میں آئی ہیں۔ اس کے باوجود تہر کی 'غالب' کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوئی اور غالب کا

کوئی سنجیدہ طالب علم اس کے مطالعے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔
اس سلسلے میں بہت بعد کو انھوں نے اردو خطوط غالب بھی دو جلدوں میں مرتب کیے تھے
ان کے ساتھ مکتوب الیہم کے حالات اور مفید حواشی کا اضافہ کیا، جس سے ان کا افادہ
وسیع تر ہو گیا۔

صحافت سے دستکش ہو کر انھوں نے اپنے آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر لیا تھا۔
انھوں نے ۱۹۳۴ء میں حضرت سید احمد شہید راے بریلوی کے حالات جمع کرنا شروع کیے
تھے۔ اب فرصت تہیا ہوئی، تو انھوں نے اس کتاب کی تکمیل پر توجہ کی۔ ۸۰ سال کی محنت
شاقہ اور تلاش و تحقیق کے بعد اسے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے انھوں
نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی اور کون کون سے کنوئیں نہیں جھانکے۔ حضرت
سید احمد شہید کی تحریک کے بقیۃ السیف افراد کو ریاست ٹونک میں پناہ ملی تھی۔ ان
اصحاب کے باعث تحریک سے متعلق بہت قلمی لٹریچر ٹونک کے سرکاری مختا بنانے میں جمع
ہو گیا تھا۔ ہر صاحب اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسے مولانا آزاد نے وہاں سے منگو کر
اٹھیں دیا تھا۔

بعد کو انھوں نے حضرت شہید کے رفیقوں کے حالات بھی جمع کر کے 'سرگزشت مجاہدین'
کے عنوان سے شائع کیے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے مشہور نسکا مے کے کوائف انقلاب، ۱۹۵۷ء
کے نام سے شائع کیے۔

غالب کے بعد ان کا دوسرا دلپسند موضوع اقبال تھا۔ ان کے اقبال کے ساتھ بہت زمانہ
کے تعلقات تھے، بلکہ ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع بھی ملے تھے جب ۱۹۳۱ء میں اقبال
دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے ہیں، تو ہر گھبراہٹ کے ساتھ
تھے۔ واپسی پر بھی دونوں یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے ایک ساتھ مؤتمر
اسلامی، یروشلم کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ ہر صاحب کہا کرتے تھے کہ اقبال کا ہر

نصف یا ایک تہائی کلام شائع ہوا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اقبال نے اپنی کئی نظمیں یا شعر اس لیے شائع نہیں کیے یا کسی مجموعے میں شامل نہیں کیے کہ ان کے خیال میں یہ ان کے معیار سے فرد تر تھے یا ان کے عام طرز فکر سے میل نہیں کھاتے تھے۔ چونکہ مہرزد تو ان کے ساتھ رہے تھے، اس لیے اس طرح کا دافر کلام ان کے پاس جمع تھا۔ وہ اسے توضیحی حواشی کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ خدا معلوم، اب اس ذخیرے کا کیا حشر ہوتا ہے! انھوں نے بانگ درا، ابال جبریل، ضرب کلیم مجموعوں کے مطالبہ و معافی سے متعلق مستقل مصنفات چھوڑی ہیں۔ ایک کتاب اقبال کی سوانح سے متعلق بھی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے ادب پر خاصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں ان کی چھوٹی بڑی، خدا جھوٹ نہ بلوائے، کوئی پچاس کتابیں ہونگی۔ انھوں نے ترجمے بھی کیے۔ اس میں زیادہ توجہ تاریخ اسلام پر رہی۔ عجیب سہمہ گیر طبیعت پائی تھی۔ لیکن ترجمہ ہو کہ تالیف، سوانح ہو کہ تاریخ، سیاست ہو یا مذہب، ادب ہو یا شعر۔ غرض کوئی میدان ہو، وہ کسی قسم کی گھٹیا بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جو بھی کہی اور جب بھی کہی، ایسی کہ سننے والے کو اس سے شرم محسوس ہوئی، نہ خود انھیں کبھی بعد کو اس کے باعث نہ امت۔

صحت کی طرف سے کبھی شکایت نہیں کی۔ سرخ و سفید رنگ، بلند بالا، درزنی متناسب جسم۔ وہ اپنی عادات میں بہت باقاعدہ تھے۔ مسلم ٹاؤن میں ان کا اپنا مکان تھا۔ ہنر یہاں سے بہت قریب ہی۔ گرمی سردی ہر موسم کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد نکل پڑتے۔ ہنر کے کنارے کنارے کوئی دو میل چلے جاتے۔ اس طرح روزانہ کم و بیش چار میل کا اوسط تھا۔ واپس آکر ناشتہ کرتے اور اس کے بعد کام کی میز پر بیٹھ جاتے۔ بارہ بجے تک نوشت و خواندہ کا مشغلہ رہتا۔ یہاں سے اٹھتے تو دوپہر کا کھانا کھاتے اور پھر تھوڑی دیر

قبول کرتے۔ تین بجے دوبارہ مطالعے کی میز پر پہنچ جاتے اور چھ بجے تک مشغول رہتے۔ پھر شام کی سیر اور اس سے واپسی کے بعد کا وقت احباب کے لیے وقف تھا۔ یادہ ان کے وہاں آجاتے یا یہ کسی کے وہاں چلے جاتے۔ رات کا کھانا کھا کر جلد سو جانے کے عادی تھے۔

ایسی منظم زندگی کا یہ نتیجہ تھا کہ صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ موت اچانک ہوئی۔ منگل کے دن ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء (۲۶ رمضان ۱۳۹۱ھ) کو علی الصبح حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اسی دن سہ پہر کو مسلم ماؤن ہی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ راجب مراد بلو کے قطعہ تاریخ کے آخری مصرع سے عیسوی تاریخ نکلتی ہے۔ یہ ہے:

نثر اقدس و وقار وطن غلام رسول

وہ سنوڑ کالج کے طالب علم تھے کہ ۱۹۱۴ء میں ان کی شادی ہوئی۔ لیکن چار پانچ سال بعد یہ بیگم دوسرے سال بچے اپنی یادگار چھوڑ کر انھیں دغِ مفارقت دے گئیں۔ دوسرا نکاح انھوں نے بہت دن بعد ۱۹۲۹ء میں کیا۔ اس خاتون سے ان کے دس بچے پیدا ہوئے۔ وفات کے وقت ان کے گیارہ بچے

موجود تھے۔ چھ بیٹے (عبد السلام، اسلم، فاروق شاہین، اکرم، جاوید سلطان، طارق، امجد سلیم) اور پانچ بیٹیاں۔ پانچ بڑے بیٹے برسرِ روزگار ہیں؛ سب چھوٹے امجد سلیم بی اے کے طالب علم ہیں تین بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے گھر بار کی ہیں؛ دو سنوڑ ناگتھد ہیں۔

میرے ان کے ۱۹۲۶ء سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ۴۵ برس تھوڑی مدت نہیں ہوتی۔ غالب نے مومن کے انتقال پر کہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ۴۰ برس سے جانتے تھے؛ حضرت ۴۰ برس کا تو دشمن بھی نہیں ملتا، دوست کا کیا ذکر! میں ہر کے لیے کیا کہوں۔ میں نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا۔ نیکی اور شرافت کا نمونہ، دوست پروری اور وضع داری کی مثال:

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

سیدین، خواجہ غلام السیدین

ان کا سلسلہ نسب حضرت رسول کریم صلعم کے مشہور صحابی حضرت ابوالیوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ یہ اور اردو شاعری کے مجدد خواجہ الطاف حسین حالی (ف ۱۹۱۲ء) کی بچہ دہی تھے۔ مولانا حالی نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ ہمارے بزرگوں میں سب پہلے خواجہ ملک علی ہروی، عہد غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۷ء) میں ہندستان آئے حکومت وقت نے ان کی مناسب آؤ بھگت کی۔ جاگیر اور پانی پت کی قضاۃ کے علاوہ انھیں منڈی میں مختلف اجناس کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ لیکن یہ سارا جاہ و مال بہت مدت سے ختم ہو چکا تھا اور سیدین کے باپ دادا تک خاندانی نیکنامی اور عزت و شرف کے سوا اس میں سے کچھ نہ پہنچا۔

سیدین کے دادا خواجہ غلام عباس کا نکاح مولانا حالی کی بھانجی سے ہوا تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے غلام احسن، غلام اشقلین، غلام السبطین؛ سب سے بڑے غلام احسن قابل ذکر عالم دین اور مصنف تھے۔ انھوں نے ہر ربط اسپینر کی مشہور کتاب ایجوکیشن کا ترجمہ "فلسفہ تعلیم" کے عنوان سے اردو میں کیا تھا۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کے

بعض مذہبی رسالے اور ایک آدھ مناظرے کی کتاب دیکھی تھی۔ ان کا ۱۹۳۸ء میں لاہور منتقل ہوا۔

سب سے چھوٹے خواجہ غلام البطین تجارت اور ملازمت کرتے رہے۔ بہادی زبان کے نامور افسانہ نگار اور ناول نویس اور فلم ساز خواجہ احمد عباس انھیں کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں رحلت کی۔

خواجہ غلام تقیین صحیح معنوں میں فخر خاندان تھے۔ وہ ۱۸۷۲ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ ۱۸۸۴ء میں وہ حالی کے ساتھ دلی آئے۔ پانچ برس بعد یہاں گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ یہی زمانہ تھا جب انھوں نے 'النظر فی التاریخ' کے عنوان سے کوئی ۲۰ صفحات کا مضمون حیدرآباد کے مشہور ماہنامے 'حسن' میں چھپنے کو بھیجا۔ یہ مضمون حسن کے معیار کے مطابق قابل انعام ٹھہرا اور انھیں ایک اشرفی انعام میں ملی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۶ برس سے متجاوز نہیں تھی۔

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۸۹ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا، اور چار سال بعد ۱۸۹۳ء میں (بعض ۲۰ برس) بی اے اور پھر ۱۸۹۵ء میں قانون کے امتحان پاس کیے۔ ۱۸۹۷ء کے شروع میں وہ ریاست حیدرآباد (دکن) میں ملازم ہو گئے۔ وہاں وہ پانچ برس سے کچھ زیادہ رہے۔ ۱۹۰۱ء میں وطن واپس آئے اور میرٹھ میں وکالت شروع کر دی۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ شاہ ایدور ڈھمکم کے جشن تاج پوشی کے موقع پر دسمبر ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہنرہائی نس سرآغا خان کی زیر صدارت دلی میں ہوا تھا۔ اس موقع پر خواجہ غلام تقیین نے "اصلاح تمدن" (سوشل ریفارم) سے متعلق ایک تقریر کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس نے اپنا سرگرمیوں میں اس موضوع کا اضافہ کر دیا؛ اور اس کے لیے الگ شعبہ قائم کر کے خواجہ غلام تقیین ہی کو اس کا سربراہ بنادیا۔ انھوں نے پورے خلوص سے اس شعبے کا پیغام گھر گھر پہنچانے

کے لیے جنوری ۱۹۰۳ء میں اپنا مشہور رسالہ 'عصر جدید' جاری کیا جو پہلے ماہنامہ اور بعد کو ہفتہ وار شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف شہروں کے دورے کیے، تقریریں کیں؛ نیز اس تحریک کے مقاصد کی تشریح کے لیے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام 'مضامین اصلاح و ترقی' تھا۔ یہ بیشتر مفت تقسیم کی گئی تھی۔

وہ اعتقاداً شیعہ تھے اور شیعہ کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے۔ انھیں سنی شیعہ فرقوں کے اختلاف اور کشمکش سے بہت رنج تھا۔ انھوں نے بساط بھر دونوں گروہوں میں صلح صفائی اور یکجہتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ علمائے کرام نے انھیں اپنے تعاون سے محروم رکھا۔

۱۹۰۶ء کے انتخاب میں وہ صوبائی کونسل کی رکنیت کے لیے امیدوار کھڑے ہوئے۔ ان کے مقابلے میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان تھے، جو ان سے کہیں زیادہ با اثر و رسوخ تھے؛ لہذا وہ ہار گئے۔ لیکن وہ اس سے حوصلہ نہیں ہارے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ دوبارہ کھڑے ہوئے اور اب کے اپنے مد مقابل خان بہادر سید آل نبی وکیل و رئیس آگرہ کے مقابلے میں کامیاب ہو گئے۔ اکثر ان کے نام کے ساتھ 'آنر میبل' لکھا جاتا ہے؛ یہ اسی انتخابی کامیابی کا نتیجہ ہے۔ لیکن افسوس، اب ان کی صحت خطرناک حد تک خراب رہنے لگی۔ اگر وہ احتیاط کرتے اور مناسب طریقے پر علاج ہوتا، تو شاید تندرستی بحال ہو جاتی۔ لیکن ایمان کی حرارت اور قوم کی زبوں حالی کی اصلاح کا جذبہ انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ اکثر کارِ لمبے لمبے اندرون و بیرون ملک سفروں کی کوفت، اور ذہنی تشویش نے انھیں قبل از وقت موت کے منہ میں ڈھکیل دیا۔ جسم ان کی روح کا ساتھ نہ دے سکا، اور تندرستی صہبا سے یہ آبگینہ پگھل گیا۔ بروز جمعہ ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء رات کے دس بجے اس مجاہد قوم کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے پانی پت میں انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن اٹھا، اور عید گاہ کے متصل درگاہ میر جی میں سپرد خاک ہوئے۔ صرف ۴۳ برس کی عمر پائی۔

بھلا یہ کوئی مرنے کی عمر تھی!

ان کا نکاح مولانا حالی کے بڑے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین (ف ۱۹۲۲ء) کی صاحبزادی مشتاق فاطمہ سے ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے پیچھے پانچ بچے چھوڑے؛ مختار فاطمہ، غلام السیدین، سیدہ خاتون، اظہر عباس، مصداق فاطمہ۔ مختار فاطمہ کا نکاح سید سخن زیدی سے ہوا تھا۔ سیدہ خاتون کا عین عنقریب شباب میں ۱۹۲۹ء میں انتقال ہو گیا۔ حالی کے مختصر مجموعہ سخن جو اس ہراتِ حالی میں ایک چھوٹی سی مثنوی ان سے متعلق ملتی ہے۔ سیدین کی کتاب آندھی میں چراغ میں بھی ایک مضمون ان سے متعلق موجود ہے۔ خواجہ اظہر عباس ابھی چار برس ہوئے ۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ مصداق فاطمہ بحیثیت ادیب و مصنفہ صاحبہ عابدہ حسین کے نام سے مشہور و معروف ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

خواجہ غلام السیدین جنھیں ان کے سب احباب سیدین کے نام سے جانتے ہیں، مرحوم خواجہ غلام الثقلین کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۲ء کے دن پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تربیت اپنے والد اور نانا اور حالی کی نگرانی میں ہوئی۔ سب سے پہلے قرآن مجید ختم کیا؛ اس کے ساتھ علم تجوید و قرأت کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ان کی انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے دسویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ اور پھر علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا؛ جہاں سے ۱۹۲۳ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ اس سال اپنی یونیورسٹی سے بی اے کے واحد طالب علم تھے؛ اس امتحان میں وہ درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں یوپی کے محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر مسٹر میکسزلی تھے، وہ ان کے نتیجے اور خاص طور پر انگریزی میں غیر معمولی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی سفارش پر حکومت نے انھیں وظیفہ عطا کیا اور یہ ولایت چلے گئے۔ وہاں لیڈز یونیورسٹی سے پہلے تعلیم و تدریس کی سند (ڈپلوما) اور پھر ۱۹۲۵ء میں ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی

سال کے آخر میں وہ سندھستان واپس آئے۔

دہلی پر اول علی گڑھ ٹریننگ کالج میں ریڈر مقرر ہوئے۔ تھوڑے دن بعد حبیب الرحمن صاحب صدر شعبہ کہیں باہر گئے اور یہ ان کی جگہ پر لگ گئے۔ زیادہ دن انہیں گزرے تھے کہ ۱۹۲۷ء میں انھیں کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ ترقی کر کے پرنسپل ہو گئے۔ اتنی کم عمر میں شاید ہی کوئی اور پرنسپل بنا ہو۔ وہ اس کالج میں ۱۹۳۸ء تک رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ریاست کشمیر کی حکومت نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہ مدیر محکمہ تعلیم کے عہدے پر دہلی چلے گئے۔ کشمیر میں وہ ۱۹۴۵ء تک رہے۔ اب ان کی ماہر تعلیم کی حیثیت سے ملک میں شہرت ہو چلی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں ریاست رامپور نے انھیں اپنے ہاں بلا لیا۔ وہ دو برس تک رامپور میں میئر تعلیم رہے۔ آزادی ملک پر جب ریاست جمہوریہ سندھ میں شامل ہونے والی تھی، تو ان کا عہدہ بھی تخفیف میں آ گیا۔ جب مئی ۱۹۴۷ء میں وہ یہاں سے سکندرشہ ہوئے، تو حکومت ممبئی نے اسی عہدے پر انھیں اپنے ہاں مقرر کر دیا۔ انھوں نے صوبہ ممبئی کے تعلیمی نظم و نسق میں ایسی خوشگوار اصلاحات کیں کہ شدید شدہ حکومت مند تک ان کی خبر پہنچی۔ یہاں مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء میں بلاکو مرکزی وزارت تعلیم میں میسر اور جوائنٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس زمانے میں سیکرٹری اکڑتا راجند تھے ۱۹۵۴ء میں ان کے بعد پرنسپل جیولون کیر (ف) ۱۱۸ گسٹ ۱۹۶۹ء) سیکرٹری ہو کر آئے، تو تین دن ایڈیشنل سیکرٹری مقرر ہوئے اور تین سال بعد ان کے استعفیٰ ہونے پر ۱۹۵۷ء میں سیکرٹری بن گئے یہیں سے ۱۹۶۱ء میں نیشنل پرنسپل مہاراشٹر سے سکندرشہ ہوئے۔ یہاں سے فراغت پائی، تو حکومت کشمیر نے انھیں دوبارہ اپنے ہاں دوبارہ بلا لیا۔ لیکن اب ماحول دوسرا تھا۔ حکومت کے کل پرنسپل انھیں اپنے مصالحت کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ تین دن کو یہ مداخلت پسند نہیں تھی۔ اب کے وہ سال بھر سے زیادہ یہاں نہیں رہ سکے اور ۱۹۶۲ء کے شروع میں استعفیٰ ہو گئے۔

اپنی ملازمت کے دوران میں (۱۹۵۸ء) وہ دعوتی پروفیسر کی حیثیت سے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک گئے تھے۔ اب جو ملازمت کا جو اگلے سے اترا، تو بیرون ملک کی مختلف یونیورسٹیوں نے اپنے ہاں مدعو کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ وسکونسن یونیورسٹی (امریکا) گئے (۱۹۶۲-۱۹۶۳ء)۔ اس کے بعد ۱۹۶۳-۱۹۶۴ء کا ایک سال ہوائی یونیورسٹی میں گزرا۔ یہاں وہ مرکز برائے شرق و غرب میں سینئر اسکالرش کر گئے تھے۔ ہوائی ہی سے ۱۹۶۴ء میں وہ شان فورڈ یونیورسٹی گئے اور اسی سال کے آخر میں وہاں سے واپس آئے، تو یہاں حکومت مند ایک تعلیمی کمیشن کی تشکیل کا منصوبہ مکمل کر چکی تھی؛ انھیں بھی اس کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ وہ اس عہدے پر دو برس (۱۹۶۶ء تک) رہے۔ کمیشن کا کام ختم ہوا، تو یہاں دکن میں ایک سرکاری تعلیمی اور انتظامی معاملات کے ادارے کے مدیر اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۶۹ء میں الگ ہو گئے۔

۱۹۷۰ء میں شکاگو یونیورسٹی نے دنیا بھر سے آٹھ ماہرین تعلیم کا انتخاب کر کے انھیں (مبادی خدمات کا تمغہ دیا تھا۔ ہندستان کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ ان آٹھ میں سے ایک ذات سیدین صاحب کی تھی۔ وہ شکاگو سے جون ۱۹۷۰ء میں وطن لوٹے تھے۔ اگر ہم گنوائیں کہ وہ یہاں ہندستان میں اور بیرونی ممالک میں کون کونسی یونیورسٹیوں اور اداروں کی منتظم یا عالمہ کے رکن رہے، تو یہ طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ہو کہ ہمارے ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں سیدین صاحب کا ہاتھ رہا ہو۔ انھوں نے پس پردہ رہ کر خاموشی سے اس میدان میں جو خدمات سر انجام دی ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ملک سے باہر جب ادارے سے بہت دن تک وابستہ رہے، وہ یونسکو ہے۔ وہ اس کی مرکزی سرگرمیوں کے مختلف سطح پر منسلک رہے اور اس کی طرف سے انھوں نے بعض ممالک کا دورہ بھی کیا۔

سیدین صاحب کو اردو اور انگریزی۔ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔
 (لوں دہ فارسی اور عربی کے علاوہ فرانسیسی بھی جانتے تھے) ان کی اردو نثر بڑی جا
 اور شگفتہ ہو۔ بظاہر ایسی سہل و سلیس کہ قاری خیال کرے کہ ایسی نثر لکھ لینا کیا مشکل
 ہے؛ لیکن لکھنے بیٹھے، تو دانتوں پسینہ آجائے اور اسے معلوم ہو کہ یہ کتنا مشکل کام ہو۔
 تحریر کے علاوہ وہ تقریر کے بھی مرد میدان تھے، اور ان کی یہ صلاحیت کا ملا خدا داد
 تھی۔ رشید احمد صدیقی نے کسی جگہ ان کی ۱۹۱۶ء کی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے۔ جو
 انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ کے موقع پر اسٹریچا ہل
 میں کی تھی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ برس کی تھی اور اس کمسنی کے زمانے میں یہ تقریر انھوں
 نے اس اطمینان اور وقار سے کی تھی کہ سننے والے بہت دن تک اس کا چرچا کرتے
 رہے خوش قسمتی سے مجھے اپنی زندگی میں بعض بڑے بلند پایہ اور طبع اللسان مقرر
 کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ میں بلا خوف و تردید، پورے ذوق سے کہہ سکتا ہوں کہ قد
 زبان، لہجے کی متانت۔ انداز و اسلوب خطاب، موضوع کے مالہ، دماغیہ سے پوری
 واقفیت، دلائل کی قوت، اپنے نقطہ نظر کی وضاحت، سامع کی تشفی اور اطمینان۔
 غرض ان تمام باتوں میں جو کسی اچھی اور کامیاب تقریر کا مابہ الامتیاز ہیں، سیدین
 کسی سے کم نہیں تھے۔ گفتگو میں بھی ان کا یہی انداز تھا بلکہ یہاں ہلکا سا مزاح کا
 پہلو سونے میں سہاگے کا کام دیتا تھا۔ وہ کبھی جارحانہ رویہ نہیں اختیار کرتے تھے۔
 نرم لہجے میں، ذوق سے، اپنا عندیہ پیش کرنے میں کوئی ان کا حریف نہیں تھا۔
 لکھنے پڑھنے کا شوق انھوں نے درثے میں پایا۔ ان کے خاندان نے علم و ادب کی ترقی
 و ترویج اور قوم کی ذہنی اور اخلاقی تعلیم و تربیت میں جو نمایاں خدمات سر انجام
 دی ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، اور یہاں ان سے متعلق کسی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت
 بھی نہیں، نہ یہ ممکن ہی ہے۔ سیدین نہ صرف ان اقدارِ عالیہ کے وارث تھے، بلکہ

انہوں نے اپنی زندگی کو اپنے گفتار و کردار کو ان اصولوں کے مطابق ڈھال کر اپنے معصروں کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا۔ ان کا موضوع سخن تعلیم تھا۔ وہ ساری عمر معلم رہے۔ سقراط سے متعلق مشہور ہے کہ اس نے روزمرہ کی گفتگو کے ذریعہ سے اپنے عہد کے نوجوانوں کو جو آگے چل کر یونانی قوم کے کرتا و دھڑا بننے والے تھے سکھایا کہ اچھا آدمی اور اچھا شہری کہلانے کا مستحق کون ہے اور کسی شخص کو اس لفظ "اچھا" کا مصداق بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ سیدین کا مٹھ نظر بھی ساری عمر ہی رہا۔

وہ اقبال کے عاشق تھے؛ اور اقبال کا بیشتر کلام انھیں یاد تھا۔ وہ تحریر و تقریر میں بلکہ عام گفتگو میں بھی عموماً اقبال کے اشعار استدلال یا موضوع کی وضاحت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے اقبال کا تعلیمی فلسفہ کے عنوان سے ایک کتاب بھی انگریزی میں تصنیف کی تھی۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں لاہور سے چھپی تھی۔ نظر ثانی اور اضافے کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں چھپا۔ اس موضوع پر آج تک یہ واحد کتاب ہے۔ ان کی بیشتر کتابیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ اردو میں مندرجہ ذیل عنوانات ہیں:

روح تہذیب (دلی ۱۹۳۲ء)؛ اصول تعلیم (سندھستانی اکاڈمی، الہ آباد ۱۹۴۹ء)؛
علی گڑھ کی تعلیمی تحریک (۱۹۳۵ء)؛ قومی سیرت کی تشکیل (۱۹۳۸ء)؛ شہیدِ وفا
بدایوں (۱۹۳۴ء)؛ آندھی میں چراغ (دلی ۱۹۶۲ء)؛ ذہنِ انسانی کا ارتقاء (نظام یکچرا، دلی
یونیورسٹی ۱۹۶۶ء)؛ زبان، زندگی اور تعلیم (انجمن ترقی اردو، علی گڑھ ۱۹۷۱ء)؛
آندھی میں چراغ پر انھیں ۱۹۶۴ء میں ساہتیہ اکاڈمی کا پانچ ہزار کا انعام ملا تھا۔ آخری کتاب
زبان، زندگی اور تعلیم، زیر طبع تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور یہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔
یہ ان کی وفات کے کوئی ہفتہ بھر بعد شائع ہوئی۔ انگریزی کی چھوٹی بڑی کتابوں اور
رسالوں کی تعداد ۲۸ ہے۔

تذکرہ معاصرین

ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف میں مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۶۲ء میں انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔ ان کے احباب نے ایک مجموعہ مضمون بعنوان ارغوان الفت ان کی ساٹھویں سالگرہ پر ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ان کی نذر کیا تھا، اس کے مرتب ڈاکٹر سید عابد حسین ہیں اور یہ کتاب صدر جمہوریہ منہد ڈاکٹر سرو پیا را دھا کرشنن کے ہاتھوں پیش کی گئی تھی۔ حکومت منہد نے ۱۹۶۶ء میں انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے بھی سرفراز کیا۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب چلی آرہی تھی۔ وہ ہنوز سلسلہ ملازمت میں ہی تھے کہ ان کی دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہیں ۱۹۵۰ء میں پہلا دورہ پڑا۔ لیکن اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی سرگرمیوں میں کوئی نمایاں کمی نہیں کی۔ حسب معمول اپنے کام کاج میں لگے رہے۔ لمبے لمبے بری اور بخوانی سفر بھی کرتے چنانچہ ۱۹۵۰ء ہی میں وہ یونسکو کے کام سے عراق گئے۔ ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ تھیں۔ میں ان آیام میں بغداد میں مقیم تھا۔ میری ان سے پہلی ملاقات وہیں بغداد میں ہوئی۔ ان گزشتہ بیس بائیس برس میں ہمارے تعلقات میں بہت گہرائی آگئی تھی۔ ان کی وفات سے میں ایک مہربان دوست سے محروم ہو گیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں ۱۹۶۳ء میں وہ ولسکائن میں تھے۔ وہاں ان کی رفیق حیات کا انتقال ہو گیا (۲ جنوری ۱۹۶۳ء)۔ اس کا ان کی صحت پر جید ناخوشگوار اثر پڑا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ وہ اپنی قوت ارادی سے مردانہ وار کام میں جڑے رہے۔ لیکن یہ امر واقع ہو کہ اس حادثے سے ان کا دل بچھ گیا تھا۔ دل کا دوسرا شدید حملہ ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ آیا ہوا جہاں وہ مسلم یونیورسٹی کے جلیہ تقسیم اسناد میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اس کے بعد متواتر تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہلکے ہلکے حملے ہوتے رہے۔ تیسرا شدید حملہ جان لیوا ثابت ہوا۔ ۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سینے میں درد کی شکایت کی حسب دستور ان کے معالج انھیں اپنے ساتھ اسپتال لے گئے۔ اگلے دن (۹ دسمبر) کو فی سوائین جے اللہ کا یہ نیک بندہ

تذکرہ معاصرین

اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گیا۔ ہوش و حواس آخر تک قائم رہے، بلکہ تین بجے تک وہ حاضر سے باتیں کرتے اور انھیں مختلف ہدایتیں دیتے رہے تھے۔ تجہیز و تکفین ۲۰ دسمبر کی صبح کو ہوئی۔ نماز جنازہ مولانا سید علی صاحب (پیش امام مسجد پنجہ شریف، کشمیری گیٹ) نے پڑھائی، جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن ہوئے!

آسماں تربت پہ تیری عنبر افشانی کرے!

نواب کلب علی خان (ف ۱۸۸۷ء) والی راجپور کے ایک بیٹے شبیر علی خان تھے۔ سیدین کی شادی انھیں کی صاحبزادی عزیز جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہو گیا۔ اولاد میں چار بیٹیاں (زہرہ، بلقیس، سیدہ، ذکیہ) اپنی یادگار چھوڑیں۔

اِشارِیہ

۱۔ اشخاص

(کسی ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس شخص پر نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے)

ابراہیم علی عیش لکھنوی، میرزا ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰

ابراہیم علی خان (دالی ٹونک) ۵۳

ابن ہنرک، ۱۸۹

ابوالحسن ۸۵

ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی ۱۱۷

ابوالیوب انصاری رف ۴۰۷

ابوالوفا (مولانا) ۲۹۷

ابوسعید خدری رثا ۱۴۷

اثر صہبائی، عبدالسمیع پال ۸۰

اثر لکھنوی، جعفر علی خان ۳۷۷

اجمل خان، حکیم ۳۲۸، ۱۰۴، ۱۰۳

احسن مارہروی، علی احسن ۲۳

احسن مراد آبادی ۱۷۲

احمد ابراہیم علوی ۱۳۲

احمد ابین (شاہد احمد) ۲۷

احمد حسن (حکیم بڈن) ۱۱۷

احمد حسین (سید) ۶۲

احمد خان (سر سید) دیکھیے سر سید

آبربری، دلیم ۱۶۴

آرزو، انور حسین ۲۳۱، ۲۳

آزاد، ابوالکلام ۱۶۸، ۱۶۲، ۱۰۶، ۱۰۱، ۸۶

۳۸۹، ۳۸۸، ۳۴۹، ۳۳۳، ۱۶۹

۳۰۴، ۳۰۱، ۳۹۹، ۳۹۸، ۳۹۰

۳۱۱

آزاد، محمد حسین ۳۸۹

آسکر وائلڈ، ۱۹۶

آسی الدنی، ۲۷۶

آشفہ لکھنوی، ۲۵

آغا حشر کاشمیری، محمد شاہ ۱۹۲

آفتاب احمد خان، صاحبزادہ ۴۰۹

آفتاب اختر، ۳۲۶

آل رضا (سید) ۲۳۱، ۲۳۰

آل نبی (سید) ۴۰۹

۱

”ابجد خوان“ (میاں بشیر احمد) ۳۱۱

ابراہیم رحمت اللہ (سر) ۳۸۴

۳۳۸ اسماعیل میرٹھی، محمد اسماعیل	۸۰ احمد دین پال
۲۱۸، ۲۴ اسیر بالوئی، علی احمد خان	۲۸۵ احمد رضا
۲۲۰، ۲۱۹	۷۲ احمد زمان
۱۳۳ اشتیاق حسین	۱۱۷ احمد شاہ ابدالی
۳۶۹، ۳۷۷ اصغر گوندوی، اصغر حسین	۱۹۶ احمد شاہ بخاری (پطرس)
۱۱۸ اطہر بابوڑی، معشوق حسین	۹۵ احمد شجاع
۲۲۳ اطہر حسین (خواجہ)	۳۰۷ احمد عباس، خواجہ
۲۱۵ اطہر عباس	۱۲۵ احمد نسیم قاسمی
۲۸۱ اعجاز شمس	۳۴۹ اختر اورینوی، اختر احمد
۲۹۹، ۲۰۳ اعجاز صدیقی، اکبر آبادی	۲۹۳، ۲۹۱، ۲۹۰ اختر شیرانی، محمد داؤد خان
۲۶۵ اغرازا احمد	۱۴۲ اختر حسن خان
۴۲ اعظم کرپوری	۴۰۱ اختر علی خان
۲۳۰ اغن صاحب دقار	۲۵۸ ارتضیٰ حسین
۲۶۵ افتخار احمد	۲۸۹ ارسلو جاہ، رجب علی شاہ
۳۱۶ افتخار الدین	۳۸۶، ۳۸۵ ازرائیل، گولائندہ (سر)
۵۶ افتخار علی خان (ٹونک)	۳۲۳ اسد، اسد اللہ (خواجہ)
۳۲۵، ۳۲۳ افسر میرٹھی، خالد اللہ	۵۵ اسد لکھنوی، سلیمان خان
۳۸۸ افضل حسین قادری	۳۴۸ اسد القادری
۳۸۰، ۳۷۷ افضل علی (میر)	۳۸۲ اسد علی خان (میر)
۲۰۹، ۲۰۸، ۱۸۰ افق لکھنوی، دوار کا پرشاد	۳۴۲ اسعد (مولانا)
۷۰، ۵۹، ۳۷ اقبال، محمد اقبال (سر)	۲۸۶ اسلام الدین عثمانی، ابوالفیض
۲۳۲، ۱۶۶، ۹۵، ۸۱، ۸۰، ۷۱	۱۰۳ اسلم جیراچپوری
۲۰۲، ۳۱۰، ۲۹۳، ۲۳۳	۳۳۸ اسلم سیفی میرٹھی
۲۵۵ اکبر آبادی، اکبر حسین (سید)	۱۶۸ اسماعیل خان
۳۸ اکبری بیگم	۵۶ اسماعیل علی خان (ٹونک)

بڈن، حکیم احمد حسن ۱۱۷
 براؤن، ایڈورڈ جان ۱۶۵
 براؤن، ولیم ۱۶۴
 برنی، ضیا الدین ۳۳۳
 بسمل خیر آبادی، احمد حسین ۵۵
 بسمل، سید اکرام علی ۳۷۵، ۳۷۴
 بشیر الدین ۱۴۸
 بشیر الدین (مولوی) ۹۳
 بشیر الدین احمد دہلوی ۱۹۸۵، ۸۹۲۶، ۲۵
 بلقیس (بگیم عابد) ۲۹۳
 بلقیس (بنت ستین) ۴۱۶
 بنکم چندر چٹرجی ۴۳
 بہا الدین زکریا رح ۳۸۲
 بہار لکھنوی ۴۵
 بہاری سرن ٹنڈن ۲۷۵
 بیان یزدانی، غلام مرتضیٰ ۱۱۸
 بیخبر، برج کشن گول ۳۵۹
 بیخود، عباس علی خان ۳۰۸، ۳۰۷
 بیخود موہانی، محمد احمد ۳۷۷، ۳۷۶
 بیخود دہلوی، وحید الدین ۲۵۳
 بیدل، عبدالسمیع ۲۹۹

 پ
 پرویز شاہدی، محمد اکرام الدین ۱۴۳
 "پریم پجاری" (عنازیب شادانی) ۱۳۶
 پطرس بخاری، سید احمد شاہ ۱۹۶

اکرام علی بسمل (سید) ۳۷۵، ۳۷۴
 اکرم (بن مہر) ۳۰۶
 الطاف شہیدی ۱۲۵
 امتہ الغنی ۹۰
 امتیاز علی تاج ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۹۲
 امتیاز علی خان عرشی ۳۹۳
 امجد علی شاہ (ادوہ) ۲۲۸
 امجد مسلم (بن مہر) ۳۰۶
 امراؤ اللہ (مہاجر مکی) ۱۷۱
 امیر امیٹھوی، ابوالکمال ۳۷۶
 امیر احمد علوی ۱۳۱
 امین الدین ۲۸۴
 امین چنر ۷۱
 انا (دختر آبروی) ۱۶۷
 اندرسن مراد آبادی ۹۰
 انصار ناصری ۲۶
 انصاری، فخر احمد (ڈاکٹر) ۱۰۴
 انور دہلوی، امراؤ میرزا ۲۸۶
 انیس، میر بر علی ۵۹، ۳۰
 اوزنگ زیب (عالمگیر) ۱۴۷
 اولاد حسین شادان بلگرامی ۱۳۳
 ایلقتش شمس الدین ۳۸۲
 ایلپٹھ، ٹی، ایس ۱۹۶

 ب
 بارکر، سرارنسٹ ۳۳۲

۶۴ شہر عین الہدیٰ
۲۵۷ شنارائند کانپوری

ج

۱۹۶ جارج ہزارڈشا
۳۷۶ جالب دہلوی، سید بشارت علی
۲۳۸ جامی، خورشید احمد
۲۰۳ جاوید (پسر شکیل)
۲۰۶ جاوید سلطان
۸۷ جدو باغہ سرکار (سر)
۲۶۷ جگر بریلوی، شام موہن لال
۲۰۲، ۲۰۱ جگر مراد آبادی، علی سکندر
۳۰۳، ۲۳۷

۲۰ جگن ناتھ
۳۷۸، ۱۱۸ جلال لکھنوی، ضامن علی
۳۸۳، ۳۸۲ جلال الدین، جہانیاں جہانگشت
۳۸۳، ۳۸۲ جلال الدین سرخ بخاری
۱۸۲ جلیل مانپوری (فضاحت جنگ)
۳۱۵، ۲۷۲

۲۰۳، ۲۰۳، ۲۰۱، ۱۹۹ جمیل احمد قادری
۱۳۳، ۵۲ جمیل منطہری
۳۸۸ جناح، محمد علی
۲۵۸، ۱۸۲ جوش بلیج آبادی، شبیر حسن خان
۱۱۷ جوش بسیانی، لبحورام
۳۱۲ جہان آرا (بیگم شاہنواز)
۱۰۰، ۹۹ جھمن خان

۱۹۶ پو، ایڈگر الین
۲۶۲ پیرالوتی

ت

۲۹۱ تاجور نجیب آبادی
۳۱۱ تارا چند (ڈاکٹر)
۲۸۶ تسلیم، اساس الدین
۳۷۹، ۳۷۸ تسلیم، امیرائند
۲۸۳ تسلیم، محمد عثمان
۲۹ تفضل حسین خان (غلامہ)
۱۰۲ تقی زادہ ایرانی
۲۶۶ تلجا پرشار
۳۹۳ تمکین کاظمی
۲۱۰، ۲۰۸ تننا لکھنوی، رام سہاے
۲۵۸، ۲۱۱

۳۵۹ تیرتھ رام فیروز پوری
۲۶۰، ۲۵۸ تیغ الہ آبادی، مصطفیٰ حسین

ٹ

۱۵۵ ٹالٹائی
۱۶۲ ٹامن بی، آزاد
۳۵۷ ٹھاکر پرشاد کول
۱۶۸ ٹیگور، رابندر ناتھ

ث

۳۸ ثروت آرا بیگم
۳۱۳ ثروت جہان
۱۳۲ ثمر بسوانی

۲۵۷	حسین احمد مدنی (مولانا)	۱۹۶	جیروم کے جیروم
۱۲۳	حسین خان	۳۵	جین آسٹن
۳۲۴، ۳۲۳	حسینی، علی عباس		ج
۲۰۴	حضور احمد	۴۰۰	چراغ حسن حسرت
۲۶۴	حفظ الرحمن (مولانا)	۴۸	چکبست، برج نرائن
۳۰۰، ۲۹۳، ۲۰۰	حفیظ جالندھری، ابوالاثر	۲۱۲	چندر کلا دیوی شرم
۱۷۱	حفیظ اللہ	۱۹۶	چیک کیرن
۱۹۲	حمید علی	۱۴۸	چیخوف
۱۹۳	حمیدہ بیگم		ح
۱۷۱	حیدر حسن خان (مولانا)	۴۱۰، ۴۰۷، ۳۱۵	حالی، الطاف حسین
۲۵۸	حیدر رضا	۱۷۲، ۱۰۴	حامد علی خان
۳۱۸	حیدر علی خان (نواب)	۴۱۱	حبیب الرحمن، پروفیسر
	خ	۱۹۷	حجاب اسماعیل
۱۲۴	خان الاریشاہ	۴۰۰	حسرت، چراغ حسن
۳۱۸	خستہ، ہرگوپال	۳۳۹، ۱۸۹	حسرت موہانی، فضل الحسن
۹۱	خسرو، امیر	۴۰۱، ۳۷۹	
۳۱۲	خضر حیات خان ٹوانہ	۱۷۱	حسن بن محمد یمانی
۳۳۳	خلیق احمد نظامی	۲۹۰، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸	حسن شاہ (پیر)
۵۵	خلیل، ابراہیم علی خان (ٹونک)	۳۳۹	حسن مصطفیٰ، شفق عماد پوری
۳۲۹	خلیل جبران	۲۷۵	حسن بریلوی، حسن رضا خان
۲۳۳	خمار بارہ بنگوی	۱۶۹	حسن نظامی
۴۰۷	خواجہ احمد عباس	۳۸۳	حسن الحسینی (شاہ)
۱۸۹	خواجہ احمد فاروقی	۲۸۴	حسین الدین
۲۰۸	خیال لکھنوی، آما پرشار	۲۲۸	حسنین (پسراریب)
		۹۵	حسین، امام

۳۱۵	رادھا کرشنن، ہروپلی	د	
۲۹۹	راشدن، م (نذر محمد)	داغ دلوہی، نواب مرزا خان	۱۹۰، ۲۳
۳۰۶	راغب مراد آبادی		۲۷۶، ۲۵۳، ۱۱۸، ۱۱۷
۳۵۷	راگھوناتھ کول	دبیر لکھنوی	۵۹
۲۸۹	رجب علی شاہ (ارسطو جاہ)	درویش محمد	۲۸۳
۳۱۳	رشید احمد صدیقی	دلگیر اکبر آبادی	۱۹۳
۲۲۸	رضا علی، میرزا (اورھ)	دلیل خان	۹۰
۳۸۸	رضوان اللہ	دیبا نرائن نگم	۱۵۳
۳۳۷	رفعت اللہ	دیری، راجہ ناتھ کول عرض بگی	۳۵۹
۳۱۳	رفعت جہان (بنت بشیر احمد)	دیوہ کول	۳۵۷
۲۷۵	رگھب دیال	دیوی پرشار	۳۷۰
۳۵۵	رمز تلہری، وجاہت حسین	د	
۳۳۸	رنج میرٹھی، فصیح الدین	ڈیوران، ول	۲۹۲
۳۵۵	ریاض الحسن بلگرامی	ذ	
	رنا	ذاکر حسین (ڈاکٹر)	۹۹، ۹۸، ۸۹، ۳۹
۳۱۵	زبیدہ کلثوم		۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰
۳۱۳، ۳۱۲، ۳۱۱	زور، محی الدین قادری		۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶
	۳۱۷، ۳۱۵	زرہ لکھنوی، پورن چند	۲۰۸
۳۱۶	زرہ (بنت سیدین)	زرہ، محمد سمیع	۲۸
	س	ذکی زارثی	۷۳
۹۵	ساحرہ احمد شجاع (حکیم)	ذکیہ (بنت سیدین)	۳۱۶
۲۱۱	ساحرہ امرا ناتھ (پنڈت)	ذوالفقار علی (سید)	۱۹۲
۳۱۸	سالک، سالک رام	ذوالقدر جنگ	۹۱
۳۰۲، ۳۰۱، ۳۰۰	سالک، عبد المجید	د	
۲۵۳، ۵۹	سائل دلوہی، سراج الدین احمد خان	راجہ ناتھ کول عرض بگی دیری	۳۵۹

تذکرہ معاصرین

۳۳۶	سندرلال (پنڈت)	۳۰۷	سبحان خان
۲۷۶، ۲۷۵	سوزن بریلوی، بلدیو پرشار	۳۱۸	سبقت، مہتاب رائے
۲۳	سہگل، کندن لال (گلوکار)	۳۳۷	سخت و حسین
۳۴۰	سید احمد بخاری	۱۹۶	سرشار، رتن ناتھ (پنڈت)
	سید احمد بریلوی	۳۱۵	سروپی، رادھا کرشنن
۹۳	سید احمد دہلوی	۳۸۸	سروجنی نائیڈو
۹۱	سید حسین بکرامی (عماد الملک)	۱۸۹، ۱۰۶، ۹۱	سرسید احمد خان
۲۱۱	سید سجاد (ڈاکٹر)	۳۹۹، ۱۹۲	
۸۷، ۸۶، ۸۵	سید سلیمان ندوی	۳۸	سرور، درگا سہاے
۲۱۵	سید عابد حسین	۹۱	سرور الملک، سرور جنگ
۲۱۶	سید علی (مولانا)	۳۳۹	سروش عظیم آبادی
۱۷۱	سید علی زینبی	۵۲	سری کرشن سنہا
۲۱۶	سیدہ (بنت سیدین)	۱۶۷	سرنیا (بگیم آربری)
۲۱۰	سیدہ خاتون	۱۰۴	سعید انصاری
۳۳۹، ۳۳۸	سیف الدین احمد (حکیم)	۲۹۸	سعیدہ (بگیم روش)
۳۶۳، ۳۴۰		۲۳۳	سنگار لکھنوی
۲۵۷	سیف الدین کچلو (ڈاکٹر)	۳۰	سنگت کرانسی
۷۴	سیلاب اکبر آبادی (معشوق حسین)	۲۷۹	سلام سندیلوی
۳۶۸، ۳۶۷، ۳۵۸، ۱۵۴، ۱۲۵		۲۲۸	سلطان جہان بگیم (بھوپال)
	ش	۲۰۳	سلمہ (بگیم شکیل)
۱۹۶	شاہ جارج بزارڈ	۹۱، ۴۸	سلیم پانی پتی، وحید الدین
۳۵۵	شاد عظیم آبادی، علی محمد	۳۰۰، ۳۱۶، ۳۱۳	
۲۵۵، ۱۲۴	شاداں بکرامی، اولاد حسین	۲۳۸	سلیمان (بن عبدالرزاق)
۳۷۰	شارد پرشار	۹۱	سلیمان (سر شاہ محمد)
۲۹۷	شاہ طفیل احمد	۹۱	سلیمان اشرف

تذکرہ معاصرین

۳۱۸	صدرالدین شاہ	۶۴	شاہ حسین (سید)
	صدریاز جنگ (حبیب الرحمن خان شروانی)	۳۱۰	شاہدین ہمالیوں (میاں)
	۹۳	۳۱۹	شاہ مرن لال صوفی
۵۲	صدری حبیب	۹۱	شاہ محمد سلیمان (سر)
۱۲۵	صفر، سید صفر حسین	۸۶	شبلی (مولانا)
۱۲۴	صفر علی ایرانی	۱۷۱	شبلی (فقیہ اول)
۶۴	صفیر بلگرامی، فرزند احمد	۴۱۶	شبیر علی خان
۲۰۴	صفیہ (بنت شکیل)	۲۸	شجاع الدولہ
۲۳۸	صفیہ (بیگم اریب)	۲۱۲	شرم، چندر کلا دیوی
۳۲۰	صوفی، شاہ مرن لال	۲۰۸	شعاعی لکھنوی، ایشور پرشار
۲۸۲	صہبا قریشی	۳۳۹	شفیق عماد پوری، حسن مرتضیٰ
	ض	۳۸۲	شمس الدین المیتش
۶۴	ضو، سید احمد حسین	۲۵۷	شنکرا چاریہ (سوامی کرشن تیرتھ)
۱۰۱	ضیا الدین (ڈاکٹر)	۳۵۹	شوق، جگموہن رینہ
۳۷۵	ضیا الدین قادری	۲۸۵	شوکت، محمد اشام الدین
۲۰۰	ضیا القادری بدایونی، محمد یعقوب	۲۳۲	شوکت تھانوی، محمد عمر
	۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸، ۲۰۱	۱۷۳، ۱۷۲، ۱۰۱	شوکت علی (مولانا)
	ط	۱۰۳	شیدا، اجمل خان (حکیم)
۲۰۴	طارق (پسر شکیل)	۱۲۵	شیدا، راجندر ناتھ
۲۰۶	طارق (پسر مہر)	۱۱۸	شیلی (پرتی بسی)
۹۸	طالب حسین فرخ آبادی (پیر)	۲۱۰	شیونرین بھٹناگر
۱۷۰	طفیل احمد (سید)		ص
۲۹۷	طفیل احمد شاہد	۲۲۲	صابر براری
	طیب جی (بدر الدین فیض حسن بدر الدین)	۴۱	صالحہ عابد حسین
	۳۳۴	۲۰۸	صدر لکھنوی، لچمن پرشار

عبدالشکور (پروفیسر) : ۱۸۹، ۱۸۸
 ۳۷۵ عبدالعزیز (علیم)
 ۳۹۱ عبدالعلی، سید
 ۳۵۲ عبدالغفار (قاضی)
 ۳۱۱ عبدالقادر (شیخ، سر)
 ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۱۸ عبدالقادر بدایونی (ملا)
 ۲۱۹ عبدالقادر بدایونی (مولانا)
 ۳۱۷ عبدالقدیر صدیقی
 ۱۸۹، ۱۸۸ عبداللطیف (ڈپٹی)
 ۲۸۳ عبداللطیف قادری (یاہو پادشاہ)
 ۴۰۲، ۴۰۱، ۴۰۰ عبدالمجید سالک
 ۳۱۷ عبدالمجید صدیقی
 ۲۱۹ عبدالمقتدر قادری
 ۴۰۰ عبداللہ انصاری
 ۲۱۹، ۲۱۸ عبداللہ بدایونی (شیخ)
 ۲۶۲ عبداللہ (بن عباس)
 ۵۴ عبداللہ خان (ٹونک)
 ۳۸۸ عبداللہ ہارون
 ۱۷۱ عبدالوود جیرا جپوری
 ۳۳۲ عبید اللہ سندھی
 ۲۸۴ عثمان رضا (خلیفہ سوم)
 ۱۹۱ عثمان علی خان (نظام دکن)
 ۳۸۷، ۹۲
 ۹۳ عراقی، ہمدانی، فخر الدین
 ۲۹۴ عرشی رامپوری، امتیاز علی خان

ظ
 ظفر علی خان ۴۰۱، ۴۰۰
 ظہور الدین (سید) ۱۱۸
 ظہیر دہلوی ۵۵
 ع
 عابد حسین (سید) ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲
 عابد رضا ۲۵۸
 عابد علی خان ۳۹۱
 عاشق احمد سعید خان (ٹونک) ۵۵
 عباس، خواجہ احمد ۴۰۷
 عبدالحسین منطقی (سید) ۳۲۳
 عبدالحی (محدث دہلوی) ۲۴۶
 عبدالحی (مولوی، ڈاکٹر) ۳۱۵، ۳۱۴
 ۳۵۳، ۳۱۷
 عبدالحکیم (خلیفہ) ۳۸۴، ۱۷۴
 عبدالحکیم شاہ (دادامیاں) ۳۷۴
 عبدالحلیم صدیقی ۱۷۱
 عبدالحمید لاہوری ۲۵۳
 عبدالحی (خواجہ) ۱۰۴
 عبدالحی فرنگی محلی ۱۷۱
 عبدالرحمن بجنوری ۲۹۳
 عبدالرحمن نگرانی ۱۵۱
 عبدالسلام اسلم ۴۰۶
 عبدالسلام قدوائی ندوی ۱۷۳
 عبدالسمیع بیدل ۲۹۹

متذکرہ معاصرین

غ	غ	۲۳۶	عزیزان حبیب
۲۱۹، ۱۱۸	غالب	۲۹، ۳۵،	عزیز لکھنوی، محمد ہادی
۱۹۹	غفار احمد (شکیل)	۳۳۲، ۳۳۹	
۳۱۰، ۳۰۹، ۳۰۸، ۳۰۷	غلام الثقلین	۳۰۰	عزیز، نصر اللہ خان
۳۰۷	غلام الحسنین	۳۱۶	عزیز احمد
۳۰۸، ۳۰۷	غلام السبطین	۲۱	عشرت لکھنوی، عبدالرؤف (خواجہ)
۹۹	غلام حسین خان	۲۶۰	عصمت (بنت مصطفیٰ زیدی)
۳۰۰، ۲۸۸	غلام رسول، مہر	۸۱	عطا محمد (شیخ)
۲۹۰	غلام عباس صغیر	۸۵	عظمت علی (میر)
۳۷۳	غلام علی پیرزادہ (میاں جی)	۱۷۱	عقیل احمد جعفری
۱۱۷	غلام غوث (سید)	۳۷۲	علی احمد جلیپوری
۳۵۷	غلام مجتہد سندھی (پیر)	۱۸۲	علی اختر حیدر آبادی
۲۸۰	غلام محمد خان	۸۷	علی اشرف (سید)
۱۳۷	غوث محی الدین	۳۸۲	علی الموید
ف	ف	۲۵۷	علی برادران (شوکت علی، محمد علی)
۳۰۶	فاروق شاہین	۱۲۵	علیم اختر مظفر نگری
۳۳۸	فتح الجبار	۳۸۸	علی محمد راشدی
۹۳	فخر الدین عراقی	۳۸۲	علی نقی خواجہ امام دہم
۲۲۱	فداحسین (قاضی)	۹۲، ۹۱	عماد الملک (سید حسین بگرامی)
۹۸، ۹۷	فداحسین خان	۱۱۸	عنایت اللہ (سیاہ)
۲۵۸، ۱۸۲	فراق گورکھپوری، رگھوپتی سہاے	۹۱	عنایت رسول چریا کوٹی
۲۱۱	فراقی دریا بادی، راے سدھ ناتھ بلی	۷۲	عوض علی (سید)
۲۶۷	فرحت، گنگا دھرناتھ	۱۲۲۸	عیش لکھنوی، میرزا ابراہیم علی
۲۲۸	فرخندہ بخت (میرزا)	۲۳۰، ۲۲۹	
۲۹	فضل حسین خان (میرزا)		

۱۷۱	کلیم اللہ بہرائچی	۲۲۱، ۲۰۱	فضل رسول بدایونی
۳۳۶	کمال حبیب	۶۳	فضیلت النساء گیم
۳۵۸	کیفی، برجہوین دنا تریہ	۷۰	فقیر عزیز الدین
	گ	۷۱	فقیر نور الدین
۳۸۸، ۲۸۰، ۱۸۶، ۳۳	گاندھی (مہاتما)	۱۸۱	فہیم، صدیق احمد (قاضی)
۱۶۶	گجادرہ پرشاد	۱۷۰	فیاض احمد
۳۳۷	گل حسین	۱۸۲	فیض، فیض احمد
۳۱۹	گنپت سہاے (نشتی)	۳۱۶	فیض محمد
۲۵۲	گنگا سنگھ (سہارا جا)		ق
۲۰۳	گوپال ریڈی، بی	۳۱۰	قادر بخش (مولوی)
۲۱۰	گوری سہاے (ڈاکٹر)	۳۸۹	قاسم رضوی
۲۶۶	گوکرن پرشاد	۳۵	قائم علی (خان بہادر، سید)
۳۱۲	گیتی آرا (بیگم بشیر احمد)	۳۸	قرۃ العین حیدر
	ل	۲۹۹	قمر سنبھلی
۳۵۳	لاری ہتبول احمد	۳۳۰	قیسی، شمس الہدیٰ
۳۲۰	لال بہادر شاستری	۲۰۸	قیصر لکھنوی، جگدیا پرشاد
۱۱۸	لانگ فیلو	۷۳	قیصر بھوپالی، محمد یوسف
۳۸۹	لائق علی (میر)	۲۰۳، ۲۰۰	قیصر حسین قادری
۱۹۶	لٹن، لارڈ		ک
۲۵۸، ۲۵۷	لخت حسنین (سید)	۲۰۲	کاردار (سٹر)
۳۵۹	للہ عارفہ	۲۶۶	کالکا پرشاد
۲۶۳	لیاقت علی خان (سما جزادہ)	۶۰، ۵۹	کامل نظامی
	م	۲۵۷	کرشن تیرتھ، سوامی (شکر آچاریہ)
۲۹۰، ۹۲	مالک رام	۲۹۹	کلب علی (حکیم)
۱۸۶	مائل دہلوی، مرزا محمد تقی بیگ	۳۱۶	کلب علی خان (نواب)

تذکرہ معاصرین

۲۳۸	محمد شریف	۱۹۹	مبارک علی سونہ
۲۸	محمد شفیع (میرزا)	۲۵۹	مجتبیٰ (ایسر مصطفیٰ زیدی)
۳۱۲	محمد شفیع (سرمیاں)	۲۵۸	مجتبیٰ حسنین
۱۲۰	محمد عبدالحلیم	۲۲۵	مجنون گورکھپوری، احمد صدیق
۲۵۴	محمد عثمان عارف	۲۸۳	محبوب (بیگم عابد)
۴۰۱، ۲۵۷، ۱۷۲، ۱۰۱	محمد علی (مولانا)	۹۰	محبوب عالم (منشی)
۲۲۸	محمد علی شاہ (اووہ)	۹۱	محبوب علی خان (نظام دکن)
۴۷۴	محمد گیسو دراز	۳۷۹	مجتبیٰ موہانی
۲۱۸	محمد فضل الرحمن	۱۲۶	مختار الحق
۱۹۲	محمد قاسم نانوتوی	۵۲	مختار الحق (جامعی)
۸۶، ۸۵	محمد مبین (ڈاکٹر)	۴۰۷، ۲۱۹، ۱۲۵، ۹۱	محمد (رسول اللہ)
۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱	محمد مجیب (پروفیسر)	۱۸۹	محمد ابراہیم فاروقی
۳۳۶، ۳۳۱		۳۹۰	محمد اجمل خان
۳۳۹	محمد محفوظ	۲۸۵	محمد احتشام الدین
۹۰	محمد مستجاب اللہ خان مقبول	۱۷۳	محمد اکرام، شیخ
۹۱، ۹۰، ۸۹	محمد تقی خان شرانی	۲۹۷	محمد اکرم غنیمت کنجاہی
۹۳، ۹۲		۲۸۹	محمد باقر
۲۷۲، ۲۷۱	محمد نذیر	۱۳۵	محمد تفضل اللہ خان
۳۳۱	محمد نسیم	۳۱۳	محمد جعفر
۳۳۱	محمد وسیم	۱۵۳	محمد جعفر (حافظ)
۱۹۲	محمد یعقوب	۳۷۶، ۳۷۵	محمد حسین، منشی
۱۸۱	محمد یعقوب	۳۲۹	محمد حسین بیکل
۲۱۹، ۲۱۸	محمد یعقوب	۳۱۳	محمد سرور (حاجی)
۱۹۸، ۱۹۳	محمد بیگم	۱۷۱	محمد سلیم کنتوری
۱۹۹	محمود (جٹس سید)	۳۳۴	محمد سلیمان (سر شاہ)
		۳۶۲	محمد سلیمان عباسی (قاضی)

۳۳۲، ۱۹۹	مولی لال نہرو	۱۱۷	محمود الحسن (مولانا)
۲۵۱	مولا بخش (شیخ)	۲۸۶	محمود الدین عثمانی، ابوالفضل
۳۷۸، ۱۲۵	مومن	۲۹۳	محمودہ
۵۹	مومن لال بگولہ		محی الدین قادری زور... دیکھیے زور
۲۲۹، ۲۲۸	مہدی حسین، میرزا	۴۱۰	مختار فاطمہ
۳۱۸	مہتاب رائے سبقت	۲۳۸	مخدوم محی الدین
۴۰۰، ۳۸۸	مہر، غلام رسول	۹۱	مزیل اللہ خان (نواب)
۲۷۶	مہر بریلوی، گویشپور نرائن مہرا	۴۱۰	مستحسن زیدی
۲۱	میر، میر تقی	۴۱۰	مصداق فاطمہ (صالحہ عالمہ حسین)
۸۰	میر حسن (سید)	۲۵۸	مصطفیٰ حسنین
۸۵	میر محمدی (حکیم)	۳۷۱، ۵۵	منظر خیر آبادی
۴۰۰	میکش، مرتضیٰ احمد خان	۲۰۸	مطلع لکھنوی، اورے راج
۴۱۰	میکنزی (مٹر)	۳۷، ۲۵	منظہ علی (میر)
۲۹۳	مینو چہر	۱۲۴	منظہ علی شاہ ایرانی
	ن	۷۳	منظہ علی (شفا گویا باری)
۲۵۸	ناصر رضا	۲۲۱	معزز، میرزا محمد عزیز
۳۰۵، ۱۷۰	ناظر حسین	۲۵	معصوم علی (میر)
۸۶، ۸۵	نجیب اشرف ندوی	۴۰۷	ملک علی (خواجہ)
۲۰۴	نجمہ (بنت شکیل)	۱۹۳، ۱۹۲، ۳۶	ممتاز علی (سید)
۳۶، ۳۵	نذر الباقر (میر)	۲۸۴	منظر وفائز، رشید الدین فاروقی
۳۵	نذر زہرا بیگم	۲۷۱	منٹو، سعادت حسن
۲۸، ۳۷، ۳۶	نذر سجاد حیدر	۱۹۹	منظر علی سوختہ
۲۶، ۲۵	نذیر احمد (شمس العلماء)	۱۷۳، ۱۷۲	منفلوطی، مصطفیٰ الطیفی
۳۷۸	نسیم، اسغر علی خان (نواب)	۲۰۸، ۵۹	منور لکھنوی، بشیشور پرشار
۴۰۰	نصر اللہ خان عزیز	۳۵۸، ۲۱۱، ۲۱۰، ۲۰۹	

۲۳۸	واحد خانون	۵۴	نصیر الدولہ (ٹوٹک)
۳۷۷	وارث علی شاہ (دیوہ)	۳۷۴	نصیر الدین، چراغ دہلی
۱۳۴	وحشت کلکتوی، رضا علی	۳۱۷	نصیر الدین ہاشمی
۲۳۶	وحید الحق حقی	۲۱۸	نظام الدین (خواجہ)
۳۱۴، ۹۱، ۳۸	وحید الدین سلیم پانی پتی	۳۱۰	نظام الدین (مولوی)
۳۰۰، ۲۱۶		۳۷۴، ۳۳۲	نظام الدین اولیا
۲۸۴	وحید الرحمن (پروفیسر)	۲۱۱	نظر، نوبت رائے
۳۵۵	وصل بلگرامی، مقبول حسین	۲۴۶	نعمان احمد (قاضی)
۵۹	وفا، دھرم پال گپتا	۲۹۳	نفیس لکھنوی
۲۳۰	وقار، لغن صاحب	۳۸۴	نواب علی، سید چودھری
۸۱	وقار الملک، مشتاق حسین (نواب)	۲۲۲	نور، یوسف حسن
۲۵۹	ویرانان ہل (بگیم مصطفیٰ زیدی)	۲۶۳	نور احمد
۵		۵۲	نور احمد
۸۵	باشم شیر	۴۳	نور الحسن (شیخ)
۱۹۹	ہدایت اللہ سوختہ	۱۸۳	نورانی بگیم
۳۱۱، ۳۱۰	ہمایوں، میاں شاہدین	۸۱، ۳۷	نور محمد (عرف میاں نتھو)
۴۱۱	ہمایوں کبیر	۳۴۲، ۳۱۵، ۲۷۲	نوری، نور اللہ
۱۹۶	ہیوگو، وکٹر	۲۰۲	نوشاد علی (سید)
۴		۲۵۲	نہال سنگھ (رائے بہادر)
۲۱۸	یاد حسین (شیخ)	۴۰۰	نیاز فتحپوری
۴۵	یاس یگانہ، واجد حسین	۳۰۵، ۲۷۰	نیاز احمد
۲۹	یلدرم، سجاد حیدر	۲۰۸	نیساں، ماتا پرشار
۲۲۲	یوسف حسن نور		و
۸۹	یوسف خان	۲۲۸	واجد علی شاہ (اوزھ)

۲ مطبوعات (کتب رسائل)

۲۸۱	اجالا (ہندی)	۳۲۰	آتش گل (جگر)
۳۷، ۳۹	اختر النساہگم (نذر سجاد)	۲۹۷	آجکل (ماہنامہ دلی)
	ادب اردو میں کشمیریوں کا حصہ	۱۹۵	آرام کے ڈرامے (تاج)
۳۵۹	(طالب)	۱۹۶	آرمز اینڈ دی مین (شا)
۲۱۲	اداسے کفر (منور)	۵۲	آزاد (روزنامہ)
۳۱۷	اردو (تماہی)	۲۸۱	آسان ہندی (باسط)
	اردو غزل گوئی اور دور حاضر	۱۳۱	آشفہ سری میری (ناظر)
۱۳۷	(عندلیب)	۲۸	آفتاب وطن (آفتاب)
۳۱۸	اردو کی ادبی تاریخ (سروری)	۳۱۴، ۳۱۰	آندھی میں چراغ (سیدین)
۱۳۳	اردو کے ہندو ادیب (ناظر)	۱۱۰	آواز غالب (شار)
۳۱۸	اردو شاعری کا ارتقا (سروری)	۳۷	آہِ مظلوماں (نذر سجاد)
۱۰۳	اردو کے معنی	۱۱۰	آہٹیں (شار)
۵۲	استقلال (پٹنہ)	۳۲۵	آئیڈیل کنگ (اختر تلہری)
۲۳	اسلام اور نظریہ شرافت (رفیق)	۱۶۳	آئی سی ایس (حسینی)
۳۳۳	اسلامی تصوف کا آغاز (حبیب)	۱۱۰	آیات جنتوں (شار)
۲۲۹	اشک و شبہم (اشعر)		۱
۴۱۴	اصول تعلیم (سیدین)	۳۲۵	ابتلائے عظیم (اختر تلہری)
۲۱۳	افکار بلند (منور)	۱۰۸	ابو خان کی بکری (ذاکر حسین)
۷۰	اقبال ان پچرز (انگریزی)	۴۰	اتحاد (ہفتہ وار بمبئی)
	اقبال کا تعلیمی فلسفہ (انگریزی، سیدین)	۴۰	اثرستان (اثر)
۳۱۴		۴۰	اثر کے تنقیدی مضامین (اثر)

۲۱۳	ایلیز روز ویلٹ (منور)	۲۲۱، ۲۰۱	اکمل التاریخ (ضیا)
	ب	۹۳	البشیر (اناوہ)
۲۵۳	بادشاہ نامہ (عبدالمجید لاہوری)	۲۶۴	الجمیۃ (روزنامہ)
۲۸۲	باسط کے سوشلزم	۲۶۴	العزم (ماہانہ)
۱۶۳	باسی پھول (حسینی)	۹۲	المبین (سلیمان اشرف)
۲۵۴	باغ فردوس (بیدل)	۲۱۳	الہامات ایرانی (منور)
۴۰۵	بال جبریل (اقبال)	۲۱۳	الہامات مغرب (منور)
۴۰۵	بانگ درا (اقبال)	۳۹۹، ۳۹۸	الہلال (ہفتہ وار، کلکتہ)
۱۱۰	بتکدہ (شار)	۱۷۲	الی اکواخ الفقرا (منقلوطی)
۱۸۲	برگِ آوارہ (جامی)	۱۶۳	امیر خسرو کی کہانی (حسینی)
۲۶۴	برہان (ماہنامہ دلی)	۱۹۴	انارکلی (تاج)
۲۳	بزمِ داغ (رفیق)	۷۱	انجن (فقیر وحید الدین)
۱۴۸	بساطِ رقص (مخدوم)	۱۱۰	اندازِ غالب (شار)
۲۹۳	بشر ہے کیا کہیے (عابد)	۳۳۲	انڈی پنڈٹ (روزنامہ لکھنؤ)
۹۲	بشری (چریاکوٹی)	۱۳۷	انشایٰ ابوالفضل
	بہمنی میں اردو کا پہلا ڈرامہ - خورشید	۴۰۳	انقلاب (روزنامہ لاہور)
۱۹۵	(تاج)		انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر
۳۲۹	بنفشتہ کا پھول	۳۶۵	(لطیف)
۳۰	بہاراں (اثر)	۳۱۶	انگریزی افسانے
۲۱۰	بھارت (ہفتہ وار)	۲۰۹	اودھ اخبار
۳۰	بہارستان (اثر)	۲۱۳	اودھوت کا ترانہ (منور)
۳۶۰، ۳۵۹	بہار گلشن کشمیر (تذکرہ)	۴۰۷	ایجوکیشن (اسپنسر)
۳۰، ۲۰	بھگوت گیتا (کی شرح)	۳۶۸	ایشیا (ہفتہ وار)
۴۳	بگناہ مجرم (سدرشن)	۲۹۲	ایفر و ڈانٹ (انگریزی): پیرالونی
		۱۶۳	ایک عورت ہزار جلوے (حسینی)

پ	ت
پاس گریباں (اریب)	۳۱۲
پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری	۳۶۸
(شار)	۳۲۹
پانچ مقبول طنز و مزاح نگار	۳۹
(شار)	۲۲۱
پرائڈ اینڈ پریجودس	۳۵۶
پرکتوی راج چوہان (تیرتھ رام)	۳۲۴
پرچم (ماہنامہ کراچی)	۳۲۲
پردہ اور اسلام (علی بہادر خان)	۳۲
پکار (اشعر)	۶۵
پکار (ہفتہ وار)	۱۲۷
پھول (ہفتہ وار، لاہور) ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴	۳۷
۲۰۱، ۱۹۳	۲۱۱، ۳۹۰
پھوار (شار)	۸۷
پھولبن (ابن نشاطی)	۴۰
پھولبن (مخدوم)	۱۲۸
پھولوں کی پھڑکی (حسینی)	۱۶۳
پیام اقبال (غذلیب)	۱۲۷
پیام فلک (فلک)	۱۸
پیام شرق (اقبال)	۱۶۶
پیام وطن (روزنامہ)	۵۲
پیام یار (ماہنامہ لکھنؤ)	۹۰، ۸۰
پیسہ اخبار (لاہور)	۱۱۹، ۹۱
	۳۳۸
	۳۳۳

۳۱۰	جذبات ہمالیوں (شاہین)	۱۹۰	تنقیدی سرمایہ (عبدالشکور)
۲۱۲	جگر بے لخت لخت (منور)	۳۲۵	تنقیدی شعور (اختر تلمیری)
۴۸	جلوہ آفتاب (آفتاب)	۱۳۳	تنقیدی شعور (ناظر)
۲۳	جلوہ احسن (رفیق)	۴۰۱، ۱۹۳، ۱۹۲	نہذیب نسواں (لاہور)
۱۱۹	جلوہ یار (ماہنامہ لکھنؤ)	۲۱۰	یہج (روزنامہ دلی)
۱۶۶	جواب شکوہ (اقبال)	ط	ٹ
۲۲۱	جوار غوث الوری (ضیا)	۳۲۹	ٹوٹے ہوئے پر (اشعر)
۴۱۰	جواہرات حالی (حالی)	ث	ث
۳۰۶	جوش و ہوش (عقیل)	۳۶۸	ثریا (ماہنامہ، اگرہ)
۱۶۲	جوہر سہفہ دار (بمبئی)	ج	ج
۲۵۹	جوہر آئینہ (طالب)	۱۴۴	جام بخودی (بخود)
۲۸۲	جیون رکھا (باسط)	۳۶۶	جام جہاں نما (ماہنامہ لکھنؤ)
ج	ج	۱۸	جام فلک (فلک)
۲۱۳	چارودت (منور)	۱۰۸	جامع کیا ہے (زاکر حسین)
۱۹۶	چچا چھکن (ماج)	۴۷	بانبار (مذہب)
۲۱۲	چراغ دیر (منور)	۱۱۰	بان پچان (شاد)
۲۶۵	چنار (ماہنامہ سرنگر)	۱۳۳	جائزے (ناظر)
۱۴۳	چندرکلا (ناظر)	۱۶۹	جپ جی (ترجمہ محمد اجل خان)
۴۳	چندن (افسانے)	۲۱۶	جدید اردو شاعری (سروری)
۴۲	چندن (ماہنامہ)	جسیدہ بین الاقوامی سیاسی معلومات	
۱۳۷	چہار مقالہ (عروسی سمرقندی)	۲۶۴	(آزاد)
۳۰	چکان بین (اشر)	۲۶۴	جدید سیاسی معلومات (آزاد)
۱۳۷	چھوٹا خدا (عندلیب)	۳۷۱	جذبات سامی (سامی)
۱۳۸	چیری آرچرڈ (چمنوف)	۴۸	جذبات کی دنیا (آفتاب)
۳۱۶	چینی اور جاپانی افسانے	۴۸	جذبات وطن (آفتاب)

२२५

۳۷۹	رسائل تصوف (افقر)	۲۸۶	دیوان شاعری
۲۵۹	رشتات التخیل (طالب)	۱۰۳	دیوان شیدا (اجمل خان)
۲۰۲	رعنایاں (شکیل)	۱۰۳	دیوان غالب (ارزو)
۱۶۳	رفیق تہلی (حسینی)	۱۳۶، ۱۲۵	دیوان غالب (فارسی)
۶۵	رقص حیات (پرویز)		ط
۸۷	رقعات عالمگیر (نجیب اشرف)	۱۱۰	ڈارلنگ (شار)
۷۲	رگ حیات (شفا)	۱۶۰	ڈالیز ہاوس (ابن)
۲۱۳	رگھوونش (منور)		ڈفرنٹ کلچرل زونز انڈیا
۱۶۶	رموز بخودی (اقبال)	۳۸۷	(لطیف)
۳۰	رنگ بست (اشرف)	۱۶۳	ڈیگنوں کا پارشاہ (حسینی)
۲۰۲	رنگینیاں (شکیل)		ذ
۲۱۳	روح تہذیب (سیدین)	۲۱۳	ذکری سے آقاب (منور)
۲۱۳	روحانی مطالعہ (منور)	۱۰۷	ذکر حسین (ذکر حسین)
۷۰	روزگار فقیر (فقیر وحید الدین)	۲۱۳	زہن انسانی کا ارتقا (سیدین)
۲۶۰	روشنی (مصطفیٰ زیدی)		ر
۱۹۰	روضۃ الرضوان (عبدالشکور)	۱۶۳	راج ہٹ (حسینی)
۱۹۶	رونق کے ڈرامے (راج)		رات کا بھولا اور دوسرے افانے
۳۷۹	رہنمائے شاعری (افقر)	۳۱۸	(سروری)
۸۷	رہنمائے صحت (نجیب اشرف)	۳۲۹	راز و نیاز (اشعر)
۱۰۷	ریاست (ذکر حسین)	۷۰	راکھ تلے (شار)
۱۷۲	ریاض و اہنامہ، کراچی	۴۱۲	رامائن و الیکٹیٹر (منور)
۹۰	ریاض الاخبار	۲۱۳	رام کتھا دمنور
۳۲۹	ریت اور جھاگ (اشعر)	۱۳۷	رباعیات بابا طاہر عریاں (عندلیب)
۲۶۲	ریڈ اسٹار اور چائنا (انگریزی)	۱۷۵	رباعیات خیام (داقت)
۲۱۲	ریزہ گل (منور)	۳۲۹	رخسانہ (اشعر)

سذکرۂ معاصرین

۲۳	سدا بہار پھول (سدرشن)
۱۲۵	سدرہ وطوبی (الم)
۳۱۸	سراج اور اس کی شاعری (سروری)
۳۱۸	سراج سخن (سروری)
۲۶۵	سرخ بچے (آزاد)
۲۶۲	سرخ چین کے رہنما (آزاد)
۱۱۰	سرخ حاشیے (شار)
۱۴۸	سرخ سویرا (مخدوم)
۱۶۴	سر سید احمد پاشا (حسینی)
۳۲۴	سرفراز (روزنامہ، لکھنؤ)
۱۱۰	سر قہ اور توار (شار)
۳۲۲	سر یارے تسکین (تسکین)
۲۶۷	سرور سرمدی (ناشار)
۲۱۳	سری روپ کلا (منور)
۳۷۹	سعی عمل (افقر)
۷۱	سفرنامہ منشی امین چند
۱۲۵	سلسبیل (الم)
۲۸۵	سلسلۃ الذہب (شوکت)
۳۳۲	سلطان محمود غزنوی (حبیب)
۳۹۹	سلطنت (حیدر آباد)
	سمندری جوان اور دوسرے افسانے
۲۱۳	(منور)
۱۱۰	سمندری شہزادی (شار)
۱۱۰	سنگم (شار)
۱۳۳	سنہرا حلقہ (ناظر)

من	
۳۱۸	زبان اور علم زبان (سروری)
۲۳	زبان داغ (رفیق)
۳۱۴	زبان، زندگی اور تعلیم (سیدین)
۱۶۶	زبور عجم (اقبال)
۷۴	زخم گل (شفا)
۱۵۴	زرین افسانے (راز)
۲۱۲	زعفران زار (منور)
۲۶۷، ۱۵۴	زمانہ (ماہنامہ، کانپور)
۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳	زمیندار (روزنامہ، لاہور)
۲۶۰، ۲۵۸	زنجیریں (تیغ مصطفیٰ زیدی)
۳۰	زنگاری بگم (اثر)
۳۳	زہریلا آب حیات (سدرشن)
مس	

۲۶۵	سات تارے (آزاد)
۵۹	سازِ حیات (فرحت)
۲۶۷، ۱۳۷	ساقی (ماہنامہ دلی و کراچی)
۶۰	ساقی نامہ (فرحت)
۲۱۳	ساگر سنگیت (منور)
۱۱۹	سبعہ تیارہ (ناطق)
۲۶۵	سچ جھوٹ (آزاد)
۱۳۷	سچی کہانیاں (عندلیب)
۱۳۳	ستاروں سے آگے (ناظر)
۲۲۱	ستارہ چشت (ضیا)
۳۷۲	ستارہ محمدی (علی احمد جلیپوری)

۲۱۳	شکنتلا (منور)	۸۷	سوراج (نجیب اشرف)
۱۶۶	شکوه (اقبال)	۲۱۳	سوز اقبال (منور)
۱۰۸	شکھشا (ذاکر حسین)	۲۱۲	سوز وطن (منور)
۴۸	شمشیر وطن (آفتاب)	۴۳	سولہ سنگار (سدرشن)
۳۲۵	شہادت عظمیٰ (اختر تلہری)	۱۶۹	سیرۃ محمد رسول اللہ (محمد اجل خان)
۲۶۰	شہر آفر (مصطفیٰ زیدی)	۱۷۲	سیرۃ محمد علی (رئیس احمد جعفری)
۳۲۹	شہناز (اشعر)		سیرۃ الحمید فی احوال سعید
۴۱۴	شہید وفا (سیدین)	۲۲۱	(فدا حسین)
۳۲۹	شیطان (اشعر)	۲۶۵	سیرۃ صحابہ (آزار)
	ص	۱۵۴	سیلاب اکبر آبادی (راز)
۳۳۲	صحائف اسعد (تسکین)		ش
۲۶۲	صحیفہ (تماہی، لاہور)	۷۴	شاخ زیتون (شنا)
۲۸۶	صحیفہ خوشنویسان (شاغل)	۳۶۸	شاعر (ماہنامہ، اگرہ زمینی)
۱۵۵	صحیفہ برار (راز)	۲۷۶	شام بہار (دیا)
۲۱۲	صنعتیہ (منور)	۱۱۰	شام نگریں سینہ آیا (شاد)
۲۰۴	صنم و حرم (شکیل)		شاہ نگین حضرت جی اور ان کا کلام
۲۱۳	صہبائے بزم (منور)	۱۹۰	(عبدالشکور)
	ض	۲۰۰	شاہنامہ اسلام (حفیظ)
۲۰۵	ضرب کلیم (اقبال)	۱۶۳	شاید کہ بہار آئی (حسینی)
۱۹۰	ضروری باتیں (عبدالشکور)	۲۰۴	شبستان (شکیل)
	ط	۱۸۲	شرارے (جانی)
۲۱۸	طبقات اکبری (نظام الدین)	۴۹	شریعتی انجنادیوی (آفتاب)
۳۱۲	طلسم زندگی (بشیر احمد)	۳۲۵	شعرا و ادب (اختر تلہری)
۲۱۲، ۲۱۱	طواف عجم (منور)	۲۱۴	شعری خاکے (منور)
۳۱۷	طیلسانین (حیدر آباد)	۴۵	شعلہ آواز (سراج)

۳۰	فرنگ اثر (اثر)
۱۱۰	فریاد (شار)
۱۹۰	فضل الرحمن اسلامیہ کالج بریلی میگزین
۲۰۷	فلسفہ تعلیم (غلام الحسنین)
	ق
۱۱۰	قاشین (شار)
۲۶۰	قبائے ساز (مصطفیٰ زیدی)
۳۱۶	قدیم افسانے
۱۶۲، ۹۵، ۲۵	قرآن
۱۳۵	قصائد قافی
۳۱۸	قصۂ بنیظیر (منعتی)
۴۱۴	قومی سیرت کی تشکیل (سیدین)
۲۹۳	قیامت کی رات (عابد)
	ک
۲۱۲	کارنامہ اسلام (بشیر احمد)
۹۱	کارنامہ مہدی (سرور الملک)
۳۰۰	کاروان (روشن صدیقی)
۵۲	کاروان ہند (ہفتہ وار)
۱۶۳	کانٹوں میں پھیل (حسینی)
۲۱۲	کائناتِ دل (منور)
۱۶۳	کچھ ہنسی نہیں (حسینی)
۳۱۶	کردار و افسانہ (سروری)
۲۵۹	کرن (اہنامہ، الہ آباد)
۳۵۹	کشمیر کا فارسی ادب (طالب)
۳۱۵	کشمیر کے دو ادیب (سروری)

	ظ
۱۹۶	ظریف کے ڈرامے (تاج)
	ع
۹۳	عشاق نامہ (عراقی)
۲۰۹	عصر جدید (ماہنامہ، میرٹھ)
۳۱۵	علوی تصورات (اختر تلہری)
۹۱	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ
۴۱۴	علی گڑھ کی تعلیمی تحریک (سیدین)
۱۹۰	علی گڑھ میگزین
۳۲۹	عمر فاروق اعظم (اشعر)
۴۳	عمورت کی محبت (سدرشن)
	غ
۳۹۴، ۳۹۳	غالب (عبداللطیف)
۲۰۳	غالب (مہر)
۳۵۳	غالب (انسائیکلو پیڈیا، خیر پوری)
۱۱۰	غالب اور اس کی شاعری (شار)
۳۹۴	غالب، دیوان (نسخہ حمید)
۳۶۴	غالب، دیوان (نسخہ عرشی)
۱۵۱	غریب خانے تک (رئیس احمد جعفری)
	ف
۱۹۰	فانی (عبدالشکور)
۲۱۳	فادوسٹ (منور)
۳۱۶	فرانسیسی افسانے (عزیز احمد)
۳۷۹	فردوس معانی (افقر)
۹۴	فرنگ آصفیہ (سید احمد)

۲۱۳	گیتا نجلی منظوم (منور)	کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ (سروری)
۲۱۳	گیتا نجلی نثر (منور)	۳۱۸
۲۱۳	گیت گووند (منور)	۱۸
ل		کلام فلک (فلک)
۸۸	لغات گجری (نجیب اشرف)	۳۱۸
۱۱۰	لکار (شار)	کلیات سراج (سروری)
۹۳	لمعات (عراقی)	۳۸۹
۲۱۳	لنکن نے کہا (منور)	کلیرین (ہفتہ وار، حیدرآباد)
۱۹۹	لیلا یا محاسنہ غرناطہ (تاج)	۱۱۹
۱۶۵	لیلی مجنون مثنوی	کلیل میں غلیل (ناطق)
م		۲۱۳
۱۰۷	مازی معاشیات (ذاکر حسین)	کمار سمبھو (منور)
	مارشل ٹیٹو اور جمہوریہ یوگوسلاویہ	کنز المطالب، شرح دیوان غالب
۲۶۳	(آزار)	۱۱۹
۱۵۵	ماشا (راز)	کوش و تسنیم (الم)
۲۱۳	مالتی مادھو (منور)	۱۶۳
۲۱۲	مالویکا گنی مترا (منور)	کولنگری (حسینی)
۳۳۲، ۳۳۰	متابع تسکین (تسکین)	کوفہ (مصطفیٰ زیدی)
۳۵۰، ۲۳۹	متابع شوق (شاغل)	۲۶۰
۲۹۳	محاسن کلام غالب (بجنوری)	کیف سردی (ناشار)
۱۱۰	محاورات غالب (شار)	گ
۲۰۴، ۳۰۰	محراب غزل (روش)	گاے اماں (حسینی)
۷۱	محسن اعظم (فقر وحید الدین)	۱۶۳
۴۰	محمود غزنوی (علی بہادر خان)	۲۱۳
۳۷۹	مختصر سوانح عمری حاجی دارث علی شاہ (انقر)	گجندر موش (منور)
		۱۹۰
		گرام سدھار (عبد الشکور)
		۸۱
		گلبانگ حیات (امین حنین)
		۱۳۸
		گل تر (مخدوم)
		۲۱۹
		گلستان (سعدی)
		۳۳۲
		گلگونہ (تسکین)
		۳۸
		گودڑ کالال (اکبری بیگم)
		۳۷۶
		گوئندہ ڈسٹرک گزٹ
		۱۶۹
		گیتا (ترجمہ اجمل خان)
		۱۲۵
		گیتا منظوم (الم)

معاشیات: مقصد و منہاج	۳۱۱، ۱۱۹	مخزن (ماہنامہ، لاہور)
۱۰۷ (ذاکر حسین)	۲۱۳	مدراراکشس (منو)
۱۰۷ معاشیات قومی (ذاکر حسین)	۳۹	مدینہ (بجنور)
۱۲۵ معرکہ مکرمہ (الم)	۱۹۶	مڈسمرناٹ ڈریم (شیکسپیر)
۲۱۲ معروضات (منور)	۳۷	مذہب اور عشق (نذر سجاد)
۳۰ معین نسوان (ماہنامہ، بمبئی)	۳۲۵	مذہبی تصورات (اختر تلہری)
۳۷۶: ۳۷۵ مفید روزگار (ہفتہ وار، بمبئی)	۳۱۸	مراۃ الاسرار (شاہ صدر الدین)
۳۲۵ مقالات تلہری (اختر تلہری)	۳۹۰، ۳۵۹	مرقح افکار (طالب)
۸۷ مقدمہ رقعات عالمگیر (نجیب اشرف)	۲۲۱	مرقح شہادت (ضیا)
۲۱۶ مقدمہ شعر و شاعری (حالی)	۳۵۳	مرقح غالب (خیر)
۲۴۲ مکاتیب جگر (تسکین)	۳۰	مزامیر (اثر)
۳۰۶ مکالمات ابوالکلام (غفیل جعفری)		مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل
۲۱۶ مکتبہ (ماہنامہ، حیدرآباد)	۳۱۲	(بشیر احمد)
۲۴۲ مکتوبات عزیز (تسکین)	۳۸۷	مسلم کلچر ان انڈیا (لطیف)
۲۲۱ مناقب اولیائے قادریہ (ضیا)	۱۳۷	مشرقی پاکستان (روزنامہ، ڈھاکہ)
۱۸۲ منزل کی طرف (جامی)	۳۶۸	مشورہ (آگرہ)
۴۸ من مہینی (آفتاب)	۲۷۲، ۲۷۱	مصور (ماہنامہ، بمبئی)
۱۹۶، ۱۹۴ موت کاراگ (ناج)	۲۰۸	مضامین اصلاح و ترقی (ثقلین)
موج میری صدف صدف	۱۳۳	مطالعہ انیس (ناظر)
۲۶۰ (مصطفیٰ زیدی)	۱۳۳	مطالعہ حالی (ناظر)
۳۳۳ مولانا ابوالکلام آزاد (حبیب)	۱۳۳	مطالعہ شبلی (ناظر)
۳۷۶ مولانا بیچ (ہفتہ وار، بمبئی)	۳۰	مطالعہ غالب (اثر)
مولانا موردی کا اسلامی نظریہ سیاست	۱۳۳	مطالعہ قدرت (بجنور)
۳۲۵ (اختر تلہری)	۱۱۰	مطالعہ (شار)
۱۸ مہاجارت (فلک)	۹۱	مطلع الانوار (امیر خسرو)

۲۷۹	نظرگاہ (افقر)
۳۳۳	نظم و نسق ایران (عجیب)
۳۰	نغمہ خداوندی (اثر)
۲۲۱	نغمہ ربانی (دنیا)
۲۰۴	نغمہ فردوس (شکیل)
۱۹۴	نقاد (ماہنامہ، آگرہ)
۲۸۲	نقش آرزو (باسط)
۱۳۷	نقش بدیع (عندلیب)
۳۵۵	نگار (ماہنامہ، لکھنؤ)
۲۵۹	نوائے ادب (تماہی، بمبئی)
۱۵۵	نوائے راز (راز)
۲۱۲	نوائے کفر (منور)
۳۰	نوبہاراں (اثر)
۱۹۳	نورتن (حسینی)
۲۸۱	نیا قدم (ہندی)
۲۹۷	نیرنگ عشق (غنیمت)
۳۸۷	نیوایرا (ہفتہ وار، حیدرآباد)

و

	واقعات دارالحکومت دہلی
۲۵	(بشیر الدین احمد)
۱۹۲	والدین (تھورو)
۱۱۰	وجدان (شار)
۲۱۳	وجدان حافظ (منور)
۲۱۲	وشویدنا (منور)
۲۱۰	وطن (روزنامہ، دلی)

۳۱۸	مہتاب سخن (سروری)
۲۱۲	مہرمنور (منور)
۲۳۳	مہمات علامہ الدین خلیجی (عجیب)
۱۱۰	میراکلام نوبنو (شار)
۱۱۰	میرانتخب کلام (شار)
۲۱۳	میری یادداشتیں (منور)
۱۹۳	میلہ گھنٹی (حسینی)

ن

۲۸۱	ناخدا (ہفتہ وار)
۲۱۳	نالہ ربکیس (منور)
۱۹۳	ناول کی تاریخ و تنقید (حسینی)
۷۴	نبض حیات (شفا)
۳۰۶	نثر ریاض خیر آبادی (عقیل جعفری)
۳۷	نجم (نذرستجار)
۱۹۳	ندیکنارے (حسینی)
۲۸۱	نایم (روزانہ)
۲۱۲	نذر ادب (منور)
۱۹۶	نذر ذاکر (مالک رام)
۱۹۶	نذر عرشی (مالک و مختار)
۲۲۰	نسیم سحر (بدایوں)
۲۱۲	نسیم عرفان (منور)
۱۳۷	نشاط رفیعہ (عندلیب)
۱۸۲	نشان راہ (جامی)
۳۹	نصرت (بمبئی)
۱۱۹	نطق ناطق (ناطق)

مذکرہ معاصرین

۳۳۳	ہندستان، اقبال تارتخ (حبیب)	۱۳۳	دلی الہی تحریک (ناظر)
	ہندستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم	۴۹	ویر چیترا (آفتاب)
۱۰۸	(ذاکر حسین)	۵	
۴۹	ہندستانی سورا (آفتاب)	۹۵	ہزار داستان (ماہنامہ، لاہور)
۲۳	ہندو کل میں اردو (رفیق)	۲۹۲	ہٹری آف فلاسفی
	می	۲۲۱	ہفت احمد (ضیا)
۱۸۲	یاد کی خوشبو (جامی)	۳۰	ہلاک فریب (انثر)
۱۰۳	یادگار غالب (حالی)	۴۰	ہلال (روزنامہ، بمبئی)
۱۹۰	یارانِ میکده (عبدالشکور)	۱۶۳	ہمارا گائوں (حسینی)
۲۱۳	یوگ سار (منور)	۱۶۳	ہماری اردو شاعری (حسینی)
		۳۱۲، ۳۱۱	ہمالیوں (ماہنامہ، لاہور)